بول

علیم الحق حقی

پیش لفظ

"بول" پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ اسے بھی آپ کی پسندیدگی حاصل ہوگی۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے Paul Gallico کے ناول The Foolish Immortals سے ماخوذ کیا ہے۔ مگر کردار نگاری اور ماحول نگاری میں جو عرق ریزی برتی گئی ہے، اسے آپ سراہے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اصل کہانی میں تبدیلیاں بھی بہت زیادہ کی گئیں ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اپنے طور پر کہانی کو اصل سے آگے لے جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں کہانی کو ماخوذ کرنے والے کے لئے یہ کوشش ضروری ہے۔ ورنہ ماخوذ کرنے کا فائدہ؟

آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے تراجم بھی بہت کئے ہیں اور بہت محبت سے کئے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کا کام ترجمے کے بغیر چلتا بھی نہیں اور جو ترجمے کو باعث شرمندگی بھی سمجھتے ہیں۔ میں نے ترجمے کو ہمیشہ بڑا کام سمجھ کر کیا ہے۔ کوئی انگریزی کہانی جسے پڑھ کر مجھے روحانی خوشی حاصل ہو، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے بہت اچھے روپ میں اپنے اُن لاکھوں قارئین تک بھی پہنچاؤں، جو ترجمہ نہ ہونے کے باعث اس خوبصورت کہانی سے محروم رہیں گے۔ خاص طور پر وہ مغربی کہانیاں، جن میں مقصدیت اور روح مشرق کی ہو، مجھے ترجمے پر بہت زیادہ اکساتی ہیں۔ پچھلے چار برس سے میں نے ترجمہ بالکل نہیں کیا ہے۔ مگر ارادہ ہے کہ طبع زاد کہانیوں سے فرصت نکال کر کچھ شاہکار مغربی کہانیاں آپ تک پہنچائی جائیں۔

کتاب کے متعلق آپ کی آراء اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔ ایک استدعا اور ہے۔ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ مجھے یاد رکھیں۔ احسان مند رہوں گا۔

والسلام
آپ کا اپنا
علیم الحق حقی

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کے اکلوتے نوٹ کو یوں پیار سے تھپتھپایا' جیسے اسے جیب میں رہنے کی تلقین کر رہا ہو۔ اس کا تجربہ تھا کہ پیسے کی بہت سی ٹانگیں ہوتی ہیں اور وہ بہت تیزی سے بھاگتا ہے.......... بلکہ شاید اس کے پر ہوتے ہیں اور وہ اُڑ جاتا ہے۔ کم از کم اس کی جیب میں آنے کے بعد تو یہی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے' ایسے میں اکلوتے نوٹ کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

ملباری کے ہوٹل میں داخل ہو کر وہ آخری میز کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں شور نسبتاً کم ہوتا تھا اور سکون سے بیٹھ کر سوچنے کے امکانات خاصے روشن ہوتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ شور میں سوچنا اس کے لیے ناممکن ہو' شوروغل کا تو وہ عادی تھا۔ ہوٹل میں عموماً ہر وقت مچھلی مارکیٹ کی سی کیفیت رہتی تھی۔ باہر ٹریفک کا زبردست شور' اندر کے زبردست تر شور میں خود کو منوانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا اور وہ اس کا عادی تھا' اس کے باوجود سوچ سکتا تھا لیکن معاملہ زیادہ سنگین ہوتا تو اسے نسبتاً سکون سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ایسے موقعے پر وہ ہوٹل کی آخری میز کا رخ کرتا۔

اس کے بیٹھتے ہی ہوٹل کا بیرا "شم مس" لپک کر اس کی طرف آیا۔ نام تو اس کا شمس تھا لیکن ہوٹل کے مالک کی دیکھا دیکھی سب اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

"جوزف بابو' ناستا کرے گا؟" شمس نے پوچھا۔

"نہیں بابا! ہم آدھا ناشتا نہیں کر سکتا۔ تُو چھ میں سے تین نقطے غائب کر کے مزہ ہی خراب کر دیتا ہے۔"

جواب میں شم مس نے مارے حیرت کے بھاڑ سے منہ کھول دیا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اُس نے اب تک آدھے ناشتے کا تصور قبول نہیں کیا تھا اور شم مس کی سمجھ میں تین نقطوں کا فرق نہیں آتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ شم مس کا کھلا ہوا منہ از خود بند نہیں ہوگا اور گاڑی بڑھانے کے

لیے اس کا منہ بند ہونا ضروری تھا چنانچہ اس بار اس نے بڑی شائستگی اور وقار سے کہا "ابھی ڈٹ کر نہاری روٹی کھائی ہے میں نے۔ چائے لے آ"۔ یہ کہہ کر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا جس کے نتیجے میں خالی پیٹ کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

"ایک پشاوری" شم مس نے معمول کے مطابق چیخ کر پشاوری چائے کا آرڈر دیا اور ایک طرف چلا گیا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ کو پھر تھپتھپایا۔ وہ نوٹ اس کی پچھلی کمائی کی آخری یادگار تھا جو اس نے ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اسے کیتھرین یاد آگئی.......... خوب صورت امریکن لڑکی جس کا وہ زبردستی گائیڈ بن بیٹھا تھا۔

اس کی ناک عموماً بند رہتی تھی۔ بہانہ نزلے کا تھا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بدبودار ماحول میں رہنے والے نزلے کا شکار ہو ہی جاتے ہیں.......... بلکہ تمام عمر رہتے ہیں۔ یہ بھی سمجھوتے کی ایک شکل ہے۔ خدا نے انسان کو پانچوں حسوں کی شکل میں بہت بڑی نعمت دی ہے۔ اب اگر قوتِ شامہ کے لیے خوشبو میسر نہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں کہ انسان طبعاً خوش امید بھی ہوتا ہے لیکن جب قوتِ شامہ کے لیے دھوئیں اور طرح طرح کی بدبوؤں کے سوا کچھ بھی میسر نہ ہو تو ایسے میں قوتِ شامہ سے دست برداری ہی بہتر ہے۔ سو اس کی ناک بھی ہمیشہ بند ہی رہتی تھی۔ مگر کہیں سے پیسہ ملنے کے امکان کی خوشبو آئے تو وہ اسے بہت دور سے سونگھ لیتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ وہ امریکن لڑکی صدر کے ایک فٹ پاتھ پر سہمی کھڑی تھی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ سڑک پار کرنا چاہتی ہے لیکن ٹریفک کا ریلا رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے چاری حیرت سے لوگوں کو سڑک پار کرتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی کی تقلید میں ایک قدم آگے بڑھتی مگر فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ آتی۔ لوگ سڑک پار کرتے رہے اور وہ حیرت اور بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی۔

لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے نتھنے پھڑکے اور نئے نئے کرارے ڈالروں کی مہک اس کے وجود میں اتر کر اس کے مشامِ جاں کو معطر کر گئی حالانکہ اس نے کبھی ڈالر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکی کے ہینڈ بیگ میں ڈالرز نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ امریکیوں کے وجود سے ڈالر کی، انگریزوں کے پاس سے پاؤنڈ کی اور جاپانیوں کے پاس سے ین کی ہی خوشبو آئے گی۔ البتہ "ملکیوں" کی بات اور ہے۔ کسی ہم وطن کے وجود سے اس نے روپے کی خوشبو پھوٹتی کبھی محسوس نہیں ک

تھی۔ ان کے جسموں سے پسینے اور خون کی بو یا امپورٹڈ سینٹ کی مہک آتی تھی۔

ڈالروں کی خوشبو محسوس کرتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے لڑکی کی طرف بڑھا۔ "ایکس کیوز می" اس نے بے حد شائستگی سے کہا "آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہیں۔ میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

لڑکی نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ خوش قامت اور وجیہہ تھا۔ لباس صاف ستھرا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ "مجھے سڑک پار کرنی ہے۔" لڑکی نے کہا۔ اس کے لہجے نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی کہ وہ امریکن ہے "یہاں کا سسٹم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ٹریفک سگنل تو ہے مگر روشنی نہیں ہے" لڑکی نے مزید کہا۔

"خراب ہو گیا ہو گا" اس نے بے پروائی سے کہا "ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"پھر بھی ڈرائیو کرنے والوں کو ہی دوسروں کا خیال کرنا چاہئے۔ اس طرح کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہاں دوسروں کا خیال رکھنے کا رواج نہیں۔ یہ دشوار بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ یہاں ہر شخص اپنا خیال خود رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کام چل رہا ہے۔ رکتا نہیں۔ حادثے صرف اس صورت میں ہوتے ہیں کہ کوئی اپنا خیال رکھنے کے بجائے دوسروں کا خیال رکھنے کی حماقت کرے۔"

"اور ٹریفک پولیس بھی کہیں نہیں ہے" لڑکی نے اعتراض کیا۔

"ایسی بات نہیں" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی "ٹریفک پولیس کے چند نمائندے اس طرف شکار کی تلاش میں کھڑے ہوں گے۔ وہ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی گاڑیاں روک کر ان کا غیر سرکاری چالان کر رہے.......... میرا مطلب ہے، ذاتی جرمانہ وصول کر رہے ہوں گے۔ ابھی آپ دیکھئے گا، ان کے گاڑیاں روکنے کی وجہ سے ٹریفک جام ہو جائے گا اور آپ بڑی آسانی سے سڑک پار کر لیں گی۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے.........."

"کیسے آ سکتا ہے؟ ہم لوگ لکیر کے فقیر نہیں۔ تخلیقی اپچ رکھتے ہیں۔ ہماری پولیس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نت نئے طریقے وضع کئے ہیں۔"

لڑکی نے اسے بہت غور سے دیکھا "آپ عجیب ہیں.......... دلچسپ اور عجیب!"

"ہم سب عجیب ہیں.......... دلچسپ اور عجیب!" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

“آپ مسلم ہیں؟” لڑکی نے پوچھا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ “پھر آئی مصیبت' اس نے سوچا۔ اب کیا جواب دوں؟” لڑکی نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی “مجھے مسلم بہت اچھے لگتے ہیں۔”

“میں مسلم ہوں” اس نے جلدی سے کہا۔

“اوہ! میں کیتھرین میٹرز ہوں۔ امریکا سے آئی ہوں۔”

“اور میں یوسف بن داؤد ہوں۔ انگریزی میں آپ جوزف ڈیوڈسن کہہ لیں۔”

“مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں۔”

اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ نوٹ پکے ہونے والے تھے “مجھے بھی خوشی ہوئی آپ سے مل کر” اس نے لہجے میں تپاک سموتے ہوئے کہا “آپ سڑک کے اس طرف کہاں جا رہی ہیں۔”

“کچھ شاپنگ کرنی ہے” لڑکی نے بوہری بازار کی طرف اشارہ کیا۔

“ارے.......... اکیلی تو آپ لٹ جائیں گی۔ ہمارے دکان دار سیاحوں کی کھال کھینچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چلیئے' میں آپ کو شاپنگ کرا دوں” اس نے بے حد خلوص سے کہا۔

“تھینک یو مسٹر ڈیوڈسن” کیتھرین نے کہا۔ پھر چونک کر بولی “ارے' ٹریفک ن واقعی جام ہو گیا! آپ نے ٹھیک کیا تھا۔”

اس نے فاتحانہ نظروں سے کیتھرین کو دیکھا “میں نے کہا تھا نا۔ اب چلیئے” اس نے نہایت بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھاما اور کاروں کے درمیان دوڑ لگا دی۔ کیتھرین کا ہاتھ تھامتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ڈالروں کی خوشبو اور تیز ہو گئی تھی۔

“اب بتائیے.......... میڈم” سڑک پار کرنے کے بعد اس نے کیتھرین سے پوچھا۔

“اوہ نو' میں مس ہوں” کیتھرین نے جلدی سے کہا۔

“اوکے' مس کیتھرین' یہ بتائیں کہ آپ کو خریدنا کیا ہے؟”

جواب میں کیتھرین نے جو تفصیلی تقریر کی' اس کا حاصل یہ تھا کہ وہ ایسے کڑھائ والے سوٹ خریدنا چاہتی ہے جن میں شیشے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ وہ اسے ایک دکان لے گیا۔ دکان دار ان کے سامنے بچھ گیا۔ اس نے بے شمار سندھی کڑھائی والے سوٹ کیتھرین کے سامنے ڈال دیے۔ کیتھرین کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ اس بچے کی طرح مسرت اور ہیجان میں شرابور تھی جسے بہت سارے من پسند کھلونے نظر آ گئے ہوں اور اسے ال میں سے کوئی ایک منتخب کرنے کی اجازت ہو۔ وہ بڑی دشواری میں پھنس گئی تھی۔

“ایک آپ پسند کریں” کیتھرین نے فرمائش کی۔

اس نے جھٹ ایک سوٹ چن لیا۔ ایک سوٹ کیتھرین نے بھی پسند کر لیا “ہاؤ مچ؟” کیتھرین نے دونوں سوٹ ایک طرف رکھ کے دکان دار سے پوچھا۔

یوسف نے پہلے ہی مرحلے میں مداخلت سے گریز کیا۔ اپنی اہمیت اور افادیت بھی تو ثابت کرنا تھی۔ دکان دار نے غور سے اسے دیکھا لیکن وہ اور کپڑوں کی طرف متوجہ تھا

“نو سو روپے” دکان دار نے دھڑلے سے کہا۔

کیتھرین نے احتجاج کیا کہ قیمت زیادہ ہے۔ دکان دار سوٹوں کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا۔ آخر میں اس نے پچاس روپے کم کرنے کا مژدہ سنایا۔ کیتھرین ہینڈ بیگ کھول کر رقم نکال رہی تھی کہ یوسف نے اس کا ہاتھ تھام لیا “چلیں.......... کوئی اور دکان دیکھتے ہیں۔”

دکان دار بوکھلا گیا “بات تو سنیئے سر!”

“یہ میری دوست ہے” یوسف نے دکان دار سے اردو میں کہا۔ “تم شاید مجھے گائیڈ سمجھ رہے ہو۔”

“ٹھیک ہے سر! چھ سو لگا دوں گا' آپ کی خاطر۔”

“میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں دوست” اس نے دکان دار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

“اچھا صاحب! پانچ سو دے دیجئے۔”

اس نے کیتھرین کا ہاتھ تھام لیا “چلیئے! اس بازار میں درجنوں دکانیں ہیں۔”

“سنیئے تو۔” دکان دار نے بڑی مظلومیت سے پکار “آپ ہی بتا دیں' کیا دیں گے؟”

“ڈھائی سو۔” اس نے سرد لہجے میں کہا۔

“اتنا تو پڑتا بھی نہیں ہے صاحب۔”

“میں جانتا ہوں کہ اس میں بھی تمہیں 70 روپے بچ رہے ہیں۔”

دکان دار گڑگڑانے لگا۔ بہرحال خاصی حجت کے بعد 280 روپے میں سودا پٹ گیا۔ اس نے کیتھرین سے تین سو روپے لے کر دکان دار کو دیے۔ کیتھرین حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر جب اس نے دکاندار سے بیس روپے لے کر اسے دیے، تو وہ اور حیران ہوئی۔ وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بازار سے نکل آئے۔ "اب کیا ارادہ ہے؟" اس نے کیتھرین سے پوچھا۔

"ہوٹل واپس جاؤں گی۔"

وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ بچاری! کتنے وثوق سے کہہ رہی ہے۔ نہیں جانتی کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ ہوٹل مہران کی طرف جانے والی سڑک پر چل دیے۔ راستے میں اس نے کیتھرین سے پوچھا "آپ نے یہاں سیر بھی کی؟"

"ہاں۔" وہ پھر ایکسائیٹڈ ہوگئی۔

"کلفٹن دیکھا آپ نے؟"

"جی ہاں۔"

"نہیں۔ آپ نے کلفٹن نہیں، سمندر دیکھا ہوگا۔ بابا عبداللہ شاہ غازیؒ کے پر گئی تھیں؟"

وہ نفی میں سرہلانے لگی۔

"چلئے............ میں سیر کراؤں گا آپ کو۔ مجھ سے بہتر گائیڈ آپ کو اس شہر میں ل سکتا" اس نے زور دے کر کہا۔ یہ جتانا بہت ضروری تھا ورنہ وہ یہ بھی سمجھ سکتی کہ وہ یہ زحمت بربنائے خلوص کر رہا ہے۔

کیتھرین نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"گھبرا گئیں؟" ارے جو آپ کا جی چاہے، دے دیجئے گا میں تو زبردستی کا ہوں" اس نے بے حد سچائی میں کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں" کیتھرین نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ گائیڈ لگتے نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے، آپ نے تو میرے ساڑھے پانچ سو روپے بچوائے ہیں۔"

"خیر، چھوڑیے ان باتوں کو۔ ٹیکسی روکتے ہیں۔"

ٹیکسی والے نے پہلے کیتھرین کو اور پھر اسے بغور دیکھا "اولڈ کلفٹن جا۔ صاب؟"

وہ مسکرا دیا۔ اتنی خوب صورت میم کے ساتھ جانا تو وہیں چاہئے تھا لیکن ڈالر کی مہک کیتھرین کے وجود کی مہک سے زیادہ مسحور کن تھی اور وہ بھوک کی تشفی پر کا ترجیح دینے کا قائل تھا۔ پہلے ڈالر............ بعد میں کچھ اور "نہیں بھئی، کلفٹن چلنا ہے" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"پچاس روپے ہوں گے صاحب۔"

اس بار اس نے حجت نہیں کی۔ ضرورت بھی نہیں تھی حجت کی۔ وہ پچھلی کارکردگی میں اپنا سکہ جما چکا تھا۔ اب کسی ہم وطن کو بھی کچھ ڈالر مل جائیں گے تو کیا حرج ہے۔

وہ تین گھنٹے گھومتے رہے۔ اس نے سیر کرانے کا حق ادا کر دیا۔ ایک ~~گھنٹے کے اندر~~ اندر کیتھرین، کیتھی بن چکی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا۔ بے تکلف ہونے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود کو دنیا کا بہترین سیلز مین سمجھتا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ اس چیز تک کے دام وصول کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ زندگی بھی اس کے نزدیک ایک طرح کا کاروبار تھی............ دکھ بیچنا اور آسائشیں خریدنا!

ان تین گھنٹوں میں اس نے کیتھی کو کلفٹن کا ہر رخ دکھا دیا، مزار پر دم لگاتے ہوئے ملنگوں سے میٹھے پانی کے چشمے تک کیتھی بہت متاثر ہوئی۔ خاص طور پر سمندر کے سینے سے ابلنے والے میٹھے پانی کے چشمے سے۔

"اگر کچھ دھوئیں وغیرہ کا شوق ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے" اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

کیتھی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے نفی میں سرہلایا۔

واپس آتے ہوئے اس نے کچھ سرمایہ کاری بھی کر ڈالی۔ موتیے کے گجرے خرید کر اس نے اپنے ہاتھوں سے انہیں کیتھی کی بانہوں پر لپیٹ دیا۔ کلائیوں میں موتیے کے کنگن پہنا دیے۔ پھر اس نے کلفٹن بازار سے کوڑیوں اور سیپوں کے ہار اور بندے خرید کر کیتھی کو تحفتاً پیش کئے۔ کیتھی کی آنکھوں میں چاندنی چٹکتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ کچھ دنوں کے لیے زندگی سنور گئی ہے۔

اس رات اگرچہ وہ کم سویا لیکن سکون سے فور اسٹار ہوٹل کے نرم گرم بستر پر سویا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی مہمان اس کی میزبانی اور قربت پر مصر تھی۔ مدتوں بعد اسے اچھی شراب بھی ملی۔ جس وقت اس کی آنکھیں بند ہوئیں، وہ ہر طرح کے نشے میں ڈوب کر ابھر چکا تھا۔

صبح کیتھی نے اسے بتایا کہ وہ اس کی وطن واپسی کا دن ہے۔ وہ افسردہ تھی کہ قسمت نے انہیں اتنی دیر سے کیوں ملایا۔ افسوس تو یوسف کو بھی تھا لیکن اس نے حقیقت کو فوراً اور آسانی سے قبول کرنے کا نکتہ بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ کیتھی نے اسے پانچ سو

روپے دیے اور اس نے بغیر ہچکچائے انہیں قبول کر لیا۔ وہ پوری طرح اس رقم کا مستحق بھی تو تھا۔ اس نے کیتھی کے ساتھ ایئرپورٹ جانے سے معذرت کر لی............ یہ کہہ کر کہ اسے کام پر جانا ہے۔ حالانکہ وہ بے کار تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ بے روزگاری کے باوجود وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا............ کم از کم دوسروں کے لیے تو ہرگز نہیں۔

اور اب ایک ہفتے بعد اس کی شاہ خرچی کی وجہ سے اس کی جیب میں ان پانچ سو روپوں کی آخری یادگار بچی تھی............ دس کا اکلوتا نوٹ' جسے وہ بار بار ٹٹولتا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ شم مس نہ جانے کب اس کے سامنے چائے رکھ گیا تھا۔ اس نے پیالی کو چھوا۔ پیالی بالکل سرد تھی۔ اس نے بڑی بدمزگی سے چائے کو دیکھا' جس پر جھلی سی تن گئی تھی۔ اس نے حلق پھاڑ کر شم مس کو پکارا۔ "ابے............ یہ ٹھنڈی چائے رکھ گیا یہاں۔"

"نہیں جوزف بابو............"

"بکواس مت کر' ورنہ ابھی اس میں مکھی مار کر ڈال دوں گا۔ اٹھا اسے اور دوسری چائے لا۔"

شم مس نے فوراً ہی پیالی اٹھالی۔ جانتا تھا کہ عافیت اسی میں ہے۔

"اور سن!" یوسف نے سرگوشی میں کہا "جب ادھر کرسچن لوگ نہ ہوں تو جوزف نہ کہا کر مجھے۔ میرا نام یوسف ہے۔ سمجھا؟"

"سمجھ گیا یوسف بابو!" شم مس نے دانت نکال دیے۔

○-----○-----○

اس کی پوری زندگی کا احاطہ صرف ایک لفظ کر سکتا تھا۔ جنگ! اس نے عمر کے ہر پل اپنی بقا کے لیے' اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے جنگ لڑی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زندگی سے سب کچھ سیکھ لیا تھا' سوائے اخلاقی قدروں کے۔ اس کی دانست میں اخلاقی قدریں جینے میں آدمی کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ البتہ ان کی مدد سے موت بہ آسانی حاصل کی جا سکتی تھی۔

وہ نشیب میں اگنے والی خود رو جھاڑیوں کی طرح تھا' جنہیں اِدھر اُدھر سے بہہ کر آنے والا پانی زندگی کی توانائی فراہم کرتا ہے............ خواہ وہ پانی صاف ہو یا گندا۔ عام اور نازک پودوں کو جو پانی مرجھا سکتا ہے' وہ ایسی جھاڑیوں کے لیے زندگی کا پیغامبر ثابت ہوتا ہے اور جب کسی وجہ سے اِدھر اُدھر سے پانی میسر آنا موقوف ہو جائے تو یہ جھاڑیاں زمین کے سینے کی انتہائی گہرائی سے اپنے لیے نمی............ یعنی زندگی کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتی یں۔ انہیں زندگی کی طلب اور موت کا خوف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اوپر اٹھنے کی بجائے نیچے پھیلنا زیادہ پسند کرتی ہیں تاکہ زمین سے قریب رہیں' جو ان کے لیے تحفظ کی علامت ہے۔ وہ اپنی جڑیں چھپا کر رکھتی ہیں کہ کوئی انہیں کاٹ نہ سکے۔ ان میں کانٹے ہوتے ہیں اکہ قریب آنے والے گھبرا کر ہٹ جائیں اور دور رہیں۔ ان کے پھل پھول زہریلے وتے ہیں۔ ان سے لکڑی بھی حاصل نہیں کی جا سکتی' وہ بے فیض ہوتی ہیں اور بے فیض رہتی ہیں کیونکہ دنیا میں نقصان انہی کو پہنچتا ہے' جو دوسروں کو فیض پہنچائیں۔ وہ سخت بان ہوتی ہیں' انہیں کاٹنے کی کتنی ہی کوشش کر لی جائے' وہ عام طور پر فنا نہیں ہوتیں' ھر اگ آتی ہیں کیونکہ ان کی جڑیں مخفی ہوتی ہیں اور ان میں بقاء کی خواہش اور قوت دافعت کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

یوسف پیدائشی طور پر زندگی کا طالب علم تھا۔ اس نے ابتدا ہی میں دیکھ اور سمجھ یا تھا کہ ایک انسان کے نکتہ نظر سے کائنات کا سرچشمہ اس کی اپنی زندگی ہے۔ سورج' ہاند' ستارے' پھول اور خوشبو' سب کچھ اس وقت تک اچھا ہے' جب تک وہ خود موجود ہے۔ وہ موجود نہ ہو' تب بھی یہ سب کچھ یونہی رہے گا لیکن اس کے کس کام کا! لہٰذا نام' ذہب' انفرادیت اور انا............ زندگی سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں۔ زندگی نہیں تو کچھ یں۔ سب کچھ زندگی سے ہے۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس نے پانی کی سی فطرت اپنا ا۔ جیسا دیس ویسا بھیس لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کہیں خود سری کی ایک تند لہر اٹھتی' و کہتی............ میں میں ہوں لیکن وہ اسے دبا لیتا۔

اس کی یادداشت کے البم میں پہلی تصویر ماں کی تھی۔ وہ بہت دھندلی تصویر تھی۔ قوش واضح نہیں تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی ماں ہے۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی ں کے پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ ماں کی یاد سے بھوک کی یاد بھی مشروط تھی۔ وہ ں وقت چار ساڑھے چار سال کا رہا ہوگا۔ وہ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ پھر ماں نے سنتری ے پارک میں سونے کی اجازت لے لی۔ نرم گھاس کا بستر اسے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ ں کے بعد اسے فٹ پاتھ پر سونا کبھی اچھا نہیں لگا۔ پارک میں وہ صرف ایک ہفتہ سو سکے تھے۔

ایک رات ماں کی گھٹی گھٹی چیخ سن کر اس کی آنکھ کھلی' مگر اس نے پوری طرح

انکھیں نہیں کھولیں بلکہ کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا۔ ایک شخص ماں سے لڑ رہا تھا۔ اسے مار رہا تھا، ماں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی، چیخنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس شخص نے ایک ہاتھ سے ماں کا منہ دبوچ رکھا تھا۔

اس کے وجود میں غصے کی لہر اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس شخص کا منہ نوچ لے، اسے مارے لیکن وہ جانتا تھا کہ نقصان اسی کا ہوگا۔ وہ شخص اس سے بڑا بھی تھا اور طاقتور بھی چنانچہ وہ بے خبر سا بنا اپنی جگہ لیٹا رہا۔ ماں کی دبی دبی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ اس شخص کے جانے کے بعد چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ماں دبی دبی، دردناک آواز میں رونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ماں سے لپٹ جائے، اسے پیار کرے لیکن کسی نامعلوم حس نے اسے بتا دیا کہ بے خبر بنے رہنا ہی ٹھیک ہے۔

اگلی رات ماں نے پھر فٹ پاتھ پر چادر بچھائی۔ اسے بہت برا لگا۔ ”ماں! آج باغ میں نہیں چلیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں یوسف! ہم یہیں سوئیں گے۔“ ماں نے جواب دیا پھر کچھ توقف کے بعد بولی ”مجھے تو یہاں بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ اسے ماں کے ڈر کی نوعیت کا پوری طرح علم نہیں تھا مگر وہ اس سے کسی حد تک واقف ضرور تھا۔

”کاش! کاش تو جلدی سے بڑا ہو جائے۔“ کچھ دیر بعد ماں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس نے اس لمحے فیصلہ کیا کہ وہ جلد از جلد بڑا ہونے کی کوشش کرے گا۔ بڑا بھی اور طاقت ور بھی۔

ان دنوں وہ ایک ہی چیز سے واقف تھا اور وہ مستقل تھی.......... بھوک! ماں صبح سویرے سامنے والے ہوٹل سے چائے لیتی اور کبھی اس میں کڑک ڈبل روٹی اور کبھی پاپے بھگو کر اسے کھلاتی۔ تھوڑا سا خود بھی کھا لیتی۔ کبھی ڈبل روٹی اور پاپے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو صرف چائے ہوتی اور کبھی چائے بھی گول ہو جاتی۔ جس روز ایسا ہوتا، ماں اسے بانہوں میں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے۔ اسے ماں کی وہ بے موقع محبت بہت بری لگتی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ کہتا۔

ماں ہر صبح اسے ناشتا کرانے اور ناشتا مہیا نہ ہونے کی صورت میں پیار کر کے کہیں چلی جاتی۔ ماں کی ہدایت تھی کہ وہ اس فٹ پاتھ سے آگے نہ جائے، سڑک پار نہ کرے۔

وہ جاتے جاتے بار بار اسے پلٹ کر دیکھتی۔ نکڑ پر پہنچتی تو آخری بار پلٹ کر اسے دیکھتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ اس وقت تک فٹ پاتھ پر چہل پہل ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد سامنے والی دکانیں بھی کھل جاتیں۔ ان میں ایک کھلونوں کی دکان تھی، جس کے شوکیس میں گڑیاں، موٹر کاریں، ریلیں، ہوائی جہاز اور نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ وہ سب چیزیں خود بخود چلتی تھیں، مگر اسے کھلونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو للچائی ہوئی نظروں سے فٹ پاتھ پر بیٹھے، پھل فروشوں کے ٹوکروں کو تکتا رہتا۔ پھل دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا اور پیٹ میں اینٹھن ہونے لگتی۔

جب شام کو سورج ڈھل جاتا، دھوپ پیچھے والی اونچی بلڈنگ کو پھلانگ کر پار اتر جاتی اور سڑک پر بتیاں جلنے لگتیں تو ماں واپس آتی.......... تھکی تھکی، نڈھال نڈھال۔

”کیسا ہے میرا بیٹا، میرا یوسف؟“ وہ اس کے رخسار چوم کر پوچھتی۔

”مجھے بھوک لگی ہے ماں۔“ وہ بسور کر کہتا۔

وہ کہتی ”تُو نے سلام تو کیا ہی نہیں۔“

اس وقت تک پیٹ کی سرکشی انتہا کو پہنچ چکی ہوتی۔ ”ماں! مجھے کھانا دو۔“ وہ سرکشی سے کہتا۔

”اچھے بچے پہلے سلام کرتے ہیں.......... آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی۔“

”میں اچھا بچہ نہیں، بھوکا بچہ ہوں۔“ وہ تند لہجے میں کہتا۔

ماں ہنس دیتی.......... بجھی بجھی، پھیکی پھیکی ہنسی۔ وہ سڑک پار کر کے سامنے والے ہوٹل سے کھانا لاتی۔ فٹ پاتھ پر چادر بچھا کے وہ دونوں بیٹھ کر کھانا کھاتے لیکن وہ پھر بھی بھوکا رہ جاتا۔ کھانا اس کی بھوک کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوتا۔ کھانا کھانے کے بعد ماں اسے سلام کے متعلق یاد دلاتی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے سلام کرتا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا وہ ماں کو نہیں، پیٹ بھرنے والے ہاتھ کو سلام کر رہا ہے۔

بھوک مستقل طور پر اس کے ساتھ رہتی۔ صرف اتنی دیر سکون رہتا، جب وہ کھانا کھا رہا ہوتا۔ اس کے فوراً بعد پھر وہی بھوک، جو اس وقت تک اسے کھاتی رہتی، جب تک اسے کھانے کی کوئی چیز نہ ملتی۔ اس نے اپنے طور پر پیٹ کے اندر موجود بھوک کے عفریت کی تصویر بنا لی تھی.......... نامکمل تصویر! یہ بات طے تھی کہ بھوک کے تیز اور نکیلے پنجے بھی ہوتے ہیں اور پیٹ چیر دینے والے دانت بھی۔ وہ یہ کبھی نہ طے کر سکا کہ ان پنجوں اور دانتوں کی تعداد کیا ہے۔

کبھی کبھی رات کا کھانا بھی غائب ہو جاتا اور اس کے نتیجے میں صبح کی چائے بھی۔ ایسے میں اسے سلام یاد نہ آتا بلکہ ماں پر ایک ناقابل فہم سا غصہ آتا رہتا لیکن جب بھی ایسا ہوتا' ماں دوپہر کو آتی اور اسے کھانا کھلاتی۔ اس روز وہ اسے پیار بھی بہت زیادہ کرتی۔

ہر آنے والے دن اس کی بھوک میں اضافہ ہو جاتا۔

اس نے باپ نام کی کوئی شے کبھی نہیں دیکھی تھی اور یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ باپ اچھا نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی بھوکے ہوتے اور ماں پریشان ہوتی' وہ اس کے باپ کو برا بھلا کہتی' ایسے جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہو۔ ''یوسف کے ابا! تم تو سکون سے مر گئے اور اپنی ذمے داری مجھ پر لاد گئے۔ اب بتاؤ' میں کیا کروں؟ میں تو مر بھی نہیں سکتی اس یوسف کی وجہ سے۔''

یوسف کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا لیکن اسے اپنے اَن دیکھے باپ پر بے تحاشا غصہ آتا۔

ایسے ہی ایک دن' جب رات کا کھانا بھی نہیں ملا تھا' اس نے ماں سے کہا ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا دو مجھے۔''

''تُو مجھے کھالے۔'' ماں نے چڑ کر کہا۔

اس نے ماں کو غور سے دیکھا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اتنی بڑی ماں.......... اسے کیسے کھایا جا سکتا ہے؟ لیکن ماں کی پیش کش کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کی بات بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی البتہ اس نے مایوسی سے پوچھا۔ ''ماں! ہمیں کھانا کیوں نہیں ملتا؟''

ماں کے چہرے پر نرمی بکھر گئی۔ اس نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے اسے سمجھایا۔ ''دیکھ یوسف! ہم غریب اور بے سہارا ہیں۔ ہمارے سر پر خدا کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں۔''

یوسف نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ خدا' نہ خدا کا ہاتھ۔ ''خدا کا ہاتھ کہاں ہے ماں؟'' اس نے پوچھا۔

''پگلے وہ نظر تھوڑی آتا ہے۔''

''لیکن مجھے بھوک لگی ہے ماں' پھر خدا ہمیں کھانے کو کیوں نہیں دیتا؟''

''دیتا ہے بدبخت'' ماں کو ایک دم غصہ آگیا۔ ''نہ دیتا تو تُو اتنا بڑا کیسے ہو جاتا؟'' پھر وہ نرم لہجے میں بولی۔ ''ہر حال میں اس کا شکر کیا کر۔ دن میں ایک بار سہی' مل تو جاتا ہے کھانے کو''

وہ خاموش ہو گیا لیکن سوچتا رہا کہ یہ شکر کیا ہے.......... کیسے کیا جاتا ہے؟ ماں کھانا دیتی ہے تو میں اسے سلام کرتا ہوں۔ خدا کہاں ہے اور اس کا ہاتھ کہاں ہے اور میں بھوکا کیوں ہوں؟ وہ سوچتا اور چڑتا رہتا۔ اسے خدا پر غصہ آنے لگا۔ وہ اسے شکر کا موقع کیوں نہیں دیتا؟ پھر اسے ماں پر غصہ آیا کہ وہ اسے سلام کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

اس صبح بھی اسے ماں کو سلام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ماں اسے پیار کر کے چلی گئی۔ وہ دیر تک بیٹھا سڑک کی چہل پہل میں دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پیٹ کی اینٹھن شدید تر ہوتی گئی۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے سوچا کہ خدا کو تلاش کرے' اس سے کھانا مانگے لیکن پھر خیال آیا' ماں نے بتایا تھا کہ خدا اور اس کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ وہ ٹھٹکا پھر اس نے سوچا' یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے اپنے سر کے اوپر ہاتھ سے ٹٹولا۔ خدا کا ہاتھ نظر نہیں آتا مگر اس کے اور ماں کے سر پر ہے تو محسوس تو ہوگا لیکن کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ تنگ آکر وہ سڑک کی نکڑ کی طرف چل دیا۔

اس نے پہلی بار ماں کی ہدایت کو نظر انداز کیا تھا۔ اسے لمحے وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ بھوک کے پنجوں اور دانتوں سے ادھڑتا ہوا پیٹ سب سے بڑا ہے۔ موڑ مڑ کر وہ فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ فٹ پاتھ ختم ہوا تو سڑک آئی۔ اس نے سڑک پار کی اور سامنے والے فٹ پاتھ پر چل دیا۔ سامنے ایک خوبصورت عمارت تھی۔ دروازے پر سفید پتھر کا کراس تھا اور کراس پر ایک بندھے ہوئے آدمی کی شبیہہ ابھری ہوئی تھی۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک آدمی بیٹھ کیلے کھا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھیں۔

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے کیلوں کو دیکھنے لگا۔

اس شخص نے کیلا چھیلتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ''بھوکا ہے تُم؟'' اس نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جواب دینے کے لئے منہ کھولتا تو پانی نکل پڑتا۔ اس نے وہ پانی حلق سے اتار لیا۔ بھوک اور بڑھ گئی۔

''میں یہ کیلا نئیں ڈے گا۔ میں خڈ بوہٹ بھوکا..........'' اس شخص نے کیلا منہ میں رکھ لیا۔

وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

''اس ڈور پر ناک کرو..........'' اس شخص نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا

اور پھر اشارے سے ناک کا مفہوم سمجھایا۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھا۔

"رکو۔" اس شخص نے ٹوکا۔ "پہلے اپنا نام بتاؤ؟"

"یوسف۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"نئیں چلے گا۔ اچھا تم بھوکا کیوں ہے؟"

"خدا ہم کو کھانا دیتا ہے لیکن کل بھی بھول گیا اور آج بھی.........."

"امارا گاڈ.......... ہولی فادر کبھی نہیں بھولتا۔ ہولی کرائسٹ کی میربانی ہے۔ ام کبھی بھوکا نئیں رہتا.........."

"مجھے ان سے ملاؤ۔ میں بھوکا ہوں۔"

"او کے بوائے۔ تم کو کراس بنانا آتا؟"

اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

لنگڑے آدمی نے کراس بنا کر دکھایا۔ "ایسا.........." اس نے ہنستے ہوئے کہا "ابی تم بناؤ۔"

اس نے سینے پر کراس بنایا۔

"گڈ! ابی گور سے سنو۔ یہ ڈروازہ ناک کرو۔ ایک لیڈی ڈروازہ کھولے گا۔ تم روئے گا اور اس سے بولے گا۔ میڈم' ام بھوکا ہائے۔ ہولی فادر' ہولی کرائسٹ کا نام پر کھانا مانگتا' یاڈ رہے گا؟ بول کر ڈکھاؤ۔"

ننھے یوسف نے زندگی کا پہلا آموختہ دہرا دیا۔

لنگڑے فقیر کی بتیسی نکل پڑی۔ "گڈ! ٹم انٹیلی جنٹ ہے۔ کبھی بھوکا نئیں رہے گا۔ ون منٹ۔ ٹمارا نام کیا ہے؟"

"یوسف۔"

"نئیں۔ بڈا لیڈی پوچھے گا۔ تم کہنا۔ امارا نام جوزف ہے۔ اس کو کراس بنا کر دکھانا۔"

اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زندگی کا پہلا امتحان پاس کرنے جا رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ باہر نکلا تو بے حد آسودہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو کیلے تھے۔ اس نے بڈھی عورت سے لفظ بہ لفظ وہی گفتگو کی تھی' جو لنگڑے فقیر نے اسے سکھائی تھی۔ بڈھی عورت نے اس کا ہاتھ منہ دھلایا' اسے کھانا کھلایا اور دو کیلے دیے۔ وہ اسے اپنے

پاس رکھنا چاہتی تھی لیکن یوسف کو پیٹ بھرتے ہی ماں اور اس کی ہدایت یاد آگئی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔

لنگڑا فقیر دیوار سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ "ہیلو لٹل جوزف! اب تم بھوکا تو نہیں اے!" اس نے پوچھا۔

یوسف نے نفی میں سرہلا دیا۔

"اے ون منٹ؟"

یوسف نے پلٹ کر دیکھا۔

"ایک کیلا ام کو ڈو۔ ام ٹمارا ٹیچر اے۔"

یوسف نے کیلے سینے سے لگائے اور اندھا دھند بھاگ لیا۔ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو ماں بولائی ہوئی اِدھر اُدھر اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر آئی اور اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اسے اپنی ماں کا دل ہمیشہ سے زیادہ تیز دھڑکتا محسوس ہوا۔

ماں نے فوراً ہی اسے پیچھے ہٹایا اور گھور کر دیکھا۔ "کہاں چلا گیا تھا تو؟"

"وہ ادھر.........." اس نے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں گیا تھا؟" ماں کا لہجہ سخت تھا۔

"بھوک لگی تھی۔"

تب ماں کی نظر ان کیلوں پر پڑی۔ "یہ کیا؟ چوری کی ہے تو نے؟"

"نہیں ماں!"

تب اس نے ماں کے پوچھنے پر پوری کہانی سنا دی۔ ٹوٹی پھوٹے لفظوں میں' بوڑھی عورت سے اپنے مکالمے اس نے اس بار بھی اینگلو اردو میں ادا کئے تھے۔ ماں حیرت سے سنتی رہی اور نہ جانے کہاں سے اس کے زرد چہرے پر سرخی امڈ آئی۔

"ماں! ہولی فادر اور ہولی کرائسٹ کھانا دینا نہیں بھولتے۔" اس نے آخر میں بتایا۔

اسی وقت ماں کا ہاتھ پوری قوت سے اس کے رخسار پر پڑا۔ وہ سن کر ہو کر رہ گیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ماں نے اسے مارا تھا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بھر آئیں اور سب کچھ دھندلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ماں رو رہی ہے اور اس نے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف یوں دیکھا ہے' جیسے دینے والے ہاتھ کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں ایک تند مگر خاموش شکایت چمک رہی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اگلے ہی لمحے ماں نے اسے گود میں بھر لیا اور بے تابانہ اس کی رخسار پر ابھرے ہوئے اپنی انگلیوں کے نشان کو چومتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ یوسف کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں اور وہ حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تو کبھی بھوکا نہیں رہے گا۔“ ماں نے بڑے عزم سے کہا۔ ”میں اب تجھے بھوکا نہیں رہنے دوں گی لیکن تو بھی سن لے بدبخت! تجھے یوسف ہی رہنا ہے۔ تو جوزف نہیں ہے۔ تجھے کرسٹان نہیں بننا۔ سمجھا؟“

وہ کچھ سمجھا اور بہت کچھ نہ سمجھا لیکن کسی چیز نے اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ ”میں یوسف ہوں ماں۔“

”اور خبردار.......... اب کبھی اس فٹ پاتھ سے آگے نہ جانا۔ اب میں دن میں کئی بار واپس آکر تجھے دیکھا کروں گی۔ اگر اب تو کبھی ادھر گیا تو یاد رکھنا‘ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔“

ماں کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ سہم کر رہ گیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

اس دن کے بعد ایک انقلاب آگیا۔ اس دن کے بعد وہ ایک بار بھی رات کے کھانے اور صبح کی چائے اور پاپے سے محروم نہیں ہوا۔ یہ بھی سچ تھا کہ ماں دن میں کئی بار آتی اور اسے دیکھ کر جاتی۔ اسے دن میں بھوک لگتی اس کا جی چاہتا کہ فٹ پاتھ کا موڑ مڑے‘ سڑک پار کرے اور جوزف بن جائے لیکن پھر اسے ماں کے تیور یاد آتے اور وہ ہولی فادر اور ہولی کرائسٹ کو بھول کر بھوک سے سمجھوتا کر لیتا۔

ایک تبدیلی اور ہوئی۔ اب وہ اکثر رات کو سوتے سوتے اٹھ جاتا.......... ماں کے رونے کی وجہ سے۔ ماں بہت خاموشی سے روتی لیکن پھر اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور پورا بدن لرزنے لگتا۔ تقریباً ہر رات ایسا ہوتا۔ وہ جاگتا اور پھر سوچتے سوچتے سو جاتا کہ ماں کیوں رو رہی ہے؟ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

ایک رات اس سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھا ”ماں تو کیوں روتی ہے؟“

”اپنی قسمت کو روتی ہوں۔“

یہ بات اس کے حلق سے نہ اتری چنانچہ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”تُو کیوں روتی ہے ماں؟“

”تیری خاطر خود کو بیچ جو رہی ہوں۔ روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟“

”میری خاطر؟ اور بیچنا کیا ہوتا ہے ماں؟“

”یہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا اور تیری خاطر کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی تُو بھوکا رہے اور بھوک کی وجہ سے جوزف بن جائے‘ کرسٹان بن جائے۔ تُو مسلمان ہے۔“

”میں مسلمان ہوں ماں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں یوسف ہوں یا جوزف؛ رہوں گا تو میں مسلمان ہی۔“ نہ جانے کہاں سے یہ دلیل اس کے ذہن میں ابھری۔

”بکواس نہ کر۔“ ماں نے رونا‘ دھونا موقوف کیا اور برہم ہو گئی۔

وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں ان گنت سوال ابھرنے لگے۔ بھوک لگے تو روٹی چاہئے‘ روٹی یوسف کے نام کو ملے تو یوسف میں کوئی برائی نہیں اور جوزف کو ملے تو جوزف میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ میں یوسف ہوں یا جوزف‘ رہوں گا تو ماں کا بیٹا ہی۔ پھر ماں کو اس کی فکر کیوں ہے اور وہ خود کو کیوں بیچ رہی ہے.......... کیسے بیچ رہی ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ نظر کیوں نہیں آتا؟ کیا اس لیے کہ کہیں کوئی اسے پکڑ کر اس سے پوچھ نہ بیٹھے کہ وہ کھانا کیوں نہیں دیتا جبکہ سامنے والے ہوٹل میں بہت سارا کھانا خراب ہونے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

صبح اس کی ماں مر گئی۔ وہ اس وقت موت کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے تو بس یہ دیکھا کہ اس کی ماں ناشتا لے کر سڑک پار کر رہی تھی کہ اچانک وہ ایک گاڑی کی لپیٹ میں آئی اور اس کی زوردار چیخ فضا میں گونجی۔ چائے کا مگ اور کڑک ڈبل روٹی اچھل کر ایک طرف گری اور گاڑی کا پہیا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ گاڑی رکی ہی نہیں بلکہ اس کی رفتار بڑھی اور وہ پلک جھپکتے میں موڑ کاٹ کر اوجھل ہو گئی۔

وہ پہلے تو چند لمحے سحر زدہ سا سڑک پر بکھری ہوئی ماں کو دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ سامنے والے ہوٹل سے بہت سے لوگ نکلے۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا‘ جس کا سر پچک گیا تھا اور مغز اور خون سڑک پر بکھر گیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ ماں بالکل ساکت تھی۔ نہ جانے کیسے اسے احساس ہو گیا کہ اب ماں یہاں سے خود نہیں اٹھے گی‘ کبھی نہیں بولے گی۔ اسے وہ منظر اچھا نہیں لگا۔ اس نے ڈبل روٹی کو دیکھا‘ وہ بھی پچک گئی تھی۔ مگ میں چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

”ماں! اب میں ناشتا کیسے کروں گا؟“ اس نے ماں سے پوچھا حالانکہ اسے یقین نہیں تھا کہ ماں کوئی جواب دے گی۔ اسے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ اب ہر روز بھوک

مٹانے کا سامان کون کرے گا۔ وہ اس لمحے فردا کے دکھ سے ناواقف تھا۔ اسے تو صرف ناشتے کی فکر تھی.......... اس وقت کی فکر!

لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ایک آدمی جس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور جس نے مردہ عورت سے اس کا سوال سن لیا تھا۔ اسے کھینچ کر ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے بوڑھی کرسٹان عورت کی طرح اسے کرسی پر بٹھایا اور ہوٹل کے مالک سے بولا "اس بچے کو ناشتا کراؤ۔ جو یہ مانگے اسے دو لیکن اسے باہر نہ آنے دینا۔ بے چارہ بچہ!" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

ہوٹل کا مالک کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا۔ اس نے دروازے پر جا کر باہر کا جائزہ لیا اور پھر اس کے پاس آگیا۔ "تمہاری ماں مر گئی؟ اچھی عورت تھی بے چاری۔"

"ماں مر گئی!" اس نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ "اب مجھے ناشتا کون کرائے گا؟"

"میں کراؤں گا ناشتا" یہ کہہ کر ہوٹل کے مالک نے بیرے کو پکارا۔ "اسے ناشتا دے لڑکے۔" پھر اس نے یوسف سے پوچھا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یوسف بتائے یا جوزف؟" خدا پر انحصار کرے یا ہولی فادر اور ہولی کرائسٹ پر؟ اس کے نزدیک خدا اور ہولی فادر آپس میں حریف تھے۔

"کیا کھاؤ گے؟" ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔ اس نے نام پر زور نہیں دیا۔ اس کے خیال میں بچہ ماں کی موت کے صدمے سے دوچار تھا۔

"چائے، کڑک ڈبل روٹی اور پاپا۔" اس نے سادگی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر اضافہ کیا۔ "بہت سارا۔"

بیرا بھی وہیں آکھڑا ہوا تھا۔ "اور کچھ نہیں؟" ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں روز یہی کھاتا ہوں۔"

ہوٹل کے مالک نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بیرے سے کہا "اسے ملائی کے ساتھ کیک پیس لا کر دے.......... جتنے یہ کھے۔ پھر اس کے بعد اسے چائے پلانا۔" یہ کہہ کر وہ پھر کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا اور رومال سے بار بار اپنی آنکھیں پونچھتا رہا۔ بیرا کچن کی طرف چلا گیا تھا۔

اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ اس ہوٹل کو کب سے دیکھ رہا تھا لیکن ہوٹل

کے اندر پہلی بار آیا تھا۔ کچھ دیر بعد بیرا اس کے لیے کیک پیس اور ملائی لے آیا۔ اس نے کیک پیس کو چھو کر دیکھا۔ ڈبل روٹی اور پاپے کے برعکس وہ بے حد نرم تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دباؤ ڈالا۔ کیک پیس کا چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ گیا۔ اس نے اسے ملائی میں گھما کر منہ میں رکھا، مزہ آگیا۔ ایسی کوئی چیز اس نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ وہ مزے میں سب کچھ چٹ کر گیا۔

"اور لاؤں؟" بیرے نے اس سے پوچھا

ماں نے اس سے کبھی یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ اس نے جلدی سے اقرار میں سر ہلا دیا۔ بیرا اور کیک پیس اور ملائی لے آیا۔ اس بار وہ پلیٹ صاف کر سکا اور نہ ہی کیک پیس ختم کر سکا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پیٹ بھرنے کا احساس ہوا۔ اسے نیند آنے لگی۔

"بس؟" بیرے نے پوچھا۔

"بس۔" اس نے جواب دیا۔

نیند بہت زور کی آ رہی تھی۔ وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ دیر بعد اس کا سر میز پر ڈھلک گیا۔ بیرا چائے لے کر آیا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ بیرے نے سوالیہ نگاہوں سے ہوٹل کے مالک کو دیکھا۔

"سونے دے بے چارے کو۔" ہوٹل کے مالک نے کہا "اٹھ جائے تو چائے پلا دینا۔"

یوں اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ اس کی ماں کی تدفین کیسے ہوئی اور کہاں ہوئی۔ نہ ہی وہ کبھی اس کی قبر دیکھ سکا۔ خیر، اس وقت تو اسے قبر کا شعور بھی نہیں تھا۔ اس کے جاگتے ہی بیرے نے اسے ملائی والی چائے دی۔ چائے پیتے ہوئے اسے ہوٹل کے مالک کی بات یاد آئی، تمہاری ماں مر گئی۔ اچھی عورت تھی بے چاری، پھر اسے ناشتا یاد آیا جو اسے زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا اور اب یہ ملائی والی چائے! اس نے ان تینوں کڑیوں کو ملایا تو یہی نتیجہ نکلا کہ ماں کا مرنا اچھا ہے لیکن نہ جانے کیوں، پیٹ بھرا ہونے کے باوجود اندر کوئی چیز اسے کاٹ رہی تھی اور وہ بھوک نہیں، کوئی اور چیز تھی، جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ گلے میں کوئی چیز اٹک سی رہی تھی۔

وہ چائے پی کر باہر کی طرف چلا۔ ہوٹل کے مالک نے اسے پکارا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

ہوٹل کے مالک کے ہونٹ لرزے۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"اس نے پیٹ کے سکون کو محسوس کرتے ہوئے بلا جھجک جواب دیا۔ "یوسف۔ میرا نام ہے یوسف' میں مسلمان ہوں۔"

ہوٹل کے مالک کا چہرہ کچھ عجیب سا ہو گیا۔ "یوسف! تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ادھر فٹ پاتھ پر۔" اس نے جواب دیا۔ "ماں کے پاس۔"

"تمہاری ماں مرگئی' اب کبھی نہیں آئے گی۔ خیر تم جاؤ۔ بھوک لگے تو ادھر ہی آ جانا۔"

وہ باہر نکل آیا اور اس نے بہت دیکھ بھال کر سڑک پار کی۔ سڑک بالکل صاف تھی۔ وہ جگہ بھی' جہاں صبح ماں گری تھی' جہاں صبح ماں کا خون اور مغز بکھرا ہوا تھا۔' فٹ پاتھ پر وہ چادر اب بھی رکھی تھی' جس پر وہ ماں کے ساتھ سوتا تھا' وہ چادر پر بیٹھ گیا۔

کیلے کی چھابڑی والا 'جو پہلے کبھی اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا' اب بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی دیکھتا رہا' پھر اس نے پکارا۔ "یہاں آجا بیٹے! میرے پاس بیٹھ۔"

اس کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ چھابڑی والے کے پاس چلا گیا۔

"نام کیا ہے تیرا؟"

"یوسف۔" اس نے بلا جھجک بتایا۔

"یوسف! کیلے کھائے گا؟" چھابڑی والے نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

وہ دن ہی شاید اس کے لیے تبدیلیوں کا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کھانے کی کسی چیز سے انکار کیا۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اب تو کہاں رہے گا یوسف؟"

"یہیں رہوں گا۔ یہ میری چادر ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"یہاں نہیں رہ سکتا اب تو۔" چھابڑی والے نے کہا۔ "ماں کے بغیر اکیلا تُو یہاں کیسے رہے گا؟"

"ہوٹل والا کہہ رہا تھا' میری ماں مرگئی ہے۔ اب کبھی نہیں آئے گی۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"ہاں بیٹا' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم ابھی تیری ماں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔"

"تو تم مجھے بھی وہیں چھوڑ آؤ۔"

"وہاں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں جاتا۔" چھابڑی والے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا "تو میرے ساتھ میرے گھر چل۔ میرا بیٹا بن کر رہنا۔ میرے اپنے بچے بھی ہیں۔ بول.......... چلے گا نا؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا تھا' البتہ جبلت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ ماں مرگئی ہے' اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ پہلے اسے ڈر لگتا تھا تو وہ ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اب وہ اکیلا ہو گا' اب ڈر لگے گا تو کیا ہو گا؟ کچھ سوچ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دوپہر کا کھانا چھابڑی والے نے اسے اپنے ساتھ کھلایا۔ شام کو وہ اسے گھر لے گیا۔ چھوٹا سا' گندا سا وہ گھر اسے اچھا لگا۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے اس نے کبھی گھر نہیں دیکھا تھا۔ اس گھر میں بہت سے بچے تھے۔ وہ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے' جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ خود وہ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اتنے بہت سے بچے یک جا نہیں دیکھے تھے۔

چھابڑی والے کی بیوی بے حد تنک چڑھی عورت ثابت ہوئی۔ "یہ کیا بلا اٹھا لائے تم؟" اس نے بہت خراب لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

چھابڑی والے نے پوری تفصیل سنا دی۔

"سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔" اس کی بیوی ہاتھ نچا کر بولی۔ "میں کہتی ہوں' یہ اپنے ہی کیا کم تھے کہ تم ایک اور اٹھا لائے۔"

"نیک بخت! اسی لیے تو لے آیا ہوں کہ جہاں اتنے ہیں' وہاں ایک اور سہی۔ اللہ رزق دینے والا ہے۔" چھابڑی والے نے بڑے تحمل سے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی' اسے جہاں سے لائے ہو' وہیں چھوڑ آؤ۔"

چھابڑی والا خاموش ہو گیا لیکن یوسف کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ گھر راس نہیں آئے گا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا کیونکہ چھابڑی والے کی بیوی مسلسل اسے گھور رہی تھی۔ وہ پوری طرح پیٹ بھرے بغیر ہی اٹھ گیا۔

رات کو اسے بچوں کے ساتھ سلایا گیا' جن کی تعداد دس تھی لیکن وہ ٹھیک سے سو

نہیں سکا۔ چھابی والے کی بیوی مسلسل اپنی شوہر سے لڑتی رہی۔

چھابڑی والا پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر دور اندیش تھا۔ اس نے یہ حقیقت فوراً ہی قبول کرلی کہ ننھا یوسف اس کے گھر میں اس کے بچوں کی طرح نہیں رہ سکے گا۔ اسے بیوی پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس نے فوراً ہی فیصلہ بھی کرلیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں صبح کو اسے لے جاؤں گا۔ اب چین سے مجھے سونے دے۔ زیادہ بک بک مت کر۔" اس نے بیوی کو جھڑک دیا۔

صبح ہوئی تو اس نے بڑی نرمی سے یوسف کو جگایا اور اس کا ہاتھ منہ دھلا کرا چھابڑی سنبھالی اور اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف چل دیا۔

"ناشتا تو کرلو۔" بیوی نے اسے پکارا۔

"مجھے نہیں کرنا ناشتا واشتا' تو خود ہی ٹھونس لے۔ میں جا رہا ہوں۔" چھابڑ والے نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ یوسف اس کے ساتھ تھا۔

چھابڑی والے کی بیوی بہت دانا تھی۔ جانتی تھی کہ شوہر کا غصہ وقتی ہے۔ ا وقت چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ نئی بلا سے بھی پیچھا چھوٹ جائے گا۔

چھابڑی والے نے ناشتا اپنے ٹھیلے پر پہنچ کر یوسف کو ساتھ بٹھا کر کیا۔ چائے م بھگو کر کڑک ڈبل روٹی کھاتے ہوئے نہ جانے کیوں یوسف کی آنکھوں میں آنسو آگئے شاید اس لیے کہ ماں کے بغیر ناشتا کرنے کا اس کے لیے پہلا موقع تھا یا شاید اس لیے کہ سمجھتا تھا' اب اس طرح کا ناشتا اسے کبھی نہیں ملے گا۔ وہ ماں کی میلی چادر لپیٹے فٹ پاتھ بیٹھا رہا۔ جذباتی وابستگی کا تو وہ مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ بس اس لمحے اس نے جان لیا تھا اب وہ اس چادر سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا۔

چھابڑی والا دن بھر کسی سوچ میں گم رہا۔ اس نے یوسف سے بھی بس یونہی بات کی البتہ دوپہر کا کھانا دونوں نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد چھابڑی والا پھر اپنی سوچ میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور یوسف سے بولا "یوسف! آج میں تمہ ایک نئے گھر لے کر چلوں گا۔ وہاں تم جیسے بہت سارے بچے ہوں گے۔ تم ہمیشہ و رہنا۔ ٹھیک ہے؟"

"یوسف نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ جانتا تھا کہ چھابڑی والے کے گھر وہ رہ نہیں سکے گا۔

"خدا میری بیوی کو نیک ہدایت دے' خدا ہماری غربت دور کرے' اس کے ہو

ہوئے ہم نیکی کا کوئی کام بھی تو نہیں کرسکتے۔" چھابڑی والے نے خود کلامی کی۔

شام کو چھابڑی والا اسے اپنے گھر کے بجائے مولوی نعمت علی کے یتیم خانے لے گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو یوسف کے متعلق' جو جانتا تھا' بتایا' اپنا پتا لکھوایا اور یوسف کو وہاں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

یوسف کے لیے وہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ وہاں سینکڑوں بچے تھے' ہر عمر اور ہر سائز کے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ بڑا سا کمپاؤنڈ تھا۔ وہاں بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے شور مچا رکھا تھا۔ یوسف حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔

یتیم خانے کا ایک نگراں تھا' کالا بھجنگ' منہ پر چیچک کے داغ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ اس کا نام رشید تھا۔ رات ہوئی تو اس نے سب بچوں کو جمع کیا اور انہیں میدان میں بٹھا کر کھانا دیا۔ پتلی' بدمزہ دال اور ایک ایک چپاتی۔

یتیم خانے میں پانچ کمرے تھے۔ دو مولوی صاحب کے استعمال میں رہتے تھے۔ ایک میں رشید رہتا تھا۔ باقی دو کمرے بہت بڑے بڑے تھے۔ ان میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک میں لڑکیاں سوتی تھیں اور دوسرے میں لڑکے۔ کھانے کے بعد انہیں کمروں میں دھکیل دیا گیا۔ بڑے لڑکے کھڑکیوں کے قریب سوتے تھے تاکہ ہوا آتی رہے۔ یوسف کو جہاں جگہ ملی وہ ہاتھوں کا تکیہ بنا کر' ماں کی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

یتیم خانہ یوسف کے لیے زندگی کی پہلی تربیت گاہ ثابت ہوا۔

صبح تمام بچے جلدی اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ اس کے بعد مولوی صاحب انہیں کلام پاک پڑھاتے' پھر ناشتا ہوتا' ناشتے کے کچھ دیر بعد مولوی صاحب اردو پڑھاتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بچوں کو سونے کی ہدایت کی جاتی لیکن بیشتر بچے کھیلتے اور اودھم مچاتے رہتے۔

یوسف نے بہت جلد قانونِ بقا کے بیشتر اصول سمجھ لیے۔ یتیم خانے پر بڑے بچوں کی حکمرانی تھی لیکن نہیں۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کیونکہ وہاں طاقت کی حکمرانی تھی۔ بڑے بچے بزور بازو' چھوٹے بچوں کو کھانے سے محروم کردیتے تھے۔ یوسف نے بھی ہاتھ پیر چلانے شروع کردیے

مولوی صاحب تمام بچوں سے نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یوسف کے ساتھ ان کا برتاؤ خصوصی تھا کیونکہ وہ سوال بہت کرتا تھا۔ عجیب عجیب سوال۔ بالخصوص مذہب کے بارے میں۔ وہ اسے سمجھاتے وہ بہت حساس اور ذی فہم بچہ تھا۔ اپنی عمر سے

بڑا، غیر جذباتی انداز میں سوچنے والا اور حقیقت پسند۔

یتیم خانے کے اخراجات مخیر حضرات کی امداد کے ذریعے پورے ہوتے تھے۔ عموماً روکھی سوکھی سے کام چلتا۔ کبھی کبھار کسی دعوت سے بچے ہوئے کھانے کی کوئی دیگ آجاتی تو بچوں کے عیش ہو جاتے۔ رمضان، عید اور بقر عید کے موقعوں پر پبلسٹی کے خواہش مند لوگ میدانِ خیر میں اترتے اور بچوں کے دن پھر جاتے۔ اخبارات میں مخیر حضرات کی تصویریں شائع ہوتیں۔ کچھ بچے بھی نمایاں نظر آتے۔ چنانچہ عید بقر عید پر بچوں کو ایک آدھ جوڑا میسر آہی جاتا لیکن کبھی کبھار فاقوں کی نوبت بھی آجاتی۔ جب بھی ایسا ہوتا، کئی بڑے لڑکے باہر نکل جاتے۔ یوسف کو بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھیک مانگتے ہیں۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ مولوی صاحب کی شفقت و محبت اور ان سے انسیت کے باوجود یوسف خود کو وہاں قیدی محسوس کرتا البتہ اب اس کے ہاتھ خوب کھل گئے تھے۔ قد بھی وہ اچھا نکال رہا تھا۔ دوسرے تمام لڑکے اس سے دب کر رہنے لگے۔

یتیم خانے میں بچے آتے بھی رہتے اور جاتے بھی رہتے۔ جانے والوں کو خوش نصیب سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر بے اولاد لوگ یتیم خانے آتے اور اپنے لیے کوئی بچہ پسند کرکے لے جاتے اور اسے بیٹے یا بیٹی کی حیثیت دے کر پالتے۔ یوسف کا کبھی جی نہ چاہا کہ کوئی اس طرح اسے لے جائے۔ اسی لیے ایسے موقعوں پر وہ غائب رہا کرتا۔

پھر اچانک مولوی نعمت علی کا انتقال ہوگیا۔ اب یوسف اچھا خاصا بڑا تھا۔ اس موت کے حوالے سے اسے اپنی ماں کی موت بھی یاد آئی۔ دوسری طرف مولوی صاحب کی موت کے بعد یتیم خانے کے حالات بھی ابتر ہو گئے۔ یوسف کے لئے اب وہاں کوئی کشش نہ رہی تھی چنانچہ ایک دن اس نے ماں کی چادر لی اور یتیم خانے سے نکل آیا۔

اسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس نے صدر کا رخ کیا۔ وہ اس فٹ پاتھ پر گیا، جہاں کبھی وہ ماں کے ساتھ سوتا تھا، جس کے سامنے اس کی ماں گاڑی کے نیچے آئی تھی لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ سامنے والا ہوٹل غائب تھا۔ وہاں ایک نئی عمارت بن گئی تھی اور اب ایک جدید طرز کا ریسٹورنٹ کھل گیا تھا۔

اس رات اس نے فٹ پاتھ پر چادر بچھائی اور بھوکا ہی سو گیا۔ صبح وہ دیر سے جاگا۔ فٹ پاتھ پر چہل پہل اور ٹریفک کا شور اسے نہ اٹھاتا تو شاید وہ سوتا ہی رہتا۔ اٹھنے کے بعد وہ بلا ارادہ موڑ کی طرف چل دیا۔ موڑ مڑ کر وہ فٹ پاتھ کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر اس نے سڑک پار کرلی۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے کام ڈھونڈنا ہے۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ صرف گھریلو کام کاج ہی کر سکتا ہے۔

وہ چلتا رہا۔ پھر اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک خاتون نے دروازہ کھولا "کیا باٹ ہائے؟" خاتون نے نرم لہجے میں پوچھا۔

یوسف کو ایک بھولی بسری بات یاد آگئی.......... کرسی پر بیٹھ کر کیا گیا پہلا ناشتا اور دو کیلے۔ وہ تو زندگی کا پہلا سبق تھا۔ "ام کام کرنا مانگتا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "گھر کا سارا کام کرے گا، جو آپ بولے گا۔ ہولی کرائسٹ کے نام پر ام کو کام دو۔"

خاتون نے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ اس نے جلدی سے خاتون کی تقلید کی۔

"ٹمارا نام کیا ہائے؟" خاتون نے پوچھا۔

"جوزف.........."

"ڈیوڈ.......... جلڈی آؤ۔ کم آن ڈیئر۔ ہیئر از اے بوائے.......... جسٹ لائک ٹونی۔" خاتون نے کسی کو پکارا۔

چند لمحے بعد دروازے پر ایک مرد نمودار ہوا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہو گی۔ اس نے یوسف کو سرتاپا دیکھا اور بولا "یو آر رائٹ میگی۔ ہی از جسٹ لائک ہم۔ وہاٹ از ہز نیم؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ہی از جوزف۔ کام مانگتا ہائے۔" خاتون نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"انڈر لاؤ اسے" مرد نے کہا۔

خاتون نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر یوسف کو راستہ دیا۔

"کم ان.......... انڈر آجاؤ۔"

وہ اندر چلا گیا۔ وہ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ وہاں اس نے پہلی بار ٹی وی دیکھا۔ خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔

"کام نئیں ملتا تم امارا بیٹا بنیں گا؟" خاتون نے بھرائی ہوئی آواز مین کہا۔

یوسف کو فوراً احساس ہوا کہ کام بن گیا ہے۔ یہ اسے جوزف ڈیوڈسن بننے کے بعد پتا چلا کہ بوڑھی میگی کا اکلوتا بیٹا ٹونی چھ ماہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ یعنی موت ایک بار پھر اس کے کام آئی۔ مولوی صاحب کی موت نے اسے یتیم خانے سے نکالا اور ٹونی کی موت نے اسے ایک گھر فراہم کر دیا۔

اس گھر میں بڑا آرام تھا۔ ڈیوڈسن اور میگی اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے انہوں نے اسے انگلش اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسے تمام آسائشات میسر تھیں۔ مولو صاحب کی تعلیم پر چرچ کی تعلیم کی تہہ چڑھنے لگی۔ وہ سب کچھ قبول کرتا گیا۔ سمجھوتا تو اس نے بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔

تعلیم کے معاملے میں وہ ہونہار ثابت ہوا۔ ذہانت کی اس میں کوئی کمی نہیں تھ وہ اسکول میں چھا گیا۔ پڑھائی میں بھی اور کھیل کے میدان میں بھی۔ وہ بہت اچھا کرا تھا.......... بے رحم باؤلر۔ میچ کے دوران جو بیٹس مین اسے اپنی ٹیم کے لیے خطرہ محسو ہوتا۔ اسے یوسف کے باؤنسرز کے سامنے مدافعانہ انداز اختیار کرنا پڑتا۔ دوسری صور میں اسکور بک میں اس کے نام کے آگے ریٹائرڈ ہرٹ لکھا جاتا۔

وہ انگریزی بہت روانی سے بولتا۔ اس پر اس کی وجاہت! قد بھی اس نے خو نکالا تھا۔

اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا کہ میگی اور مسٹر ڈیوڈسن کا خدا کے ہاں بلاوا آگیا ان دونوں کی موت بھی ایک حادثے میں ہوئی۔ اس بار موت نے اسے کچھ دیا اور چھینا۔ مسٹر ڈیوڈسن کا وارث ہونے کی حیثیت سے اسے تین ہزار روپے ملے لیکن وہ گھر بھی ہو گیا۔ وہ بدستور اس فلیٹ میں رہ سکتا تھا مگر حقیقت پسندی نے اسے بتا دیا کہ اس مہنگے فلیٹ میں رہائش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا چنا اس نے فلیٹ کا بیشتر سامان فروخت کر دیا اور قریب ہی ایک کمرے کا ڈربے نما فلیٹ خر لیا۔ ماں کی چادر اب بھی اس کے پاس تھی۔ کئی برس پہلے اس نے اسے دھلوا کر احتیا سے رکھ لیا تھا۔ استعمال میں بھی نہیں لاتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ چادر پھٹے۔ کبھ تنہائی محسوس ہوتی تو چادر کو سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔

تدفین کے بعد وہ مسٹر ڈیوڈسن اور میگی کی قبر پر ایک بار بھی نہیں گیا۔ اسے ا ماں کی قبر کا علم تک نہیں تھا۔ ایسے میں قبروں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اب اس بات بارہ سال گزر چکے تھے۔ اب وہ ۳۲ سال کا تھا۔ اس دوران وہ ہر طرح کی ملازمتیں کر تھا۔

O-----O-----O

اس نے چائے کا ایک طویل گھونٹ لیا۔ چائے کی کڑواہٹ کے ڈر سے پیٹ مچلتی بھوک سہم کر بیٹھ گئی تھی۔ چائے کا یہ فائدہ سب سے بڑا تھا کہ بھوک لگے اور کھا میسر نہ ہو تو ایک پیالی چائے پی لو، بھوک سے کم از کم ایک گھنٹے کی نجات۔

”بتاؤ! قیامت کے بوریے سمیٹنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے، میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“ برابر کی میز سے بڑبڑاہٹ کی آواز ابھری۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ برابر والی میز پر ایک بڑے میاں براجمان تھے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار کا اندرونی حصہ تھا۔ اس میں غالبًا کوئی انٹرویو چھپا تھا۔ ایک عورت کی خاصی بڑی تصویر تھی۔ اس نے تصویر کے نیچے چھپی ہوئی عبارت پر مطلق دھیان نہ دیا۔

بڑے میاں اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر خوش ہو گئے۔ چہک کر بولے ”یہ ہے پیسے کا کھیل میاں صاحب! جنہیں اللہ نے بے حساب دیا ہے، انہیں زندگی مختصر لگتی ہے اور ایک ہم ہیں کہ مرنے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسے۔ ”اور وہ جینے کے لیے مری جا رہی ہے۔“

اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا اور بے دھیانی سے بولا۔ ”جی ہاں۔ درست فرما رہے ہیں آپ۔“ حالانکہ اس نے بڑے میاں کی بات پوری طرح سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے مسائل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”اس نے اب تک ہر جنگ جیتی ہے، سرمائے کے زور پر۔“ بڑے میاں نے مزید کہا۔ ”لیکن وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتی حالانکہ اس کے نزدیک سب سے اہم جنگ یہی ہے۔ یہ خدائی انصاف ہے میاں!“

”جی ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔“ اس نے خودکار انداز میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب سنجیدگی سے کوئی کلام تلاش کرنے کا وقت آگیا ہے۔ المیہ یہ تھا کہ اس کی ساکھ بے حد خراب ہو چکی تھی اور اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ کج رو اور بددیانت لوگ اسے اخلاقیات کا درس دیتے تھے۔

”دیکھو میاں! ہر آدمی کو ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہے۔ موت آدمی کا بینک بیلنس نہیں دیکھتی اور نہ ہی اس کی شہرت اور پوزیشن کو خاطر میں لاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے، جو سب کے لیے ہے۔ موت کا ایک دن معیّن ہے اور جب وہ دن آئے گا تو اسے بھی جانا پڑے گا۔“ بڑے میاں نے تبصرے کی تیسری قسط پیش کی۔

”جی ہاں۔ یہ تو ہے“ اس نے کہا لیکن بدستور اپنی سوچوں میں گم رہا۔ جیب اب جواب دینے والی تھی اور اسے ضرورت تھی ایک آئیڈیے کی.......... زبردست دھانسو آئیڈیے کی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوئی چھوٹا ہاتھ نہیں مارے گا بلکہ اس بار

ہوگی ایک لوہار کی۔ سوچنا صرف اتنا تھا کہ کس سمت میں ہاتھ مارا جائے۔ اسے اپنی ذہانت پر اعتماد تھا۔ وہ عام سی صورت حال سے اچھا اور بڑا موقع تراشنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

وہ اس شہر کی سڑکوں پر برسوں سے جوتے چٹخا رہا تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا کام، جس کے بعد زندگی فراغت سے گزرے۔ ایسا کام، جو جلدی سے تکمیل پا جائے۔ ایسا کام، جس میں دشواری ہو نہ محنت کرنی پڑے۔ وہ زندگی کے سمندر میں............ آخری سرے تک پہنچ گیا تھا۔ اسے فوری طور پر سہارا تلاش کرنا تھا ورنہ غرقابی یقینی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ دنیا میں توانائی اور ذہانت سے لبریز کسی نوجوان کے لئے کوئی مقام نہیں۔ وہ گڑھے نہیں کھود سکتا تھا، کلرکی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں، وہ انسانوں کو چاند پر پہنچانے کے لئے ٹریولنگ ایجنسی قائم کر سکتا تھا اور اس میں وہ بے حد کامیاب بھی رہتا مگر اس کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ نہ جانے کیوں ہر امکان کی تان، مگر اور لیکن ہی پر آکر ٹوٹتی تھی۔

اس نے ہر کاروبار کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہر دکان پر سیلز مین، دکان کے مالک کے لیے کمائی کر رہے تھے۔ اس کے عوض انہیں زندگی کے لیے تھوڑا سا زادِ راہ مل جاتا تھا۔ ہر کاروبار سستا خریدو اور مہنگا بیچو، کی بنیاد پر چل رہا تھا۔ تجوریاں بھر رہی تھیں اور اشیائے ضرورت مہنگی ہوتی جا رہی تھیں۔ پہلے انسان انسان کو کھلم کھلا خرید کر غلام بناتا تھا، اب اس نے ڈپلومیسی سیکھ لی تھی اور اتنے نت نئے حربے استعمال کرتا تھا کہ غلام آزادی کے وہم میں مبتلا رہتا تھا لیکن اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ غلامی کی غیر مرئی زنجیر نے اس کی آزادی کو ایک دائرے تک محدود کر دیا ہے۔

نوکری ملنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اچھے ملازم کی تعریف یہ تھی کہ وہ بے وقوف ہو، اس میں اپنے حال پر قانع رہنے کی صلاحیت ہو، کاروباری امور کو سمجھنے کی اہلیت سے یکسر محروم ہو اور محنت کے معاملے میں گدھے سے بڑھ کر ہو اور چیونٹی کی طرح بے زبان ہو۔ جو ملازم کاروباری گُر سمجھنے لگے، اسے فوری طور پر ملازمت سے نکال دیا جاتا تھا کہ کہیں کسی برے وقت میں کاروباری حریف بن کر مقابل نہ آکھڑا ہو۔ ہر بڑے کاروباری کو زبردست جدوجہد کرنا پڑتی تھی.......... تین جہتوں میں۔ ایک تو اپنے کاروبار کو ترقی دینا، دوسرے اپنے کاروباری حریفوں کو ہر طریقے سے زک پہنچانے کی کوشش کرنا اور ان کو دیوالیا کرنے کی کوشش کرنا۔ تیسرے اپنے لیے اور اپنے حریفوں کے لیے مزید کسی حریف کے ابھرنے کے امکان کی روک تھام کرنا۔ یہ تیسرا کام وہ تھا، جو تمام حریف مل کر کرتے تھے۔ جدوجہد کی ان تین سمتوں میں ایک مثبت تھی، پہلی اور دوسری دونوں منفی تھیں۔ گویا ہر شخص کم از کم دو تہائی منفی تھا اور ایک تہائی مثبت اور مثبت بھی وہ صرف اپنے لیے تھا۔

وہ بقا کی جدوجہد نہیں تھی کیونکہ بقا کی جدوجہد سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ تو کامیابی کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کی جدوجہد تھی۔ اور اس میں ہر شخص خود تک پہنچنے والے کو دھکیل کر نیچے گرانے کے درپے تھا۔ یہ سفاکی تھی، غیر انسانی حد کو پہنچی ہوئی خود غرضی تھی کیونکہ معمولی خود غرضی تو انسان کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کا اپنا مسئلہ صرف بقا کا تھا۔ وہ صرف ان لمحوں میں خود غرض اور سفاک ہوتا تھا، جہاں اس کی بقا داؤ پر لگ جائے یا مفادات متصادم ہوں۔ اس نے اپنی بے اصولی کو بھی اصول کی چار دیواری میں رکھا تھا لیکن دنیا میں، کاروباری لوگوں کے نزدیک اسمارٹ ہونا ناقابل قبول تھا۔ ایسے شخص کو فوراً ملازمت سے علیحدہ کرنا ضروری تھا اور اسمارٹ کون ہوتا ہے؟ جو ذہین ہو، بہت جلدی ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس میں آگے بڑھنے کی خواہش شدید ہو۔

اور وہ اسمارٹ آدمی تھا۔ اسی لیے وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس خواری میں اس نے ایک نکتہ سمجھ لیا تھا۔ وہ یہ کہ خود کو اس حد تک دوسرے کی ضرورت بنا دو کہ تمہارا متبادل اسے میسر نہ رہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں قانونِ بقا کی پہلی شق یہی ہے۔

اسے انٹر اسکول کرکٹ ٹورنامنٹ کا میچ یاد آگیا۔ وہ سیمی فائنل کھیل رہے تھے اور مخالف ٹیم نے پہلے بیٹنگ کی تھی، ۷۴ رنز پر ان کے آٹھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ لیکن دسویں نمبر پر آنے والا بیٹس مین، جو درحقیقت فاسٹ باؤلر تھا، سیٹ ہو گیا تھا۔ سکور ۷۰ ہو گیا تھا اور بظاہر ۶۰ رن پر بیٹھ.جانے والی ٹیم پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میچ ان کے ہوم گراؤنڈ پر ہو رہا تھا۔

۷۰ کے اسکور پر واٹر ٹائم ہوا۔ اس کے کلاس ٹیچر، جو ٹیم کے کوچ بھی تھے، اسے ایک طرف لے گئے۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ میچ پر اچھی بھلی ہماری گرفت تھی۔ اب ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ یاد رکھو، ڈھے جانے والی ٹیم جب اٹھ کھڑی ہو تو اس کا مورال کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اگر انہوں نے سو رنز بھی بنا لیے تو یقین کرو، وہ فیلڈنگ اور بالنگ میں جان لڑا دیں گے" ان کے لہجے میں برہمی تھی۔

"لیکن سر! میں تو ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"خاک کوشش کر رہے ہو!" کلاس ٹیچر ولیم نے کہا "پچھلے تین اوورز میں تم ایک باؤنسر بھی نہیں کیا۔"

"لیکن سر! وہ بیٹس مین نہیں ہے۔ میں اسے باؤنسر کیسے کرا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کرا سکتے؟" مسٹر ولیم نے بھنا کر کہا "نہیں کراؤ گے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دو گے۔ وکٹ کی حالت دیکھ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ بہت خراب کنڈیشن ہے۔ گڈ لینتھ پر بہت خطرناک اسپاٹ ہے۔"

"ہاں........ اور میرے منصوبے کے عین مطابق ہے۔ اسی لئے ٹاس جیتنا اہم تھا اور اسی لیے ٹاس جیت کر ہم نے انہیں بیٹنگ دی ہے۔"

وہ چکرا گیا "اور اب ہمیں خراب تر وکٹ پر بیٹنگ کرنا ہوگی۔" اس نے کہا۔ "اس طرح تو ہم میچ شروع ہی میں ہار گئے۔"

"نہیں۔ تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ اگر کوئی ٹیم ۵۰ یا ۶۰ رن پر آؤٹ ہو جائے تو اس کا مورال ڈاؤن ہو جاتا ہے، وہ فیلڈ میں اترنے سے پہلے ہی شکست خوردگی قبول کر لیتی ہے اور ایسی ٹیم کبھی نہیں جیت سکتی لیکن اس وکٹ پر انہوں نے سو رنز کر لیے تو سمجھو ہم ڈوب گئے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں سر؟"

"اسے باؤنسر کراؤ احمق! یا تو وہ آؤٹ ہو جائے گا یا زخمی ہو جائے گا۔"

"وہ ریگولر بیٹس مین نہیں ہے سر! میں اسے باؤنسر نہیں کرا سکتا۔"

"یہ کوئی تحریری قانون نہیں اور تم فرسٹ کلاس کرکٹ نہیں کھیل رہے ہو۔" مسٹر ولیم نے سخت لہجے میں کہا۔

"پھر بھی سر! غیر تحریری قوانین کا بھی باقاعدہ احترام کیا جانا چاہیے، خواہ کسی بھی لیول کی کرکٹ کھیلی جا رہی ہو اور پھر اس کی ضرورت کیا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ اگر وہ آؤٹ ہو گیا تو ٹیم کو فائدہ پہنچے گا اور زخمی ہو گیا تو دہرا فائدہ ہوگا۔ مخالف ٹیم اس وکٹ پر ایک فاسٹ بالر سے محروم ہو جائے گی۔ یقین کرو! اس صورت میں ہم میچ بہ آسانی جیت لیں گے اور اگر وہ زخمی نہ ہوا تو تم جانو، میں اس بار تمہیں ون ڈاؤن بھیج رہا ہوں۔ اس بالر کو فیس بھی تم ہی کرو گے۔"

"لیکن میرا نمبر تو........"

"ضرورت کے مطابق بیٹنگ آرڈر تبدیل کرنا پڑ رہا ہے۔ اس وکٹ پر ریگولر بیٹس مین سے زیادہ تم جیسے ہٹر کا چانس ہوگا۔ اسکور تھوڑا ہوگا اور تم تین چار چوکوں چھکوں سے پانسا پلٹ دو گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ون ڈاؤن بیٹنگ! اسے اپنے سر کی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔

"اب اگر اس کے بعد تم کرکٹ نہیں کھیلنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔" مسٹر ولیم نے سرد لہجے میں اسے دھمکایا اور پویلین کی طرف چلے گئے۔

وہ کھڑا سوچتا رہا۔ یہ بات طے تھی کہ مسٹر ولیم کا حکم نہ ماننے کی صورت میں وہ اسکول کی ٹیم سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جاتا۔ زخمی ہونے کا امکان الگ تھا اور پھر ٹیم فائنل میں بھی نہیں پہنچتی۔ ہر طرف خسارہ ہی خسارہ تھا۔

واٹر ٹائم کے بعد پہلا اوور اسی کا تھا۔ سامنے مخالف ٹیم کا وہی فاسٹ بالر تھا، جو فساد کی جڑ تھا۔ اس نے پہلی گیند اسٹمپس پر کرائی، جسے بیٹس مین نے سکون سے روک کر کھیلا۔ دوسری گیند تیز رفتار تھی اور آف اسٹمپ پر پڑ کر باہر کی جانب موو ہوئی۔ بیٹس مین بیٹ ہوا۔ گیند درحقیقت اس کے بیٹ کے بہت قریب سے گزری تھی۔ تیسری گیند اس نے گڈ لینتھ کے اسپاٹ پر ڈالی۔ بیٹس مین کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی اٹھے گی۔ وہ بڑے سکون سے بیک فٹ پر گیا لیکن گیند بہت تیزی سے اٹھی۔ بیٹس مین نے بے اختیار بلا اوپر اٹھا کر خود کو بچانا چاہا۔ اس نے منہ بھی پھیر لیا مگر گیند اس کے جبڑے پر لگی۔ اس کے ہاتھ سے بلا چھوٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا جبڑا تھاما اور بیٹھتا چلا گیا۔

مخالف ٹیم ۷۰ کے اسکور پر ہی آل آؤٹ ہو گئی، اور اس کی ٹیم نے وہ میچ دس وکٹ سے جیت لیا۔ اس دن کے بعد اس نے خود کو اسکول کرکٹ ٹیم کا لازمی جز ثابت کر دیا۔ مسٹر ولیم کو پھر کبھی اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اگلے سال اس نے میچوں پر شرطیں لگانی شروع کر دیں۔ اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ ایک بار نادانستگی میں وہ انٹر اسکول کرکٹ بورڈ کے ایک عہدے دار سے شرط لگا بیٹھا، جسے اس کے سلسلے میں پہلے ہی شکایات مل چکی تھیں۔ یوں وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور اس کے کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ اس کی حقیقت پسندی تھی کہ وہ آج بھی اس سلسلے میں خود کو ہی قصوروار ٹھہراتا تھا حالانکہ وہ راستہ اسے مسٹر ولیم ہی نے دکھایا تھا اور

وہ اس کے پارٹنر بھی تھے۔ یہ اس کی حماقت اور نااہلی ہی تو تھی کہ صرف وہ پکڑا گیا!

اس وقت سے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ذہانت کے ہتھیار کو عیاری کے ہاتھوں میں دے کر استعمال کرے گا اور خود کو کسی کے لیے بھی استعمال کی چیز نہیں بننے دے گا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہر چیز اور ہر شخص کے لیے دنیا میں اخلاقی ضابطوں کے دو سیٹ ہوتے ہیں اور دنیا انسانوں کے دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے.......... بے وقوف انسان او عقل مند انسان۔ عقل مند انسان اس نے بہت دیکھے تھے' جیسے مسٹر ولیم' جنھوں نے سیمی فائنل جیتنے کے لیے اس کے ہاتھوں مخالف ٹیم کے باؤلر کو زخمی کرایا تھا۔ جو شرطیں لگا کر اپنی پوزیشن خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اسے اپنا میڈیم بنا لیا تھا۔ اسے وہ قلفی والا بھی یاد تھا' جس نے سستی قلفی' بنانے کے چکر میں زہریلی قلفی بنا دی تھی' جس کی آمدنی تین روپے ہوتی تھی اور بارہ بچے اُس کی قلفی کھا کر اسپتال پہنچ گئے تھے۔ بعد میں ان میں سے دو نے قبرستان کا رخ کیا تھا۔ اس نے وہ سیاست داں بھی دیکھے تھے جو اشتعال پھیلا کر لوگوں کو لڑواتے تھے تاکہ انہیں پریس کانفرنس کا موقع مل جائے اور وہ کوئی زوردار ہمدردانہ بیان دے کر اپنی عوام دوستی کا پرچار کر سکیں۔ وہ سب عقل مند انسان تھے اور ان کے ہاتھوں خسارہ برداشت کرنے والے بے وقوف تھے۔

یہ شماریاتی حقیقت تھی کہ دنیا میں عقل مند کم تھے اور بے وقوف بہت زیادہ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شاہوں اور ان کی رعایا کے درمیان عددی تناسب کیا ہوتا ہے۔ شہنشاہیت بظاہر ختم ہو گئی تھی لیکن درحقیقت دنیا میں ختم تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس انداز' چہرہ اور روپ بدل جاتا ہے۔

اسے بدمعاشی پسند نہیں تھی۔ وہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا قائل بھی نہیں تھا البتہ شعبدے بازی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سادہ پانی کو آب حیات کہہ کر فروخت کرنے میں تو کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ امریکی لوگ اس کا آئیڈیل تھے۔ وہ شارٹ کٹ کو اہمیت دیتا تھا اور ریکٹ کی افادیت کا قائل تھا۔ اپنے ملک میں ہونے والے جرائم اس کے نزدیک شرم ناک تھے۔ یہاں ذہانت کی جگہ تشدد تھا۔ اغواء قتل' اچکا پن سب کچھ گھٹیا تھا۔ دماغ استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

وہ اب تک ناکام تھا تو اس کی جزوی ذمے داری حالات پر اور باقی اس کی بدقسمتی پر عائد ہوتی تھی۔ اس نے اتنے کام کیئے تھے کہ پوری طرح سب کو یاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سیلز مین' رپورٹر' فلمی کہانی نویس' مترجم' کلرک اور ریڈیو اناؤنسر۔ اس نے ایک ڈائجسٹ

کے لئے سلسلے وار کہانی بھی لکھی تھی۔ اس سلسلے وار کہانی کی چھ قسطوں کے بعد ڈائجسٹ کی اشاعت چھ گنا ہو گئی تھی۔ اس نے پبلشر سے معاوضے میں پچاس فیصد اضافے کا مطالبہ کیا تو وہ اس معاوضے سے بھی گیا' جو اسے مل رہا تھا۔ پبلشر نے اس کے مقابلے میں آدھے معاوضے پر مختلف مصنّفین سے قسطیں لکھوانی شروع کر دیں۔ کہانی کیونکہ کردار کے نام سے چھپ رہی تھی' اس لیے وہ اف بھی نہ کر سکا۔ آخری قسط کا معاوضہ اب تک نہیں ملا تھا۔ وہ جب بھی جاتا' جواب ملتا۔ "بے صبرے نہ بنو' مل جائے گا یار! اس ملک میں کوئی صبر ہی نہیں کرتا۔" اب اس بات کو ایک سال ہو گیا تھا اور وہ سچ مچ صبر کر بیٹھا تھا جو کہ مدیر صاحب کے بقول اس ملک میں عنقا ہے۔ دوسری طرف اسے یاد تھا کہ ایک بار قسط پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی تو مدیر صاحب نے اس کے گھر کے بارہ اور پبلشر صاحب نے تین چکر لگائے تھے بلکہ دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے' جیسے تخلیق بھی کوئی مشینی کام ہو۔

واقعی' اس ملک میں کوئی صبر نہیں کرتا!

اب اس کی ساکھ کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف ایک ہی بات کہی جاتی۔ "ارے' وہ یوسف عالم! آدمی اچھا ہے بھائی' ذہین بھی ہے مگر ضرورت سے بہت زیادہ۔ اس سے کام لیتے ہوئے ہر وقت اس پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔ لگتا ہے' کسی بھی وقت ہمیں بے دخل کر کے تمام کاروبار کا مالک بن بیٹھے گا۔"

"مرنا تو سبھی کو ہے میاں!"

اس نے پھر چونک کر دیکھا۔ بڑے میاں نے اخبار تہ کر دیا تھا اور اسے ہلا رہے تھے۔

"سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔" بڑے میاں نے مزید گل افشانی کی۔ "میں' تم.......... یہاں تک کہ جینا میلکم کو بھی مرنا پڑے گا۔ اس کی تمام دولت' اربوں روپے بھی اسے مرنے سے نہیں بچا سکیں گے۔ سب بینک میں دھرے رہ جائیں گے.......... بے کار! شادی کر لی ہوتی اس نے تو کم از کم اس کی اولاد ہی اس دولت سے کچھ فیض یاب ہو جاتی۔ سچ ہے' پیسے سے کچھ نہیں ملتا۔ اب کتنی خوف زدہ ہو گی وہ۔"

اس نے اس پوری تقریر میں صرف ایک لفظ سنا "دولت" اور پھر اس دولت کا حساب جو اربوں میں تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جینا میلکم کا نام تو جانا پہچانا ہے۔ "ذرا یہ

اخبار دکھائیں مجھے۔" اس نے بڑے میاں سے مؤدبانہ کہا۔

"ہاں میاں ضرور۔ اخبار ہوٹل کا ہے۔" یہ کہہ کر بڑے میاں نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولا۔ اوپر ملک کی سب سے دولت مند خاتون جینا میلکم کی تصویر تھی اور نیچے مختصر سا انٹرویو، جو اس کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقعے پر لیا گیا تھا۔ اس نے غور سے جینا میلکم کی تصویر کو دیکھا۔ آنکھوں سے سختی اور برہمی جھلک رہی تھی۔ اس کی ناک عقاب کی چونچ سے مشابہ تھی۔ وہ بہت بوڑھی تھی مگر اس کا انداز شاہانہ اور پُروقار تھا۔ وہ انٹرویو پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

انٹرویو کے وقت مس جینا میلکم کے ساتھ ان کی سیکرٹری راحیلہ میلکم ذیشان بھی تھی۔ مس جینا میلکم نے حکومت کی سفاک ٹیکس پالیسیوں کی پرزور مذمت کی اور کہا کہ حکومت صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے، جس کی وجہ سے بے روزگاری کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ واضح رہے کہ مس جینا اور حکومتوں کے درمیان یہ چپقلش گزشتہ بیس سال سے چل رہی ہے۔ مس جینا نے تلخ لہجے میں کہا۔ یہ لوگ میرے مرنے کے منتظر ہیں تاکہ میری دولت ہتھیا سکیں لیکن یہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ میں انہیں مایوس کر دوں گی۔ موت کی طرح۔ اور یہ سب میری موت کے منتظر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ میں ان سے پہلے مرنے والی ہرگز نہیں........"

"کیوں، ہے نا بکواس؟ بے تکی باتیں؟" بڑے میاں بولے۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پڑھ کر اس کے ذہن میں گھنٹی سی بجنے لگی۔ پھر اسے یاد آ ہی گیا۔ جینا ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر ایسا ہی ایک بیان چھپواتی تھی، جیسے انہیں چڑا رہی ہو........ دیکھ لو، میں اب بھی زندہ ہوں، یہ ایک طرح کا مذاق تھا اس کا۔

"جی ہاں، نری بکواس ہے۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔ "موت ہی تو ایک ایسی چیز ہے، جس سے بچنا ناممکن ہے۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ انکم ٹیکس والوں کی طرح موت کو بھی چکر دے لے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔"

اس کے ذہن میں اس وقت صرف ایک چیز گردش کر رہی تھی اور وہ یہ کہ اگر کوئی چکر چلا کر جینا میلکم کو پھنسا لیا جائے تو اتنی دولت مل سکتی ہے کہ عمر بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہ پڑے مگر پھنسانے سے اس کی مراد امریکہ اسٹائل کا پھنسانا ہرگز نہیں تھا۔ اس

لسلے میں وہ امریکیوں کو بے وقوف سمجھتا تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی ذہانت ہوئی کہ کسی نوجوان نے دولت کی خاطر کسی بڑھیا سے شادی کر لی۔ نہیں بھئی، یہ بات تو بس ناقص العقل ورتوں پر جچتی ہے۔ اور جس عورت نے اپنی جوانی میں کسی مرد کو اپنی دولت میں شریک ہیں کیا، وہ اب ۷۵ سال کی عمر میں یہ حماقت کیوں کرے گی؟ خواہ کتنی ہی ناقص العقل کیوں نہ ہو۔ پھنسانے سے اس کی مراد کچھ اور تھی........ کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ ہ جانتا تھا کہ جینا میلکم کی دولت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ان گنت کارخانے تھے، امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس الگ تھا۔ اس کے پاس سے لاکھوں کہیں نکل جاتے تو سے پتا بھی نہ چلتا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کیسے پھنسایا جائے؟ ویسے اس کی چھٹی حس کہہ ہی تھی کہ ان تلوں میں تیل ہے بھی اور نکالا بھی جا سکتا ہے۔ اسے صرف اپنے وار کی مت کا تعین کرنا تھا۔

اس نے پھر اخبار پر نظر ڈالی۔ اخبار میں اس کی سیکریٹری کا بھی تذکرہ تھا۔ راحیلہ یلکم ذیشان۔ عجیب نام تھا یہ۔ اسے خواہ مخواہ راحیلہ میلکم ذیشان پر رشک آنے لگا۔ وہ جو وئی بھی ہو گی، یقیناً کوئی ہشیار اور ذہین عورت ہو گی۔ اس نے جینا میلکم کے ذریعے اپنے لیے ایک محفوظ مستقبل کا بندوبست کر لیا تھا۔

اس نے راحیلہ میلکم ذیشان کا تصور کیا۔ وہ بھنچے بھنچے ہونٹوں اور سنگی چہرے والی ڈھیڑ عمر دوشیزہ ہی ہو سکتی ہے، جس نے اپنے ایامِ شباب کو بڑھاپے کے تحفظ کی خاطر جینا بلکم کے کنوارپن کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دیا ہو گا اور وہ یقیناً جینا کی دور پرے کی رشتے ار بھی ہو گی۔ اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ جینا کے خیال کے برعکس، محکمہ انکم ٹیکس اور کومت تو نہیں البتہ اس کی بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ سیکرٹری مس راحیلہ میلکم یشان اس کی موت کی شدت سے منتظر ہو گی کیونکہ جینا میلکم کا کوئی رشتے دار کبھی سامنے میں آیا تھا۔ اس صورت میں راحیلہ ہی کو اس کی تمام دولت ملنی تھی۔ تمام دولت نہ ہی، اس دولت کا ایک حصہ تو اسے ملے گا ہی اور جینا کی دولت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی تین پشتوں کے لیے تو یقیناً کافی ثابت ہو گا اور اس وقت تک مس راحیلہ بھی جینا کی رح تنہا، بے رنگ اور خوشیوں سے محروم زندگی سے سمجھوتا کر چکی ہو گی۔

یوسف کو دولت کی طلب بھی تھی۔ وہ دولت کی اہمیت کا منکر بھی نہیں تھا لیکن ں کے نزدیک زندگی کی، اس کی مسرتوں کی اہمیت بھی برابر کی تھی۔ اس کے نزدیک یہ یا کی بدترین حماقت تھی کہ آدمی دولت کے بدلے زندگی سے، دنیا کی ہر خوشی سے دست

بردار ہو جائے۔ اسے سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ لوگ معلوم ہوتے تھے‘ جو دولت کما میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس اس دولت سے خوشیاں ‘ آسائشات او عیش خریدنے کی فرصت ہی نہ رہے۔ اس کا اپنا فلسفہ یہ تھا کہ دونوں چیزیں حاصل ہو چاہئیں۔ ان میں سے کسی ایک سے دست برداری کا تصور اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا اسے حیرت ہوتی تھی کہ لوگ دولت سے اتنی بری طرح کیسے چمٹ جاتے ہیں کہ موت جیسی اٹل حقیقت سے انہیں خوف آنے لگتا ہے۔ خوف تو آنا چاہئے لیکن اسے لیے نہی کہ ان کی دولت جاتی رہے گی۔ موت سے خوف کی فطری وجہ تو یہ ہے کہ آدمی کو زند جیسی چیز سے محرومی کا قلق ہوتا ہے۔ آدمی مرجائے تو پرندے ہر صبح اس کے لیے خو الحانی نہیں کرتے‘ سورج کی اولین کرنیں اسے گدگدانے کے لیے نہیں لپکتیں‘ صبح کی نر ہوا اس کے وجود سے لپٹنے کے لیے نہیں چلتی‘ تیز دھوپ میں درخت اس کے لیے سا نہیں بچھاتے‘ بارش اس کے لیے نہیں ہوتی‘ پھول اس کے لیے نہیں کھلتے‘ دھنک ا کے لیے نہیں لہراتی‘ خوش گوار سرد چاندنی اس کے وجود میں ہلچل نہیں مچاتی‘ ستارے اسے دیکھ کر پلکیں نہیں جھپکاتے اور وہ شدید بھوک کے بعد پیٹ بھرنے کی ازلی‘ ابد اور آفاقی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ موت کے خوف کی وجہ زندگی سے محبت ہو تو یہ خوف مثبت ہے اور اگر اس خوف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی محنت سے کمائی ہوئی دولت اس سے چھن جائے گی تو یہ منفی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بہت زیادہ دولت مند لوگ بہت زیاد عملی ہوتے ہیں مگر صرف مڈ وائف کے روپ میں.......... دولت کے بطن سے مزید دولت پیدا کرانے کے سلسلے میں۔ اس سے ہٹ کر عام طور پر ان کا رویہ بے حد بچکانہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بے حد ذہین آدمی انہیں بہ آسانی الو بنا کر لوٹ سکتا ہے اور ان کی ا انہیں اس شخص کی خباثت کو سامنے بھی نہیں لانے دیتی کیونکہ اس صورت میں ان کی حماقت بھی تو سامنے آئے گی۔ وہ خود اپنے ہاتھوں بلیک میل ہوتے ہیں۔

اس نے بڑی شدت سے کندھے جھٹکے۔ آخر کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا بھی تو حماقت ہی ہے اور اسے حماقت سخت ناپسند تھی۔ دوسروں میں نہیں‘ صرف خود میں! ج کچھ وہ سوچ رہا تھا‘ جانتا تھا کہ اس سے پہلے بھی بہت لوگ سوچ چکے ہوں گے‘ بہت سے اس وقت بھی سوچ رہے ہوں گے اور نہ جانے کتنے اس کے بعد بھی سوچیں گے لیکن صرف سوچنے سے تو کام نہیں بنتا۔ بات تو جب ہے کہ جو کچھ سوچا جائے‘ سو فی صد قابل عمل ہو اور سوچنے والا اس پر بہترین انداز میں عمل پیرا ہونے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ پھ سوچ میں اچھوتا پن ہو‘ آئیڈیا بالکل نیا ہو تاکہ ناکامی کا کوئی سوال نہ رہے..........

”جی ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے“ اس نے بڑے میاں سے کہا۔

”اور کیا۔ بھلا ہمیشہ کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ بلکہ زندگی کا تو ایک لمحے کا بھروسا بھی نہیں“ بڑے میاں نے نہایت تند لہجے میں کہا۔ انداز میں مسرت بھی تھی‘ جیسے وہ سوچ رہے ہوں کہ اگر میں ہمیشہ نہیں جی سکتا تو کوئی اور بھی نہیں جی سکتا۔ پھر وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چل دیے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کے آخری نوٹ کو پھر سہلایا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے چائے اور سگریٹ ضروری تھی۔ جیب میں صرف چھ سگریٹ اور دس روپے.......... بلکہ صرف ساڑھے آٹھ روپے تھے۔ ڈیڑھ روپے کی تو وہ چائے پی چکا تھا۔ سگریٹ کے سلسلے میں اس نے نہ جانے کیسے ضبط کیا تھا۔ ورنہ چائے کے بعد تو سگریٹ کی طلب ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ مزید چائے پی جائے۔ یہ ایک طرح کی انویسٹ منٹ ہے اور ضرورت پڑی تو سگریٹ بھی خریدی جائے گی۔

اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکالی۔ پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کو جام کی طرح بلند کیا‘ جیسے جام سے جام ٹکرا رہا ہو اور زیرِ لب کہا ”مستقبل کے نام“ پھر اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا دسلائی جلائی اور سگریٹ سلگائی۔ بے تابانہ گہرا کش لے کر اس نے دھواں نیچے اتارا اور جلتی ہوئی تیلی کو دیکھتا رہا‘ جو ایک لمحے بعد خود ہی بجھ گئی۔ سگریٹ کا پہلا کش لیتے ہی جیسے وہ تازہ دم ہو گیا۔ دماغ میں جیسے دھوپ کے رخ پر کوئی کھڑکی کھلی‘ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔

”شم مس! ابے او شم مس! ایک چائے اور بول دے پشاوری!“

کچھ دیر بعد چائے بھی آگئی۔ وہ باری باری چائے کا گھونٹ اور سگریٹ کا کش لیتا رہا۔ اس دوران اس نے اخبار کا وہ حصہ‘ جس میں جینا میلکم کا انٹرویو چھپا تھا‘ تہہ کر کے مختصر کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ نہ جانے کیوں‘ اخبار جیب میں رکھتے ہوئے اسے ایسا لگا‘ جیسے وہ جینا کی دولت کا ایک بڑا حصہ اپنی جیب میں رکھ رہا ہو۔

چائے ختم کر کے اس نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور کاؤنٹر پر تین روپے ادا کر

کے باہر نکل آیا۔ اب اس کی جیب میں صرف سات روپے تھے..........

○-----○-----○

کافی دیر سوچنے کے بعد یوسف اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلا مرحلہ عملی نوعی ہے.......... سرمائے کی فراہمی' چنانچہ اس نے مینار ڈائجسٹ کے دفتر کا رخ کیا۔ قسمتی سے پبلشر صاحب موجود تھے اور مزید خوش قسمتی یہ کہ اچھے موڈ میں بھی تھے بھئی یوسف! آؤ۔ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہا تھا' انہوں نے چہک کر کہا۔

"خ.......... خیریت تو ہے جناب؟" اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

آفندی صاحب نے زور دار قہقہہ لگایا "یار تم نے فلموں کی کہانیاں لکھیں بتاؤ' اداکاری کیوں نہیں کی؟ خوش شکل بھی ہو اور میں نے دیکھا ہے کہ تم میں اداکار بے پناہ صلاحیتیں بھی ہیں۔"

"بس صاحب! کسی پروڈیوسر کو آپ جیسی نظر ہی نہیں ملی۔ ویسے یہ فرمائیں' مجھے یاد کیوں کر رہے تھے؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"ایک اور پرچا نکال رہا ہوں۔ سوچا' تم سے ایک قسط وار کہانی ہی لکھوا لوں۔'

"اوہ! لیکن جناب' یہاں تو مالی پریشانیوں کی وجہ سے تخلیقی سوتے ہی خشک ہو ہیں۔ دیکھئے نا' یہ ذہن کی زمین بھی عجب ہے۔ آسودگی کی کھاد اور فراغت کا پانی نہ لق و دق صحرا بن جاتی ہے۔"

"واہ بھئی واہ!" آفندی صاحب پھڑک اٹھے "تخلیقی سوتے خشک ہونے پر یہ ہے تو جاری ہونے پر کیا کرو گے؟"

"اس کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں۔"

"دیکھو میاں! ناممکن کچھ بھی نہیں" انہوں نے کہا اور کچھ دیر سوچتے رہے۔ ایسا تھا' جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آخر کار بولے "میرا خیال تمہاری آخری قسط کی پے منٹ ابھی تک مکمل طور پر نہیں ہوئی ہے۔"

"جی' پے منٹ تو جزوی طور پر بھی نہیں ہوئی" اس نے دل کڑا کر کہا۔

اوہ' ہوں" وہ پھر سوچ میں پڑ گئے "ہوں۔ تو پوری قسط کی پے منٹ واجب ہے۔ خیر.........." یہ کہہ کر انہوں نے دراز کھول کر چیک بک نکالی' چیک لکھا اور اس طرف بڑھاتے ہوئے بولے' "یہ پانچ سو روپے کا چیک لے جاؤ فی الحال۔ باقی رقم نئی کے معاوضے کے ساتھ مل جائے گی۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے دل ہی دل میں نئی قسط پر لعنت بھیجی لیکن بظاہر مسکراتے ہوئے بولا "شکریہ"

"تو نئی قسط کب تک دے دو گے؟" اس بار آفندی صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

اس بار وہ سوچ میں پڑ گیا حالانکہ سوچنے کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اسے قسط لکھنی ہی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ صاف انکار کر دے مگر اس صوت میں یہ بھی ممکن تھا کہ آفندی صاحب چیک کی پے منٹ رکوا دیتے۔ چنانچہ اس نے بڑے جوش سے کہا "ٹھیک ایک ہفتے بعد مل جائے گی۔"

"گڈ۔ ویری گڈ" آفندی صاحب بے حد خوش ہو کر بولے' "تم نے انشاء اللہ نہیں کہا۔ اس کا مطلب ہے' قسط واقعی ایک ہفتے بعد مل جائے گی۔"

اس نے دانت نکال دیے "آپ بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔"

"لیکن یار! آئیڈیا زور دار ہونا چاہئے' دھانسو قسم کا۔ پے منٹ کی تم فکر نہ کرو۔ جانتے ہو' ہم اس معاملے میں کتنے کھرے ہیں۔"

اس نے سوچا' مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا کہ آپ پے منٹ کے معاملے میں کتنے کھرے ہیں.......... کھرے اور کھوٹے۔ "بالکل درست۔ آپ آئیڈیے کی بالکل فکر نہ کریں اور میں پے منٹ کی ذرا بھی فکر نہیں کروں گا" اس نے بے حد سچائی سے کہا۔ ظاہر ہے' جب اسے لکھنا ہی نہیں تھا' تو دونوں پارٹیوں کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

اگلی صبح اس نے چیک کیش کرایا۔ اب وہ بے فکری اور سکون سے سوچ سکتا تھا۔ وہ ہر کام میں ترتیب کا قائل تھا اور معلومات اور جزئیات کو بہت زیادہ اہمیت دیتا چنانچہ سب سے پہلے اس نے جینا میلکم پر تحقیقاتی کام کرنے کا فیصلہ کیا اس سلسلے میں اخبارات اور اخبار نویسوں سے بہت مدد ملتی ہے' اس کا اسے تجربہ تھا۔ اخبار نویسوں کے حلقے میں اس کے اچھے خاصے تعلقات بھی تھے۔

چنانچہ اس نے عمل کے پہلے مرحلے میں قدم رکھ دیا۔

○-----○-----○

جینا میلکم' کرنل رچرڈ میلکم کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا' چارلس میلکم۔ جس وقت ان کی ماں کا انتقال ہوا' چارلس

تین سال کا اور جینا آٹھ سال کی تھی۔

کرنل رچرڈ میلکم جدی پشتی رئیس تھا۔ اسے اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا' جو شروع ہی سے بے حد عملی تھی۔ چارلس آرٹسٹک مزاج کا نرم خو لڑکا تھا۔ کرنل نے ریٹائرمنٹ کے بعد برطانیہ واپس جانا چاہا لیکن جینا اور چارلس ہندوستان چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے چنانچہ کرنل نے ہندوستان میں کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا اور وہیں سیٹل ہو گیا۔ اس نے ٹیکسٹائل مل سے شروعات کی تھی۔ جلد ہی اس کا صنعتی کاروبار بہت زیادہ پھیل گیا۔ تبھی اسے جینا کی کاروباری سمجھ بوجھ اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا علم ہوا۔ اس کے برعکس چارلس کو پینٹنگ کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔

پھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے سر اٹھایا انہی دنوں کرنل رچرڈ کو زبردست ذہنی صدمہ اٹھانا پڑا۔ چارلس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی' جو مسلمان تھی۔ صرف یہی نہیں وہ مسلمان بھی ہو گیا.......... اور خود کو ذیشان میلکم کہلوانے پر مصر ہو گیا۔ کرنل میلکم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ اس نے فوری طور پر چارلس کو عاق کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ آئندہ وہ اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ میلکم کا نام بھی استعمال نہیں کر سکتا' چنانچہ ذیشان میلکم' ذیشان احمد بن گیا۔

اس سانحے کے بعد کرنل کے لیے جینا ہی سب کچھ ہو گئی۔ جینا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے باپ کی خاطر بہت بڑی قربانی دی۔ اس نے باپ کو علم ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ خود بھی ایک مسلمان نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ کچھ تو یوں کہ وہ اتنی بڑی جائیداد اور بے اندازہ دولت سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی اور کچھ اس لیے کہ وہ باپ کو مزید کسی صدمے سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی کہ نیا صدمہ باپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو گا چنانچہ وہ اپنا کرب سینے میں چھپائے کاروبار کی دنیا میں گم ہو گئی۔ باپ بستر سے لگ چکا تھا۔ اس نے خود کو باپ کی خواہشوں اور امنگوں کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس نے باپ سے ہر کاروباری رمز سمجھا اور اپنے طور پر اضافے بھی کیے لیکن اس انقلاب نے اندر ہی اندر اس کی شخصیت کو پیچ در پیچ بنا دیا۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے محبوب سے کبھی نہیں ملی حالانکہ وہ اس کی خاطر بڑی آسانی سے مذہب تبدیل کر سکتی تھی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چارلس سے حسد کرنے لگی' جس نے اپنی محبت کے حصول کے لیے کسی بھی چیز کی پروا نہیں کی تھی' اور ہر طرح کی محرومی کو یوں قبول کر لیا تھا جیسے اس کی کوئی

ہیت ہی نہ ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بھائی سے نفرت ہو گئی ہو۔ وہ اب بھی س سے محبت کرتی تھی.......... اپنے انداز میں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی معاشی رحالی کا شکار ہے۔ وہ باپ سے چھپ کر بھائی سے ملتی تھی' لیکن مالی طور پر اس کی مدد رنے کا خیال اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ وہ بھائی کے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی یکن اس کی بیوی سے چڑتی۔ اب یہ عجیب بات تھی کہ بھائی کے بچے زیادہ عرصے جیتے یں تھے۔ سات سال میں اس کے بھائی نے پانچ بچے گنوائے۔ اس سلسلے میں بھی وہ چیدگی کا شکار تھی۔ اسے دکھ بھی ہوتا اور خوشی بھی۔

کرنل رچرڈ میلکم کی موت واقع ہوئی تو وہ ۳۵ سال کی تھی۔ باپ کی وصیت پڑھ لر اسے اندازہ ہوا کہ باپ اس کی محبت سے لاعلم نہیں تھا کیونکہ اس نے ہندوستان اور طانیہ میں اپنی تمام دولت اور جائیداد چھوڑی تو اسی کے نام تھی مگر مشروط طور پر۔ اس نے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ اسے یقین ہے' جینا جب بھی شادی کرے گی کسی ندوستانی مسلمان سے کرے گی چنانچہ وہ اپنی تمام دولت اور جائیداد اس شرط پر اس کے م چھوڑ رہا ہے کہ جینا کبھی شادی نہ کرے اور اس جائیداد میں سے کچھ بھی چارلس کو نہ ے۔ البتہ چارلس کی اولاد کی بات اور ہے۔ دونوں شرطوں میں سے ایک کی بھی خلاف رزی ہوئی تو وہ جائیداد سے محروم ہو جائے گی۔ گویا تمام جائیداد حکومت کی ہو جائے گی۔ ینا کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ اس کے باپ نے اس پر تبار نہیں کیا' صرف اس لیے کہ وہ اس کی محبت سے واقف تھا۔

بہرحال' اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ برطانیہ کبھی نہیں جائے گی اس نے برطانیہ کی ام املاک فروخت کر دیں اور ہندوستان میں اپنا کاروبار مستحکم تر کرنے میں گم ہو گئی۔ ارلس سے وہ ہمیشہ کی طرح ملتی رہتی۔ اس کی معاشی ابتری اس کے سامنے تھی لیکن ارلس نے اس سے کبھی مدد طلب نہ کی۔ طلب کی ہوتی' تب بھی وہ کبھی اس کی مدد نہ رتی۔ اس کے نزدیک وہ معاشی' ابتری چارلس کی محبت کی کامیابی اور خواب کی تعبیر کی ت تھی اور قیمت ادا کیے بغیر تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ خود اس نے جو بے اندازہ دولت صل کی تھی' اس کی بھی قیمت ادا کی تھی۔ اس نے اپنے خواب جلائے تھے۔ اپنے ھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی دولت سے عشق تھا اور وہ ا میں سے کسی کو ایک دھیلا دینے کی بھی روادار نہیں تھی۔

پھر چارلس کے ہاں راحیلہ پیدا ہوئی۔ آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ بچی زندہ رہے

گی۔ چارلس کے معاشی حالات اب بھی ابتر تھے۔ لیکن بچی کو پا کر وہ اور اس کی دونوں خوش تھے۔

پھر حالات بدلے اور ہندوستان کی تقسیم کا مکان سامنے آیا۔ مسلمان اپنی لیے عل مملکت مطالبہ کر رہے تھے۔ دو اندیش جینا نے بھانپ کیا کہ ہندوستان بٹ کر رہے گا۔ نے ممکنہ پاکستان میں سرمایہ کاری شروع کر دی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا محرک کیا ممکن ہے' اس نے سوچا ہو کہ نئ مملکت میں کاروبار زیادہ سود مند رہے گا۔ بہرحال سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تقسیم کی نوعیت کا اسے یقیناً علم رہا ہو وائسرائے سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اور جب پاکستان بنا تو وہ اپنا تمام تر سر وہاں منتقل کر چکی تھی۔

دوسری طرف اس کا بھائی بھی ہجرت کر کے پاکستان آگیا تھا۔ یہاں اس کی مع حالت اور ابتر ہو گئی تھی۔ جینا اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت تعمیر کرنے میں مصروف ہو تھی۔ اب اسے صرف ایک ہی شوق تھا.......... دولت سے دولت پیدا کرنے کا شوق۔

پھر ایک حادثے میں چارلس اور اس کی بیوی ختم ہو گئے راحیلہ اس وقت آ سال کی تھی۔ اس کا دنیا میں جینا کہ سوا کوئی نہیں تھا۔ جینا اسے اپنے ساتھ لے آئی اس نے باقاعدہ منصوبے کے تحت اس کی پرورش اور تربیت کی اور تعلیم دلائی..........

---------○---------○

یوسف ممکنہ طور پر تمام معلومات سے لیس ہو چکا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ کام کہ سے شروع کرے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اسے جینا میلکم کے ہاتھوں کیا فروخت کرنا لیکن وہ چیز کہاں سے ملے گی' کیسے ملے گی اور ملے گی بھی یا نہیں' ان تمام سوالوں کا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر ابدی زندگی کا' ہمیشہ جینے کا کوئی فارمولا ممکن ہے' اسے وہ فارمولا جینا میلکم کو بیچنا تھا۔ یہ بات ناممکن تھی مگر ناممکن کو ممکن بنانا ہی اس کا تھا۔ وہ دنیا کا بہترین سیلز مین تھا اور ناموجود چیزیں تک فروخت کرنے کی اہلیت رکھتا تھ بس ایک دشواری تھی۔ اس کے سامنے ایک گھاگ کاروباری عورت تھی' جس نے پو زندگی صرف خرید و فروخت میں گزاری تھی۔ اسے بے وقوف بنانا کوئی آسان کام نہیں اور پھر کوئی بنیاد بھی تو ہو!

سو اب وہ بنیاد تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ملے گی اس روز وہ چرچ کے سامنے سے گزر رہا تھا' جہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ چرچ سامنے' میدان میں ٹینٹ لگا تھا' وسیع و عریض ڈائس تھا' لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کوئی تقریر کر رہا تھا' "آدم علیہ السلام نو سو تیس سال تک جئے' نوح علیہ السلام نے نو سو پانچ سال عمر پائی۔ ان کے متعدد بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں.........."

یوسف بہت تھکا ہوا تھا اور بے حد پژمردہ اور مایوس بھی۔ اب تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ایک اور دن گزر گیا تھا اور وہ بے حد تلخی سے سوچ رہا تھا کہ اس کا کیا بنے گا؟ وہ بہت زیادہ عقل مند بننے کے چکر میں بے وقوف تو نہیں بن رہا ہے؟ اب تو جیب بھی کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ پانچ سو روپے کہاں تک ساتھ دے سکتے تھے۔

وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا' چنانچہ ابتدائی الفاظ نہ سن سکا لیکن نو سو پانچ سال کی عمر اس کی سماعت میں گھس آئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر وہ بری طرح چونکا۔ بات اس کے شعور تک پہنچ گئی تھی۔

اس وقت تک وہ چرچ کے گیٹ سے آگے نکل آیا تھا۔ وہ پلٹا اور چرچ میں داخل ہو گیا۔ پنڈال کے عقبی حصے میں کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر الگ تھلگ بیٹھ گیا۔ وہاں غالباً کوئی کنونشن ہو رہا تھا۔ اس نے مقرر کو دیکھا اور اسے پہچان بھی لیا۔ وہ فادر تھامس تھا۔ وہ فادر کو اس وقت سے جانتا تھا' جب وہ جوزف ڈیوڈسن تھا اور کبھی کبھار چرچ آجایا کرتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ فادر اسے نہیں پہچان سکے گا۔

اسے تقریروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' چنانچہ وہ بڑی دلجمعی.......... سے بیٹھا' اپنے منصوبے کے متعلق سوچتا رہا جس کا ابھی خاکہ بھی نہیں بنا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ خوش قسمتی نے اسے کامیابی کے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ جینا میلکم کو ابدی زندگی فروخت کر سکے گا۔

وہ بڑی بے چینی سے تقریب ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریب ختم ہوئی۔ اور سامعین تو فوراً ہی رخصت ہو گئے لیکن مقررین مہمان تھے۔ انہیں فادر تھامس نے بڑے احترام سے رخصت کیا۔ وہ آخری مہمان کو رخصت کر کے واپس آ رہے تھے کہ ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ بدستور عقبی حصے کی اس کرسی پر بیٹھا تھا۔

"برادر! میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں؟" فادر نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

"فادر! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"ضرور پوچھو برادر!"

"آپ اپنی تقریر میں طویل العمری کا تذکرہ کر رہے تھے کہ انبیاؑ نے کتنی طویل

عمریں پائیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کی طویل زندگی کا کیا راز تھا؟ زمانے میں سبھی کی عمریں طویل ہوتی تھیں۔ کیوں؟"

فادر کی آنکھوں میں روشنی تھرکنے لگی "برادر! یہ سب کچھ بائبل میں موجود انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود بائبل کو لہرایا "بائبل میں کیا کچھ نہیں ہے! زندگی کائنات کے بارے میں تم جو کچھ بھی جاننا چاہو گے' اس کا جواب تمہیں بائبل میں ملے خداوند کی اس کتاب میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ خدا تمہارا نگہبان ر برادر' بائبل پڑھا کرو۔"

"تھینک یو فادر" اس نے کہا اور پلٹ کر چلنے لگا۔

"اے برادر" فادر نے اسے پکارا "اس رسی کو تھامے رہو۔ یہاں آؤ' میں تمہی بہت کچھ بتاؤں گا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہولی فادر نے زمین پر انسان کو کس لیے بھیجا کیا کیا نعمتیں............"

"شکریہ فادر!" اس نے پلٹے بغیر کہا "پھر کسی وقت سہی۔ اس وقت تو میں بہ مصروف ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ مصروفیت کا دور ہے۔"

اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ فادر کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی ہے اور چہرے مایوسی کا تاثر ابھر آیا ہے۔ وہ چرچ سے نکل آیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب می گیا۔ اس نے نرمی سے اس اخبار کو چھوا' جس میں جینا میلکم کا انٹرویو چھپا تھا۔

وہ بڈھی جینا کے بارے میں سوچ رہا تھا' جسے خدا نے طویل عمر دی تھی مگر وہ ہمیش زندہ رہنے کے چکر میں تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی' پرانے زمانے میں اولاد آدم آٹھ آٹھ سو' نو نو سو سال تک جیتی رہی تھی۔ وہ منطقی انداز میں سوچ رہا تھا کہ اس زمانے میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا؟ کم از کم اسے ناممکن تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طویل العمری کا کوئی سبب' کوئی راز تو ہوگا اور فادر نے کہا تھا' برادر' بائبل پڑھو۔ بائبل میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ یتیم خانے کے مولوی نعمت علی نے بھی یہی کہا تھا کہ کائنات اور زندگی کے بارے میں ہر سوال کا جواب قرآن حکیم میں موجود ہے۔ صرف کہا ہی نہیں تھا' انہوں نے ثابت بھی کیا تھا اور اس دن سے اس بات پر اس کا پختہ ایمان تھا۔ اس کا مطلب ہے' قرآن حکیم میں بھی اس بات کا جواب ہوگا بشرطیکہ یہ حقیقت ہو۔ مولوی صاحب کہتے تھے' پرانی آسمانی کتابوں میں جو کچھ ہے' وہ قرآن حکیم میں بھی ہے اور قرآن حکیم میں جو کچھ ہے' وہ ضروری نہیں کہ پچھلی کتابوں میں موجود ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن حکیم' پیغمبر آخرالزماںؐ پر اترا تھا۔ قرآن حکیم انسان کے لیے خدا کا آخری ہدایت نامہ تھا اور آنحضرت ﷺ ہادئ آخر۔ وہ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کا فلسفۂ زندگی عجیب تھا۔ وہ قانونِ ضرورت کا قائل تھا۔ ضرورت کے وقت جوزف ڈیوڈسن بننے میں اسے کوئی عار نہیں لیکن اندر سے وہ یوسف تھا' مسلمان۔ ماں کی آخری بات اسے یاد تھی۔ اسے یوسف ہی رہنا تھا.......... مسلمان یوسف۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ جس چکر میں تھا' وہ کاروباری تھا۔ اخلاقی نکتۂ نظر سے وہ جائز اور درست نہیں تھا اور ایسے کسی کام میں قرآن حکیم سے مدد لینا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اچھا مسلمان نہیں تھا تو اتنا برا مسلمان بھی نہیں تھا۔

فادر نے کہا تھا' بائبل پڑھو' بائبل میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ بائبل پڑھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اپنا الو سیدھا کرتا ہے تو اس میں بائبل ہی کی مدد بہتر رہے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سوال کا جواب بائبل ہی سے حاصل کرے گا۔ وہ سیلزمین تھا اور سیلز مین قرآن پاک کبھی فروخت نہیں کرتے۔ اس کتابِ مقدس کی تو قیمت بھی نہیں لی جاتی۔ ہدیہ کہتے ہیں اسے جب کہ بائبل فروخت ہوتی ہے۔

اب ایک دشواری تھی کہ بائبل کہاں سے حاصل کی جائے؟ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی تھی۔ وہ بہت سے لوگوں سے ملا تھا مگر اس نے کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا تھا۔ وہ انسانوں پر اعتبار کرنے کا قائل ہی نہیں تھا لیکن ضرورت کے وقت کسی دوست ہی سے تو مدد لی جا سکتی ہے۔ پہلے کبھی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کا اور اپنے طور پر جینے کا قائل رہا تھا۔ ایک وقت کھانا نہ ملا تو بھوکے رہ لیے۔ دوست بنا کر' اس سے ایک فائدہ حاصل کر کے' بہت سارے نقصانات سمیٹنا تو حماقت ہے۔

اب وہ بے چین تھا۔ دولت کی خوشبو نے اسے بھوکی بلی کی طرح مضطرب کر دیا تھا' مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بائبل کہاں سے حاصل کرے۔ اچانک اسے طبیب کا خیال آگیا۔ طبیب سے اس کا دوستی کا رشتہ نہیں تھا۔ البتہ وہ ملتے رہتے تھے۔ طبیب سے اس کی پہلی ملاقات چرچ میں ہوئی تھی۔ وعظ کے بعد وہ باہر آئے تو طبیب نے اسے چائے کی دعوت دی۔ دعوت وہ کسی بھی قسم کی ہو' مسترد نہیں کر سکتا تھا' لیکن نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ طبیب وہ نہیں' جو اسے نظر آتا ہے۔ چائے پینے کے دوران اس نے طبیب کا نام سن کر اس سے پوچھا "تم عیسائی تو نہیں معلوم ہوتے؟"

"میں عیسائی نہیں ہوں' پیدائشی طور پر مسلمان ہوں" طیب نے بے حد سکون سے جواب دیا۔ پھر اچانک پوچھا "اب شاید تم مجھے مارو گے۔ مجھ سے لڑو گے۔"

"میں ایسا کیوں کرنے لگا؟" اس نے حیرت سے کہا "بھلا چائے پلانے والے کو مارا جا سکتا ہے؟"

"اس بات پر کہ میں مسلمان ہوں اور تمہارے چرچ میں آیا ہوں۔"

"چرچ میرا نہیں۔ مجھے کیا" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ کچھ اپنے ہی قبیل کے معلوم ہوتے ہو۔"

"تمہارا قبیل! یہ کیا بلا ہے؟"

"سوچنے والے لوگوں سے مراد ہے میری۔ میں دراصل سوالات کا آدمی ہوں۔ مذہب کے حوالے سے خود کو اور کائنات کو سمجھنا میرا مقصد ہے۔ شروع ہی سے میرا رجحان مذہب کی طرف رہا ہے۔ میں مدرسے بہت شوق سے جاتا تھا۔ بہت چھوٹا تھا' تبھی سے میرے ذہن میں عجیب و غریب سوالات ابھرتے ہیں۔ میں مولوی صاحب سے وہ سوال پوچھتا تو پہلے وہ پیار سے مجھے خاموش کرا دیتے۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ اور اس کی بعد بید بازی کی نوبت آئی لیکن سوالات بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب ایک کا بھی نہیں ملا تھا۔ یوں میری تشنگی بڑھتی گئی۔ میں سب کچھ جاننا.......... سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ بڑا ہوا تو میں نے اس سلسلے میں بڑے علماء سے بات کی لیکن جواب ایک ہی ملتا تھا کہ زیادہ تجسس نہ کرو' گمراہ ہو جاؤ گے۔ میں سوچتا کہ اب بھی تو یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میں گمراہ نہیں ہوں۔ چنانچہ جیسے جیسے مجھے ٹرخایا گیا' ویسے ویسے طلبِ علم بڑھتی گئی۔ مجھے باغی اور مرتد قرار دیا گیا' کئی بار زبردست قسم کی مرمت بھی ہوئی۔ اب میں اپنے طور پر تمام اہم مذاہب کو سمجھتا ہوں اور ان کا موازنہ کرتا ہوں۔ مقصد تلاشِ حق ہے۔ ان دنوں عیسائیت کا مطالعہ کر رہا ہوں.........."

"اور کس نتیجے پر پہنچے ہو؟"

"یہاں بھی وہی صورتِ حال ہے۔ اعتراض سننا کسی کو گوارا نہیں۔"

"یہ بات غلط ہے کہ میں تمہارے قبیل کا ہوں۔" اس نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ مجھے کوئی جستجو نہیں۔ میرے نزدیک پیٹ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں صرف زندگی کو سمجھنا.......... بلکہ سمجھنا نہیں' گزارنا چاہتا ہوں۔ ضروریاتِ زندگی کا

صول میرے نزدیک اہم ترین ہے۔ خالی پیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ میں پہلی بار سف سے جوزف بنا تو پیٹ ہی کی وجہ سے بنا۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں نے پہلی بار یک پیس اور ملائی اس روز کھائی' جب میری ماں مری۔ اس کے بعد برسوں' ہر روز' ہر بح ناشتے کے وقت میں یہ سوچتا رہا کہ انسان زندگی میں صرف ایک بار کیوں مرتا ہے۔ ماں ہر روز مرتی تو مجھے شاندار ناشتا اور کھانا ملتا لیکن وہ تو ایک بار مر گئی اور بس.........."

طیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن یہ بات میرے تجربے میں ہیں۔"

"تجربات تو بہت محدود ہوتے ہیں۔ تم ہر چیز کا تجربہ تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حقائق جاننے کے لیے دوسروں کے تجربات بھی جمع کرنے پڑتے ہیں۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے" طیب نے کہا۔ پھر چونک کر پوچھا۔ "یہ یوسف سے وزف بننے کا کیا قصہ ہے؟"

وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کو وہ سب کچھ سنایا۔ طیب خاموشی سے سنتا رہا۔

"تم تو بہت خطرناک آدمی ہو" آخر کار طیب نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ میرا دل محرومیوں اور دکھوں پر کڑھتا ہے' جو ہر طرف بکھرے وئے ہیں لیکن ساری دنیا میں اولیت مجھے حاصل ہے۔ جب میں محروم اور دکھی نہیں رہوں گا' تب میں دوسروں کی محرومیوں اور دکھوں پر کڑھوں گا لیکن پہلے خود سے فراغت پالوں۔ میں نے زندگی کا سب سے حقیقی اور مکروہ روپ دیکھا ہے۔ یقین کرو میں کسی نسان کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے غریبوں کو قناعت کی نیند میں مدہوش اور بے عمل یکھا ہے۔ اندر کہیں گہرائی میں' بہت گہرائی میں شاید میں مذہبی ہوں' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کے ذریعے دولت مندوں نے غریبوں کو ایکسپلائٹ کیا ہے' ان کا استحصال کیا ہے اور اس کے باوجود انہیں اپنا شکریہ ادا کرنے پر مجبور کیا ہے.......... واعظوں کے ذریعے صبر اور قناعت کا درس دے کر۔ حالانکہ بقا جدوجہد کی متقاضی ہے۔ جس قسم کی جدوجہد ضروری ہو' انسان کو کرنی چاہئے۔ ایک لاکھ مزدور ایک محل تعمیر کرتے ہیں تو کیا وہ اسے مسمار نہیں کر سکتے؟ سو دوست! میرا پہلا مذہب اپنی بقاء ہے۔ اس کے بعد میں کسی مذہب پر غور کروں گا.........."

"باپ رے باپ! تم ترقی پسند ہو" طیب بری طرح دہل گیا تھا۔

"میں نعرہ نہیں لگا رہا ہوں' حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ترقی پسند ہوں کیونکہ

آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ اصطلاحی معنوں میں نہیں۔ کیونکہ میں کسی غریب آدمی کی مجبوری کو ایکسپلائٹ نہیں کر رہا ہوں۔ میں بنیادی طور پر حقیقت پسند ہوں۔"

"میرا مطلب تھا' تمہارے نظریات سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں والے ہیں" طیب نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ میں ہیومنسٹ ہوں" اس نے بڑی سادگی سے کہا "تم ہی بتاؤ' مذہب بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے؟ سردی کے موسم میں ننگے آدمی کو گرم کپڑے فراہم کر سکتا ہے؟ بے گھر کے لیے خیمے کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے؟"

"دیکھو.........."

"نہیں۔ نظریاتی بات مت کرنا۔ اس دنیا کے سنگین حقائق کو دیکھو اور عملی بات کرو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اس کے بعد بھی وہ کئی بار ملے۔ وہ طیب کے گھر بھی گیا۔ وہاں کتابوں کا انبار تھا۔ ہر مذہب پر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ ان میں بائبل بھی تھی۔

وہ طیب کے گھر کی طرف چل دیا۔ دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ وہ گھر پر موجود ہو۔ اس روز خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ طیب گھر پر ہی مل گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا "چائے پلواؤں تمہیں؟"

"ضرور۔ اگر ساتھ میں بسکٹ بھی ہوں تو سبحان اللہ۔"

طیب ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ واپس آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا "اب کہو' کیسے آئے ہو؟ تم بلاوجہ تو آنے سے رہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو" اس نے طویل سانس لے کر کہا "مجھے تم سے ایک چیز لینی ہے۔"

"کہو کہو۔ یہ گھر بھی حاضر ہے تمہارے لیے۔"

"مجھے بائبل درکار ہے۔"

"بائبل! وہ کس لیے؟"

"ایک سودا پٹانا ہے بائبل کی مدد سے۔"

"طیب حیران ہو گیا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ تو بزنس سیکرٹ ہے۔ اگر میرا آئیڈیا تم لے اڑے تو میں مارا جاؤں گا۔"

طیب نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا "تم جانتے ہو' میں ریاکار اور دغا باز نہیں ہوں۔"

"جانتا ہوں۔ اسی لیے تم سے ڈر لگتا ہے۔ ایسے لوگ جب بھی کچھ کرتے ہیں' اچانک اور خلاف توقع کرتے ہیں۔"

"اور میں عملی آدمی بھی نہیں ہوں۔"

"ارے' میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ابھی بتاتا ہوں" اس نے ہنستے ہوئے کہا "بائبل تو تم نے گھول کر پڑھی ہو گی؟"

"ہاں۔ تم جانتے ہی ہو" طیب نے جھینپ کر کہا۔

"اس میں کہیں طویل العمری کا تذکرہ بھی ہے؟"

"ہاں اور ہر آسمانی صحیفے میں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ابتدائی انسانی دور میں عمریں بے حد طویل ہوتی تھیں۔"

"بس.......... میں اسی حوالے سے ایک بہت مہنگی چیز بیچنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہ مہنگی چیز کیا ہے؟"

"ابدی زندگی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"مجھ جیسا سیلز مین ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔"

اتنی دیر میں طیب کا چھوٹا بھائی چائے اور بسکٹ لے آیا تھا چنانچہ گفتگو موقوف ہو گئی۔ چائے کی پیالی خالی اور بسکٹ کی پلیٹ صاف کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور طویل کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑ دیا "مجھے اس سلسلے میں تفصیل سے بتاؤ؟" اس نے طیب سے کہا۔

"خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا پھر ان کی پسلی سے بی بی حوا وجود میں آئیں۔ اس کے بعد دانۂ گندم کا چکر چلا۔ حضرت آدم اور حوا جنت سے بے دخل ہوئے اور زمین پر آبسے۔ تب روئے زمین پر پہلی بار خون بہا۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ اس کے بعد طویل العمری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اوسط عمر آٹھ سو اور نو سو سال قرار پائی' پھر زمین پر انسان کی شوریدہ سری حد سے بڑھ گئی اور خدا کا قہر نازل ہوا۔ طوفان آیا اور سفینۂ نوح علیہ السلام کے سوا کرۂ ارض پر کچھ بھی نہیں بچا۔ تب سام اور حام کے دم سے دنیا پھر آباد ہوئی جب سے اب تک انسان بارہا بھٹکا' اس پر عذاب نازل ہوئے لیکن خدا تعالیٰ نے نسل انسانی کو ختم نہیں ہونے دیا۔ بعد کے انبیاء میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

۱۴۷ سال اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ۱۱۰ سال عمر پائی..........."

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے بائبل دے دو۔"

"یہ لو۔ کہو تو کلام پاک کا ایک نسخہ بھی دے دوں؟"

"نہیں' وہ تو میرے گھر میں موجود ہے۔"

"حیرت ہے! تم نے اس سے مدد کیوں نہیں لی؟ اس میں تو سب کچھ موجود ہے۔"

"دیکھو دوست!" اس نے سرد لہجے میں طیب کی بات کاٹ دی' "میں اچھا ہوں یا برا........... بنیادی طور پر یوسف ہوں' جوزف نہیں۔ میں کلام پاک پڑھتا نہیں ہوں تو اسے بیچوں گا بھی نہیں۔ میں کوئی عالم نہیں کہ مذہب کا کاروبار کروں۔"

"اور بائبل بیچ سکتے ہو تم؟" طیب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھا اور اس نے طیب کی طرف ہاتھ بڑھایا "شکریہ طیب' اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

اپنے ڈربے میں پہنچ کر اس نے بائبل کھولی۔ اسے ایسا لگا کہ ایک بیش بہا خزانے کی چابی اس کے ہاتھ آ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خواب تھے اور ذہن مکڑی کی طرح اس منصوبے کا جالا بن رہا تھا' جس کے ذریعے اسے ملک کی دولت مند ترین ہستی سے دولت گھسیٹنی تھی۔ اس کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ اچھا خوبصورت سا گھر' محبت کرنے والی بیوی' پیارے پیارے بچے' جنہیں ضروریات زندگی کے لیے اپنا نام بدلنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔ سبھی کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ منصوبے کی کامیابی کے بعد ہر چیز مل سکتی تھی۔

لیکن بائبل پڑھ کر بھی خواب خواب ہی رہا۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ بات بن سکتی ہے مگر کیسے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ قسمت مہربان ہوتی ہے تو سب کچھ خود بخود ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس رات وہ ہوٹل میں کھانا کھانے گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ چائے پیتے ہوئے اپنے منصوبے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک برابر والی میز سے بلند اور برہم آوازیں سنائی دیں۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ غیر ملکی تھے اور عربی بول رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ فلسطینی تھے۔ مولوی نعمت علی کی مہربانی سے اسے عربی زبان اچھی خاصی آتی تھی۔

سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے اس خوب رو لڑکے کو دیکھتے ہی اسے احساس ہو

لیا کہ اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی ہے۔ لڑکے کی آنکھیں عجیب اور جان دار تھیں۔ ن میں دبی دبی آگ بھی تھی' لامحدود اداسی اور دکھ بھی اور صدیوں کے تجربات کے نتیجے ں ابھرنے والی گہرائی بھی۔ وہ سطحی طور پر دیکھنے میں نوجوان اور گہری نظر سے دیکھنے میں ختہ اور جہاں دیدہ لگتا تھا۔ پتلی ستواں ناک' پتلے ترشے ہوئے ہونٹ اور مضبوط جبڑا' جو ے فائٹر ثابت کرتا تھا' اس کے انداز میں وقار اور خود اعتمادی تھی۔ اس کے علاوہ بھی س کی شخصیت میں کوئی چیز تھی' جسے وہ پہلے تو سمجھ نہ سکا........... اور جب سمجھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے سینے میں فتح مندی کا احساس ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس کے اعصاب ھنچاؤ کا شکار ہو گئے۔ وہ یہ تمام علامتیں پہچانتا تھا۔ قسمت جب بھی اس پر مہربان ہوتی تھی' اس کا یہی حال ہو جاتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ لڑکا اس کے اور اس کے منصوبے کے لیے بے حد اہم ہے۔

اس نے لڑکے کی عمر کے بارے میں قیاس کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر وہ اکیس بائیس سال کا لگتا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشوں اور آنکھوں کے تاثر کو دیکھا اور برسوں کے پیمانے میں رکھا جائے تو وہ پچاس کا........... ممکن ہے پچھتر کا اور ممکن ہے' سو سال کا ثابت ہو۔ اس کی جلد کی ساخت اور پلکوں کا تاثر عجیب تھا' جیسے وہ وقت اور عمر کی حدوں سے بے نیاز ہو۔ اس کی عمر کا درست تعین کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ تاریخ کے صفحات سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ لڑکا ہزاروں نسلوں کے بیچ ایک لمحاتی وقفہ ہے۔ وہ سب کچھ تھا........... آل ان ون! نوجوان' مرد اور بزرگ۔ وہ وقت کی طرح تھا' جسے نہ سمجھا جا سکتا ہے' نہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

یوسف کے لیے وہ حکم کے اس اِکّے کی طرح تھا' جس کے ملنے کے بعد اس کے پاس ناقابلِ شکست ٹریل ہو جائے گی۔ اس کے دماغ میں کوئی پہیا بہت تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ اس اِکّے کو کیسے حاصل کیا جائے؟ لیکن قسمت جب ساتھ دینے پر تل جائے تو عجیب و غریب حالات پیش آتے ہیں۔

لڑکا اپنے ساتھیوں سے جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ اس کی سمجھ میں واضح طور پر آ رہا تھا لیکن ناقابلِ یقین بھی تھا "یہودیوں سے دشمنی اپنی جگہ لیکن ہمیں انٔ کی کامیابی اور فتوحات کا تجزیہ کرنا چاہیئے" لڑکا کہہ رہا تھا' "ہمیں ان کی خوبیوں کو سمجھنا چاہیئے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور اپنی خامیوں کو بھی سمجھنا چاہیئے تاکہ انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے..........."

یوسف نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ ان کے تیور بہت خراب تھے۔ آنکھو سے خوں خواری جھلک رہی تھی۔ گردوپیش کے دوسرے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ گئے تھے مگر گفتگو کیونکہ عربی میں ہو رہی تھی' اس لیے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"تو تمہارے خیال میں یہودیوں میں خوبیاں بھی ہیں؟" لڑکے کے ساتھیوں می سے ایک نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"اور ہم میں کوتاہیاں اور خامیاں ہیں؟" دوسرا بولا۔

"اور ہمیں ان ملعون یہودیوں کی تقلید کرنی چاہیے؟" تیسرے نے زہریلے ل میں دریافت کیا۔

"تم تینوں ہی ٹھیک سمجھے ہو" لڑکے نے بے حد سکون سے کہا' "میں یہی کہہ ر ہوں۔"

"وہ خدا کی درگاہ سے دھتکارے ہوئے کتے ہیں' جنہیں صدیوں سے کوئی ٹھکا میسر نہیں..........."

"ایسی بات نہیں۔ اب تو ان کے پاس وطن ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ انہیں اللہ کی مرضی کے بغیر یہ سب کچھ ملا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ بے وطن ہم ہیں۔ مت بھولو کہ وہ خدا کی سب سے پسندیدہ قوم تھے۔ اپنی حرکتوں کی وجہ سے وہ خدا کے معتوب ٹھہرے۔ اب اگر ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں تو کیا ہمیں خوف نہیں آتا؟ دنیا کی سرداری ان راندۂ درگاہ لوگوں سے چھین کر ہمیں ودیعت کی گئی تھی مگر اب ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے اعمال سے خدا کو ناراض نہیں کر رہے ہیں؟ ہم میں نہ تدبر رہا' نہ دلیری۔ نہ ہم راست گو رہے اور نہ ہی سچائی پر ڈٹ جانے کی خو ہم میں باقی رہی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں خود کو تقسیم کر دیا' کمزور کر لیا۔ ہم جذبۂ جہاد سے محروم ہو گئے۔ ہم میں شہادت کی لگن بھی نہیں رہی اور ہم رسول اکرم ﷺ کی پیروی کا درس بھی بھول گئے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کس قدر ذلیل و خوار ہیں ہم..........."

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہودی..........." لڑکے کے ایک ساتھی نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے دوسرے دونوں ساتھیوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"یہودی بے وطن تھے مگر وطن کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ وہ فلسطین پر غاصبانہ طریقے سے چھائے لیکن یہ دیکھو کہ انہوں نے اپنے لیے وطن کیسے تعمیر کیا' انہوں نے محنت کیسے کی؟ دنیا بھر کے یہودی اپنی اپنی جگہ' اپنی اپنی بہترین پوزیشن چھوڑ کر وطن کے

خادم کی حیثیت سے اسرائیل پہنچے اور انہوں نے ملک کے خادم کی حیثیت سے کام کیا۔ انہوں نے وطن کی خاطر کوئی بھی کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ انہوں نے.......... صحرا کو محنت سے نخلستان بنایا' بنجر زمین کو سونا اگلنے پر مجبور کیا' عمارتیں تعمیر کیں اور کم تعداد میں ہونے کے باوجود ہم عربوں کے..........."

"ان کی پشت پر امریکا..........."

"شکست اور نااہلی کے لیے جواز گھڑا جائے' حیلے تراشے جائیں تو قسمت پر مہر لگ جاتی ہے۔ کسی طاقت کی پشت پناہی سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں حقیقت قبول کر لینی چاہیے اور اپنے قومی و دینی جذبے کو زندہ کرنا چاہیے۔ امریکا کا ویت نام میں حشر دیکھو۔ کیوں' امریکا وہاں ذلیل کیوں ہوا؟ اس لیے کہ وہاں کے لوگوں میں جذبۂ حریت توانا تھا۔ جنگیں اسلحے کے زور پر' تعداد کے زور پر نہیں جیتی جاتیں۔ اسلامی تاریخ سے بڑی گواہی اس سلسلے میں کہیں نہیں ملے گی۔ اور اب کیا ہے' ایسا لگتا ہے' جیسے تاریخ الٹ گئی ہے۔ وجہ؟ ہمارے پاس بے عملی اور زبانی باتوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے اسلاف کے لیے بھی باعثِ ننگ ہیں..........."

یوسف مسحور سا سنتا رہا۔ اسے لڑکے کی جرات پر حیرت تھی۔ لڑکا سچ کہہ رہا تھا' آئینہ دکھا رہا تھا لیکن اس دور میں آئینہ کون دیکھتا ہے؟ آئینہ تو توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سوچ میں گم ہو گیا۔ اب وہ کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر کرسی گرنے کی آواز سن کر اس نے چونک کر دیکھا۔

لڑکے کے ساتھیوں میں سے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے۔ وہ خوں خوار نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا' جو اپنی جگہ بڑی بے نیازی سے بیٹھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

یوسف تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ لڑکا اس کے لیے بے حد اہم تھا۔ بلینک چیک تھا وہ۔ اسی پر اس کے منصوبے کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ لڑکے کی جرات مندی اور بے لاگ تجزیے نے اسے سنگین اور یقینی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ لڑکے کے تینوں فلسطینی ساتھیوں کے تیور بے حد خطرناک تھے۔ یوسف کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اسے صرف لڑکے کے تینوں ساتھیوں کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ وہ اپنے وطنوں کا مزاج بھی جانتا تھا۔ اگر ہوٹل میں موجود ور لوگوں کو بھی پتا چل جاتا کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے تو لڑکے کی تکا بوٹی ہو جاتی۔ جو قوم عمر

کے اعتبار سے بچپن ہی کے عہد میں ہو اور جذباتی بھی ہو' وہ ایسے سنگین حقائق برداشت کرتی ہے۔

لڑکے کی عافیت یقینی طور پر خطرے میں تھی اور اسے بچانا یوسف کے لیے ؛ ضروری تھا۔

جو فلسطینی لڑکا اٹھ کھڑا ہوا تھا' اس نے دانت پیس کر کہا' "اپنے الفاظ واپ معافی مانگو۔"

لڑکا بدستور بیٹھا رہا۔ اس کے انداز سے بے پروائی مترشح تھی' "میں بہت سمجھ کر بولتا ہوں۔ مجھے الفاظ واپس لینے کی ضرورت کبھی نہیں پڑی" اس کے لہج ٹھہراؤ تھا۔

دوسرے دونوں لڑکے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے ک پھر بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا "تم.......... تم یہودی ہو" ان میں سے ایک نے ایک لفظ پر زور دے کر کہا "اگر نہیں ہو تو تمہیں معافی مانگنی چاہیے۔"

"میں جو بھی ہوں' یہ میرا پیغام ہے' سب مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص بھائیوں کے لیے۔" لڑکے نے بے حد پرسکون لہجے میں جواب دیا "اور تم کچھ بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں الفاظ واپس نہیں لوں گا۔"

"تب تم یقیناً یہودی ہو" دوسرے لڑکے نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اچھا" لڑکے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا' "ٹھیک ہے۔ یہودی ہوں۔ پھر؟"

یوسف اضطراری طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب جھگڑا ہو گا اور ا اس جھگڑے میں حصہ لینا تھا۔ اس لڑکے.......... حکم کے اِکے کے تحفظ کے لیے۔ ! بھی ہاتھ پیر کھولے بہت دن ہو گئے تھے۔ یہ موقع اس کو قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے سے کیونکر متعارف ہوا جائے.......... اسے کیسے پٹایا جا۔ کیونکہ وہ اسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ملے گا۔ اب لڑائی ہ اور وہ اس لڑکے کا ساتھ دے گا۔ لڑکا اس کا شکر گزار ہو گا اور شکر گزاری کے طور پر کو استعمال کرنے دے گا اور اس کے بعد دولت ہی دولت' خوش حالی..........

مگر پہلے اس سنگین مرحلے سے گزرنا تھا۔ اس نے لڑکے کو نگاہوں ہی نگاہوں تولا۔ وہ دبلا پتلا مگر جان دار تھا۔ آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ پھرتیلا بھی یقیناً ہو گا۔ پھرا

نے لڑکے کے تینوں ساتھی حریفوں کا جائزہ لیا۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس نے لڑکے کا ساتھ دیا تو لڑکے کا پلہ یقیناً بھاری ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا لیکن وہ پوری طرح چوکس تھا.......... ایک لمحے کے نوٹس پر ایکشن میں آنے کے لیے تیار۔

"تُو یہودی ہے تو ہم تجھے اس خرافات کا مزہ بھی چکھائیں گے" ایک لڑکے نے گھوم کر بدستور بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

یوسف مطمئن تھا کہ صورتِ حال پوری طرح قابو میں ہے۔ لڑکا اب بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں اب بھی بلا کا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔

پھر اچانک جو کچھ ہوا' وہ یوسف کے لیے غیر متوقع تھا۔ دوسرے دونوں لڑکوں نے چیخ کر ہوٹل میں موجود دوسرے لوگوں سے' لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ یہودی ہے' یہودی جاسوس" جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔

یوسف کو ایک ثانئے میں اندازہ ہو گیا کہ صورت حال اچانک ہی خطرناک ہو گئی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کے مقابلے میں لڑکے کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ لڑکا اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اسے بچانا بہت ضروری تھا۔

تینوں فلسطینی لڑکے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہوٹل میں موجود تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے تیور بے حد خراب تھے۔ یوسف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال پر کیسے قابو پائے۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا..........

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہوٹل میں موجود لوگوں کے تیور بہت خراب تھے۔ دوسری طرف فلسطینی یہودی، وہ جو کوئی بھی تھا' اس کے ساتھی اس کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن لڑکا بڑ سکون اور بے پروائی سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر یوسف نے اسے اٹھتے دیکھا۔

یوسف کی ذہانت ہمیشہ مشکل ترین صورت حال میں حیرت انگیز حد تک تیز دکھاتی تھی۔ اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے ہوئے ہوٹل مالک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یوسف جانتا تھا کہ اب اس کے ہم وطن تیز سے حرکت میں آئیں گے۔ انہیں بھڑکانے کے لیے صرف لفظ یہودی بہت کافی تھا۔ ا سب سے پہلے ان لوگوں کو روکنا تھا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا "جلد بازی مت کرو۔ میں ع سمجھتا ہوں" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

وہ سب ٹھٹک سے گئے لیکن ان کے تیور اب بھی خوف ناک تھے۔

"یہ لڑکا یہودی نہیں، فلسطینی ہے" اس نے اپنے حکم کے اِکے کی طرف اشار کیا۔

دوسری طرف لڑکا متحرک ہو چکا تھا.........اور اس کی توقعات پر پورا بھی اترا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی اس کے متعلق درست اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ وہ اپنی عدد برتری کے نشے میں دھت تھے' اسی لیے انہوں ایک ساتھ جھپٹنے کی حماقت کی۔ لڑکے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ ایکشن کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پتا کچھ بھی نہیں چلا بس اتنا نظر آیا کہ تین میں سے دو حملہ آور زمین چاٹ رہے ہیں۔

یوسف نے اشارہ کرنے کے دوران یہ سب کچھ دیکھا اور مطمئن ہو کر ان لوگوں کی طرف مڑا' جنہیں قابو میں رکھنا تھا "یہ تینوں لڑکے محض اسے پٹوانے کے لیے اسے یہودی قرار دے رہے ہیں۔ میں نے عربی میں ان کی پوری گفتگو سنی تھی" اس نے مزید

کہا۔

لوگوں کے تاثرات بدل گئے' چہروں سے کھنچاؤ رخصت ہو گیا۔ ان میں سے ایک برا سا منہ بنا کر نہایت بدمزگی سے بولا "یہی تو مصیبت ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ تب ہی تو ساری دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں ہم۔"

"اپنے ملک کو ہی دیکھ لو۔ جو شخص سیاسی طور پر خطرہ بنتا محسوس ہو' اسے فوراً غدار قرار دے دیا جاتا ہے" دوسرے نے کہا۔

"اور عوام کا یہ حال ہے کہ بغیر سوچے سمجھے' بغیر کسی ثبوت کے اس بے چارے کی پیشانی پر غداری کا ٹھپا لگا دیتے ہیں" تیسرے نے لقمہ دیا۔

یوسف بالکل مطمئن ہو گیا کیونکہ ان میں سے کوئی آگے نہیں بڑھا تھا اور نہ ہی آگے بڑھنے کے موڈ میں تھا چنانچہ وہ میدانِ جنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ لگتا تھا' اس دوران لڑکا' تیسرے حریف کے بھی ہاتھ جڑ چکا تھا۔ پہلے چوٹ کھانے والے دونوں ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن اب وہ قدرے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"یہ......... یہ یہودی ہے' غدار یہودی" ان میں سے ایک نے لوگوں سے اپیل کی۔

یوسف نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ صورتِ حال قابو میں تھی۔ ہوٹل میں موجود بیشتر لوگوں کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ کسی کا اس لڑائی میں مداخلت کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ لڑکے کی طرف بڑھ گیا' جو اُن تینوں کی مرمت کرنے کے بجائے اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا' جیسے ان کی پیش قدمی کا منتظر ہو۔ اس کا انداز بہرحال جارحانہ تھا۔ تینوں لڑکے' لوگوں کا منفی ردِعمل دیکھ کر مایوس ہوئے تھے۔ وہ اب بھی جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔ یوسف اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ لڑائی ان تینوں نے شروع کی تھی اور اب پیچھے ہٹنا ان کے وقار کے منافی تھا لیکن یوسف بھی جانتا تھا اور وہ تینوں بھی کہ لڑکا تنہا ہی ان تینوں کے لیے کافی ہے۔

یوسف کے لیے وہ صورت حال پسندیدہ ترین اور مثالی تھی' بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہیرو بننے کا موقع قسمت ہی سے ملتا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکے کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور سخت لہجے میں ان تینوں سے مخاطب ہوا "اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔ ورنہ تم تینوں کی درگت بنا دوں گا میں۔ تم نے خواہ مخواہ ایک مسلمان کو یہودی قرار دے کر پٹوانے کی ذلیل کوشش کی ہے۔"

ان تینوں نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ کہے بغیر خاموشی سے اپنی جگہ گئے۔

یوسف نے لڑکے کا ہاتھ تھاما "آؤ میرے ساتھ" اس نے کہا اور کاؤنٹر پر بل ادا کے باہر نکل آیا۔ لڑکا بدستور اس کے ساتھ تھا۔ یوسف نے پلٹ کر دیکھا۔ ہوٹل سے ک بھی ان کے پیچھے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پہلے مرحلے میں کامیا ہو چکا تھا۔ اس نے لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھا اور خوف زدہ ہو گیا۔ لڑکا بے حد خطرنا تھا۔ وہ قتل تک کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ہو جاتا تھا۔ اس لڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ لڑاکا ہے۔

"اب یہاں سے کھسک لو" اس نے لڑکے سے کہا۔

"جلدی کیا ہے؟ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں" لڑکے نے کہا اور پلٹ کر ہوٹ کے دروازے سے اندر دیکھا۔ اس کی نظریں یقیناً ان تینوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جن کچھ دیر پہلے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں سے نفرت اور برہمی جھلک رہی تھ

"مجھے بزدلی سے بھی نفرت ہے اور بزدلوں سے بھی۔ بہادری یہیں تک محدود نہیں کسی سے لڑ لئے اور خون خرابا کر لیا۔ سچ سننے سے ڈرنا اور اسے قبول نہ کرنا میر نزدیک بدترین بزدلی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ مت بھولو کہ تم اس وقت ایک جذباتی قوم درمیان ہو۔ ہم لوگوں کے جذبات ذرا سی دیر میں برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور اس بعد ہم عقل کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں" اس بار لڑکا مسکرایا۔ "ابھی چند لمحے پہلے میں سمجھا تھا کہ میر چیتھڑے اڑ جائیں گے لیکن ایک بات بتاؤں' ہم عرب لوگ تم سے زیادہ جذباتی اور جوشیلے ہیں۔ اسی لئے تو ہمارا برا حال ہے۔"

"رہتے کہاں ہو تم؟"

"وائی ایم سی اے میں۔"

"اب تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں؟"

"وہ کسی نہ کسی طور تمہارے پیچھے پڑیں گے' یہ بات تم جانتے ہو۔ ان کی بہت سے لوگوں کے سامنے بے عزتی ہوئی ہے۔ وہ بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔"

"کرنے دو" لڑکے نے کندھے جھٹک کر کہا "میں نے کہا نا' میں کسی سے ڈرتا نہیں وں۔"

"اور میں خودکشی کو سب سے بڑی بزدلی سمجھتا ہوں۔"

لڑکے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "بہت خوب! تمہارے نزدیک یہ خودکشی ہو گی۔ بہت ب! مگر میں کہیں اور جا بھی تو نہیں سکتا۔"

"وائی ایم سی اے میں تمہارا سامان ہو گا؟" یوسف نے اس کی بات نظرانداز کر ے پوچھا۔ پھر اچانک بولا۔ "چلتے بھی رہو۔ یہاں رکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں' یہ طرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے' تمہارے ساتھی لوگوں کو پھر بھڑکا دیں۔"

"میں بے گھری میں زیادہ سامان رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ وائی ایم سی اے میں یرا ایک بیگ ہے' جس میں دو جوڑے کپڑے ہیں" لڑکے نے کہا پھر بولا "تم بہت محتاط ادمی معلوم ہوتے ہو؟"

"میں نے زندگی گزاری ہے" اس نے سادگی سے کہا۔

لڑکے نے پھر قہقہہ لگایا۔ اب وہ دونوں آگے بڑھ رہے تھے۔

"تمہارے ساتھی ذرا سے اختلاف رائے پر تم سے اتنے برگشتہ ہو گئے؟"

"وہ میرے ساتھی تو نہیں تھے۔"

"تو پھر..........؟"

"خود ہی مل بیٹھے تھے" لڑکے نے بے پروائی سے جواب دیا' "مجھ سے پوچھا تھا کہ لیا میں فلسطینی ہوں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو بے تکلف ہو گئے۔ یہ ہم لوگوں کی طرت ہے.......... بچوں کی سی گرم جوشی اور ذرا سی دیر میں بے تکلف ہو جانا۔"

"تو تم فلسطینی ہو؟"

"کیوں؟ تمہیں شک ہے اس میں؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے جب ان لوگوں نے تمہیں یہودی کہا تھا تو میں نے تمہارے رے پر فخر کا تاثر دیکھا تھا۔ تم نے اکڑ کر کہا تھا.......... ہاں' تو پھر؟ وہ انداز بناوٹی نہیں قیقی تھا۔ میں تمہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔"

"مجھے تمہاری نظروں کا احساس تھا لیکن میرے یہودی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ فلسطینی تو میں اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں فلسطین میں ہودی نہیں رہتے' کیا کوئی یہودی فلسطینی نہیں ہو سکتا؟"

"اوہ.......... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا" اس نے معذرت خواہانہ لہجے م "ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"بین آئزک" لڑکے نے جواب دیا۔

وہ ہنس دیا "گویا تم خود کو پوری طرح یہودی ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"میں کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا اور نہ ثابت کر رہا ہوں۔ تم نے میرا نام پوچھا' نے تمہیں اپنا نام بتا دیا" لڑکے کے لہجے میں سادگی تھی۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر تم اپنا نام بن اسحاق بھی تو بتا سکتے تھے۔"

لڑکا حیران نظر آنے لگا لیکن یوسف نے بھانپ لیا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے " تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟" لڑکے نے کہا۔

"مطلب یہ ہے کہ میں اچھا خاصا مترجم ہوں۔"

"اوہ.......... میں نے تو اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔"

لڑکے نے شاید گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ یوسف زیرِ لب مسکرا دیا۔ کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس طرح گفتگو کا رخ نہیں بدل سکتا۔ اس نے تو ایک دلدل میں قدم رکھ دیا تھا۔ "کون سا نام بتاؤں؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" اس بار لڑکے کی حیرانی بناوٹی نہیں تھی۔

"اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔ یہ الگ با تمہاری مصلحت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم قانونِ ضرورت برعکس عمل کرتے ہو؟"

"کیا مطلب؟" لڑکے نے دہرایا۔

"تم ہر بات کا مطلب پوچھنے کے عادی معلوم ہوتے ہو؟"

"ایسی بات نہیں" لڑکے نے تیز لہجے میں جواب دیا "لیکن نہ میں معموں میں کرتا ہوں اور نہ ہی یہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی مجھ سے معموں میں گفتگو کرے۔"

"تم نے مجھ سے میرا نام پوچھا تھا نا؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ج ہے۔

"اور میں نے یہ کہا تھا کہ کون سا نام بتاؤں۔ بات یہ ہے کہ میں دو نام کا آ ہوں۔ صورت حال کے مطابق نام استعمال کرتا ہوں۔ کبھی ضرورت پڑی تو ممکن ہے

وئی تیسرا نام بھی اختیار کر لوں۔ اب تمہارے معاملے میں' میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ں۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔ لڑکا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا' "مجھے علم یں کہ تم بین آئزک ہو یا بن اسحاق" اس نے مزید کہا۔

"میں تمہیں اپنا نام بتا چکا ہوں" لڑکے کا لہجہ سرد تھا۔

"خیر" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میرا نام جوزف ڈیوڈسن ہے۔ باقی باتیں یرے فلیٹ میں ہی ہوں گی" اپنے ڈربے کو فلیٹ کہتے ہوئے اسے خفت سی ہوئی۔ فلیٹ لفظ وہ ان لوگوں کے سامنے استعمال کرتا تھا' جنہیں فلیٹ نہ دکھانا ہو' جبکہ یہاں معاملہ تلف تھا۔

"کیا ضروری ہے کہ میں تمہارے فلیٹ میں چلوں؟" لڑکے نے اعتراض کیا۔

"ہرگز ضروری نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے' ہمیں ایک دوسرے سے فائدہ پہنچ لکتا ہے" اس نے جواب دیا اور پھر اچانک ہی پوچھ بیٹھا "ڈر لگ رہا ہے تمہیں؟"

لڑکے کا چہرہ بے تاثر رہا۔ اس نے کہا "تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں ہے اور میں وں مشتعل بھی نہیں ہوتا۔ خیر' تمہارے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

وہ لڑکے کو لے کر ڈربے میں چلا آیا۔ ایک کمرے کے فلیٹ میں ایک چھوٹی سی لماری' ایک میز' ایک کرسی اور ایک پلنگ تھا۔ ایک طرف کچن تھا اور اس کے برابر ہی یں باتھ روم۔

"بیٹھو" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کالی چائے پی سکو گے یا دودھ لاؤں؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"دودھ کی ضرورت نہیں۔ شکریہ۔ ویسے تو میرے خیال میں چائے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال' تم چاہتے ہو تو.........." لڑکے نے کندھے جھٹک دیے۔

وہ کچن میں چلا آیا۔ پانچ منٹ بعد وہ کمرے میں آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں بغیر دودھ والی چائے کی دو پیالیاں تھیں۔ اس نے ایک پیالی لڑکے کی طرف بڑھا دی اور خود پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکے کو بڑی ہوشیاری سے ہینڈل کرنا ہوگا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ لڑکا اس کے کام آسکتا ہے۔ اس احساس کی اس کے علاوہ کوئی توجیہہ اس کے سامنے نہیں تھی کہ لڑکا بظاہر کم عمر نظر آرہا تھا جبکہ اسے یقین تھا کہ لڑکے کی عمر اتنی کم نہیں ہے۔

"وہ دونوں خاموشی سے تلخ چائے کا گھونٹ لیتے رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ

سوچ رہے تھے۔ پھر لڑکے نے بے حد رکھائی سے کہا "میرا خیال ہے اب ہمیں کام کی کر لینی چاہیے۔ تم مجھے وقت ضائع کرنے والے آدمی معلوم نہیں ہوتے مجھے یقین ہے میں تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہوں۔"

یوسف نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی اور گہری سانس لے کر "ضروری نہیں کہ یہ درست ہو مگر میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے آسکتے ہیں۔ اسی لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو" لڑکے نے بھی پیالی میز پر ا دی۔

"اس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا' پہلے ہمیں کھل کر گفتگو کرنی ہوگی۔ ایک دوسر کے بارے میں پوری طرح جاننا ہو گا۔"

"میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میرے نکتۂ نظر سے تو خطرناک ثابت ہو گا۔"

یوسف نے اس کی بات نظرانداز کر دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچ نکالی۔ پیکٹ کھول کر اس نے لڑکے کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے نفی میں سرہلا دیا۔ اس۔ ایک سگریٹ نکالی' اسے سلگایا اور چھت کی طرف دھواں چھوڑتا ہوا بولا "یہ یقین کر لو ک ہمارے اشتراک سے صرف مجھے ہی نہیں' تمہیں بھی فائدہ ہو گا۔"

"مجھے نہیں معلوم' تم کس قسم کے اشتراک کی بات کر رہے ہو" لڑکے نے سر لہجے میں کہا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور میں چاہ ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔"

"پہلے مجھے اس فائدے کی نوعیت کا علم ہونا چاہیے جو مجھے پہنچنے والا ہے" لڑکے کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

یوسف چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکے کو قائل کرنا آسان کام نہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں مگر زور دے کر کہا "فائدے کی نوعیت کا علم تو تمہیں فی الحال نہیں ہو سکتا۔ البتہ تم ان نقصانات کے بارے میں جان سکتے ہو جو مجھ سے عدم تعاون کی صورت میں تمہیں پہنچیں گے۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" لڑکے نے تیور بدل کر پوچھا۔

"نہیں میں دھمکی دینے کا قائل نہیں ہوں۔ البتہ میں نے زندگی گزاری ہے۔ یرے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں۔"

"اور میرے بارے میں کیا اندازہ ہے تمہارا؟"

یوسف چند لمحے سوچتا رہا۔ اسے اپنی چھٹی حس کے مطابق اندھیرے میں تیر چلانا تھا "تمہاری یہاں موجودگی غیر قانونی ہے" اس نے بے حد اچانک کہا اور کہنے کے دوران رکے کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ اسے لڑکے کے اعصاب کا قائل ہونا پڑا تھا۔ اس کے جلے کا ردعمل محض ایک ثانئے کے لیے لڑکے کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ چہرہ بدستور بے اثر رہا تھا۔ بہرحال اس کے لیے وہ ایک ثانئے کا ردعمل ہی بہت کافی تھا۔ کیونکہ اگر اس نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی تو وہ تاثر خوف کا تھا۔

"میں کوئی اعتراف نہیں کر رہا ہوں۔ فرض کر لو کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد کم تو نہیں' جو غیر قانونی طور پر اس ملک میں اخل ہوئے ہیں۔"

"فرق پڑتا ہے" اس نے زور دے کر کہا "وہ تمام لوگ حکام کی نظروں میں نہیں یں اور نہ ہی ان کے متعلق لوگ جانتے ہیں" اسے اندازہ تھا کہ اب وہ خطرناک مرحلے یں داخل ہو رہا ہے۔ لڑکا خطرناک تھا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ کام کا ثابت ہو مگر اس وقت اس کی اپنی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ جینا میلکم کے ہاتھوں ابدیت کا کوئی آئیڈیا' خواہ وہ کتنا ہی غیر حقیقی ہو' فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ آئیڈیا جینا میلکم جیسی گھاک کاروباری شخصیت کے لیے صرف قابل قبول ہی نہ ہو بلکہ اقابل مزاحمت اپیل رکھتا ہو۔ بائبل سے اسے کوئی مدد نہیں مل سکی تھی۔ کوئی اور ذریعہ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ایسے میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس اسکیم پر لعنت بھیج کر کچھ اور سوچتا لیکن اس کی فطرت میں ہٹ دھرمی بھی تھی چنانچہ اس اسکیم سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اب وہ لڑکا ہی فی الوقت اس سلسلے میں اس کی آخری امید تھا۔

"اور تمہارے متعلق میں جانتا ہوں..........." اس نے خاصے توقف کے بعد کہا "کہ تم یہاں کسی غیر قانونی ذریعے سے آئے ہو۔ تمہارا نام بین آئزک ہے اور تم یہودی ہو۔ کسی یہودی کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں۔"

"میں اس بات کی تردید کر سکتا ہوں" لڑکے نے بے حد سکون سے کہا۔

"یہودیوں کے معاملے میں یہاں تردید سے کام نہیں چلے گا۔ تشدد کی صورت میں

تم اپنا پورا شجرہ اگل دو گے۔ ہمارے ہاں شک کو بھی یقین کی سی اہمیت دی جاتی ہے۔" اس نے کہا۔

لڑکے کی آنکھوں میں خوف ناک چمک ابھری۔ اس کے عضلات میں تناؤ محسوس ہونے لگا۔

یوسف خوف زدہ ہو گیا لیکن جانتا تھا کہ یہ مرحلہ فیصلہ کن ہے۔ ذرا سی کمزوری دکھائی اور مارے گئے "کوئی ایسی ویسی بات نہ سوچنا" اس نے جلدی سے کہا "میں کوئی ترنوالہ نہیں ہوں اور یہ شہر کا گنجان آباد علاقہ ہے۔ یہاں تو کوئی اپنے طور پر آہ بھی نہیں بھر سکتا۔ کم از کم دونوں طرف کے پڑوسیوں کو علم ہو جاتا ہے کہ یہاں آہ بھری گئی ہے۔ کوئی احمقانہ حرکت کرو گے تو اپنی قسمت پر مہر لگا لو گے۔"

لڑکے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے "تم چاہتے کیا ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ یقین کرو‘ اس سے تمہیں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پوچھو۔"

"تمہارا نام بین آئزک ہے اور تم یہودی ہو؟"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔"

"مجھے شک ہے اس میں۔"

"شک کی کوئی وجہ بھی ہو گی؟"

"ہاں۔ جس بات پر تمہارا جھگڑا ہوا تھا‘ وہ بات عربوں کا کوئی ہمدرد ہی کہہ سکتا ہے۔ کسی یہودی کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو ان کی کمزوری بتائے اور اسے دور کرنے کی تلقین بھی کرے۔"

"اس کی وجہ ہے۔ میں فلسطینیوں کو مظلوم سمجھتا ہوں۔ ہم بے وطن تھے‘ ہم نے وطن حاصل کرنے کے لیے انہیں بے وطن کر دیا۔ میں فلسطین پر ان کا حق تسلیم کرتا ہوں لیکن یہودیوں کے حق سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ عجیب سا تضاد ہے مجھ میں۔"

"عجیب بات ہے۔"

"ایک میں ہی نہیں‘ ایسے بہت سے لوگ ہوں گے دنیا میں جو آنکھیں بند کر کے تقلید نہیں کرتے۔ انسانیت پسند تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے‘ میں نے مان لیا۔ یہ بتاؤ‘ تم نے لڑائی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے؟"

"ہاں۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور بارہا انسانی خون بہا چکا ہوں" یہ کہتے ہوئے لڑکا ایک جہاں دیدہ مرد معلوم ہونے لگا۔

یوسف کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "اور یہ تربیت کہاں حاصل کی تم نے؟" اس نے پوچھا۔

"پولینڈ میں‘ ایک برطانوی میجر نے ہمیں تربیت دی تھی" بین آئزک کی نظریں جیسے کہیں دور.......... ماضی میں پہنچ گئیں۔

"پولینڈ میں؟" یوسف کے لہجے میں حیرت تھی "تو کیا وہ دودھ پیتے بچوں کو تربیت دے رہے تھے؟"

"روسیوں کے عہد کی بات ہے یہ۔ میں اس وقت ۱۳ سال کا تھا۔ انہی دنوں میں نے پہلے روسی کو ہلاک کیا تھا" بین آئزک نے بے حد سادگی سے کہا۔

"اور جو میجر تمہیں تربیت دے رہا تھا‘ اس کا کیا حشر ہوا؟"

"ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے مخبری کی۔ میجر پکڑا گیا۔ روسیوں نے اس پر بے تحاشہ تشدد کیا اور وہ مر گیا۔ بعد میں میں نے مخبری کرنے والے کو ٹھکانے لگا دیا۔"

اس کے لہجے کی بے نیازی سے یوسف کو خوف آنے لگا۔ لڑکا.......... بلکہ اسے لڑکا کہنا ٹھیک نہیں تھا۔ بہرحال وہ بہت سخت جان اور خطرناک تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے زندگی کی جنگ لڑی ہے؟ اس نے سوچا پھر پوچھا "اور تمہارے گھر والے؟"

"وہ سب قتل کر دیے گئے" بین آئزک نے عام سے لہجے میں کہا "اس کے بعد میں نے بے شمار روسیوں کو قتل کیا" اس کے نوجوان چہرے پر اچانک بڑھاپے کا‘ بے کراں وقت کا سایہ لہرا گیا۔ اب وہ نوجوان ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

یوسف کے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا تھا۔ وہ بالکل نیا آدمی تھا۔ اگر وہ یہودی تھا تو یہودیوں کی یہ نئی نسل اس نسل سے بالکل مختلف تھی‘ جس کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔ "تو کیا تمہارے خاندان میں کوئی بھی نہیں بچا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے انکل‘ میرے باپ کے چھوٹے بھائی زندہ تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟ کیا اب وہ زندہ نہیں؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"مجھے معلوم نہیں۔ وہ کبھی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہے۔ وہ بہت عظیم از
تھے۔"

"عظیم کس اعتبار سے؟"

بین آئزک کی آنکھوں میں گرم جوشی کی ایک لہرسی اٹھی "وہ بہت اچھے معلم
سائنس داں تھے۔ اس کے علاوہ وہ مؤرخ اور ماہر آثارِ قدیمہ تھے۔ انہوں نے پوری
دیکھی تھی۔ شاید ہی کوئی ملک چھوڑا ہو انہوں نے۔ان کا نام ڈاکٹر نتھانیل لیوی ہے۔
بین آئزک لیوی ہوں۔"

وقت اور بڑھاپے کا جو غبار اس کے نوجوان چہرے پر چھا گیا تھا' وہ یک لخت رہ
گیا۔ اب اس پر اپنے انکل کی بے پناہ محبت لکھی ہوئی تھی۔ یوسف حیران رہ گیا۔ آد
کے پاس کیسے کیسے رنگ ہوتے ہیں۔ ایسے بھی' جو کائنات میں کہیں اور نظر نہیں آتے۔

"تم نے بائبل پڑھی ہے؟" یوسف نے پوچھا۔

"ہاں۔ عہد نامہ تو میں نے بچپن ہی میں یاد کر لیا تھا۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ آغازِ زندگی کے پانچویں باب میں جو لکھا ہے کہ لوگوں
آٹھ آٹھ ' نو نو سو سال کی عمر پائی' اس کا کیا سبب ہے؟"

"سبب صرف اتنا ہے کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔"

یوسف نے اسے گھور کر دیکھا "مذاق کر رہے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ تم نے ایک بات پوچھی' میں نے اس کا جواب دے دیا۔"

"ٹھیک ہے" یوسف نے کہا "تمہارے انکل نتھانیل سائنس داں بھی ہیں اور ما
آثارِ قدیمہ بھی۔ ہے نا؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں اور میں جھوٹ نہیں بولتا" بین آئزک نے تیز لہجے می
کہا۔

"اب وہ کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ البتہ میں نے سنا تھا کہ وہ فلسطین چلے گئے ہیں.......... میر
مطلب ہے اسرائیل۔"

"وہ عہدِ قدیم کی اس طویل عمری کا راز جانتے ہوں گے؟"

"وہ سب کچھ جانتے ہیں" یہ ایک نوجوان کا جواب تھا.......... بچکانہ جواب لیکن
اگلے ہی لمحے وہ پختہ کار مرد بن گیا۔ اس نے ایک لمحے سوچنے کے بعد اضافہ کیا "کیونکہ و

خدا کو سمجھتے ہیں' جانتے ہیں اور اس سے قریب ہیں۔"

یوسف کو خوشی ہوئی۔ اس نے بھانپ لیا کہ بین آئزک جذباتی بھی ہے۔ ایسے
لوگوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ اندر سے سخت نہیں
ہوتے.......... کم از کم بہت سخت نہیں ہوتے۔ اس نے گفتگو کا رخ بدلا "تم لوگ کہاں
کے رہنے والے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"پولینڈ کے۔"

"اور اس سے پہلے؟"

"اس سے پہلے ہم اسپین میں رہے تھے۔ انکل نتھانیل بتاتے تھے کہ بنیادی طور پر
ہم نفتالی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں' جو ہیزر کی پہاڑیوں پر آباد ہے۔ ہم بہت پرانے لوگ
ہیں.......... بہت بوڑھی نسل ہے ہماری" اس کے لہجے میں عجیب سی گرم جوشی تھی۔ لفظ
زندہ' سانس لیتے' دھڑکتے محسوس ہو رہے تھے۔

"نفتالی کا تذکرہ تو ابھی میں نے بائبل میں پڑھا ہے۔ یہ کہاں ہے؟"

"گیلی لی کے اوپر.......... شمال کی سمت' اسرائیل میں" بین آئزک نے جواب
یا۔ پھر بے حد سادگی سے کہا "وہ خوب صورت ترین خطۂ زمین ہے۔"

"تم کبھی گئے ہو وہاں؟" یوسف نے پوچھا۔

بین آئزک نے نفی میں سر ہلایا "نہیں' لیکن انکل نتھانیل مجھے وہاں کے متعلق
اتے رہتے تھے۔ وہ مجھے ہمارے آباؤ اجداد کے متعلق بھی بتاتے تھے۔"

اچانک یوسف کو ایک خیال آ گیا۔ پہلے ہی آ جانا چاہئے تھا' جب لڑکے نے پولینڈ میں
ربیت کا ذکر کیا تھا اور اس وقت اپنی عمر ۱۳ سال بتائی تھی "بین آئزک! سچ بتاؤ' تمہاری
مر کتنی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لگتی کتنی ہے؟"

"۲۰.......... ۲۲ یا زیادہ سے زیادہ ۲۴ سال۔"

لڑکا مسکرا دیا "میری عمر ۱۴ سال ہے۔"

یوسف ششدر رہ گیا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سخت کوشی میں
ندگی بسر کرنے والے تو یوں بھی وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں اور وہ یقین سے
ہہ سکتا تھا کہ بین آئزک نے بہت دشوار زندگی گزاری ہے۔ آخر کار اس نے خود کو اس
ھٹکے سے سنبھالا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے کہا۔

”یہ چیز ہمیں نسلی طور پر ودیعت ہوئی ہے‘ یہ ہمارا ورثہ ہے“ بین آئزک سادگی سے کہا۔

یوسف کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کے اس مو پر‘ اس اجنبی‘ ادھیڑ عمر لڑکے سے اس کی اتفاقیہ ملاقات معنی خیز ہے‘ جیسے قسمت نے ا کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر کے اسے جگمگاتی ہوئی شاہراہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہو، اس کا وجود اس جواری کے سے اعتماد سے لبالب بھر گیا‘ جسے اچانک احساس ہو گیا ہو ک قسمت ساتھ دے رہی ہے اور اب وہ ریت کو ہاتھ لگائے گا تو وہ بھی سونا بن جائے گی۔ کرارے‘ نئے نوٹوں کی مہک اس کے وجود میں ہلکورے لینے لگی۔ اب صرف ا قسمت کی اس کروٹ سے استفادہ کرنا تھا۔

”بین آئزک! کبھی تم نے سوچا کہ تم زندگی سے کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

جواب جس سرعت سے ملا‘ وہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ ”ہاں۔ میں وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ وطن سے میری مراد پولینڈ نہیں‘ آبائی سرزمین فلسطین ہے۔ میں ہر روز یہی سوچتا ہوں کہ وہ کون سا دن ہوگا‘ جب میں وطن جاؤں گا۔“

”اوہ.......... لیکن تم پولینڈ کو وطن کیوں نہیں کہتے؟“

”کچھ تو اس لیے کہ آبائی وطن کی خاک بے حد مقدس ہے۔ اس کے آگے کچھ نہیں جچتا اور کچھ یوں کہ پولینڈ اب ختم ہو چکا ہے۔ وہاں اب کبھی آزادی کی کوئی تحریک نہیں ابھر سکتی۔ میرے فلسطین کی بات اور ہے۔ وہ تو پیغمبروں کی سرزمین ہے“ بین آئزک کا لہجہ جذباتی ہو گیا ”ممکن ہے‘ میں وہاں جاؤں تو میرے انکل نتھانیل مجھے زندہ ملیں۔“

”تو اب تم وہاں چلے کیوں نہیں جاتے؟“ یوسف نے پوچھا۔

بین آئزک حیرت سے اسے دیکھتا رہا ”سنو دوست! درحقیقت میں ایک ناموجود آدمی ہوں“ اس نے جواب دیا ”جو موجود ہوتے ہیں‘ ان کی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ آدمی محض اپنے وجود سے تو کہیں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کاغذات سے وجود ثابت ہوتا ہے‘ دستاویزات سے۔ میں بحری جہازوں میں سفر کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی اس صورت میں جب جہاز کا کپتان بہت زیادہ سوالات کرنے کا عادی نہ ہو اور اسے کسی خلاصی کی شدید ضرورت بھی ہو۔ میں جہاں بھی اترتا ہوں‘ جہاں بھی رہتا ہوں‘ میرے وجود کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ جہاز کے کپتان سے رابطہ کرتے ہوئے مجھے محتاط رہنا ہوتا ہے۔ کپتان

کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی وقت وہ مجھے امیگریشن کے حکام کے حوالے کر سکتا ہے۔ مجھے یہاں موجود ہونے کا کوئی حق نہیں“ وہ چپ ہو گیا اور پھر چند لمحے کے کرب ناک توقف کے بعد بولا ”مجھے دنیا میں کہیں بھی موجود ہونے کا حق نہیں۔ میں نے خاصا طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں ایک ناموجود آدمی کا گم ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ محکمۂ خفیہ کے لوگ مجھ پر نظر رکھ رہے ہیں۔ انہیں شبہ تھا کہ میرا تعلق سی آئی اے سے ہے۔ یہ آنکھ مچولی میرے لئے نئی نہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب مجھے کہیں اور جانا ہوگا۔ خوش قسمتی سے بمبئی میں مجھے ایک جہاز پر کام مل گیا۔ یوں میں کراچی آگیا۔ مگر اب مجھے یہاں بھی اپنی عافیت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔“

”یہ تو واقعی المیہ ہے“ یوسف نے کہا اور چند لمحے اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا ”اگر تمہیں پاسپورٹ اور شناختی کاغذات مل جائیں تو تم فلسطین.......... میرا مطلب ہے‘ اسرائیل جا سکتے ہو بلکہ جہاں چاہو‘ جا سکتے ہو۔ کیا خیال ہے؟“

”یہاں کے پاسپورٹ اور کاغذات ہوتے ہوئے تو میں اسرائیل کی حدود میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میری تو اسرائیل میں بھی کوئی شناخت نہیں ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ اسرائیل سے تمہارے ملک کے تعلقات کس حد تک دوستانہ ہیں۔“ یہ کہہ کر س نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔

یوسف نے فیصلہ کیا کہ یہ اپنے پتے سامنے رکھنے کا مناسب ترین وقت ہے۔ اس نے جیب سے مڑا تڑا اخبار نکالا۔ اس پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر اس نے شکنیں دور کیں اور اسے میز پر پھیلا دیا۔ پھر اس نے جینا میلکم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”بین آئزک! جانتے ہو یہ خاتون کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے کہا نا‘ میں تو اس ملک میں خود کو بھی نہیں جانتا۔“ بین آئزک نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اس خاتون کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟“

بین آئزک نے اخبار اس سے لے لیا۔ وہ بہت غور سے جینا میلکم کی تصویر دیکھتا ہا۔ یوسف کو حیرت ہوئی کیونکہ بین آئزک اب انٹرویو کی تفصیل پڑھ رہا تھا۔ اس کا

مطلب تھا کہ وہ اردو صرف بول ہی نہیں' پڑھ بھی سکتا ہے۔

بین آئزک خاصی دیر تصویر کو گھورتا رہا۔ پھر اسے یوسف کی نگاہوں کا احساس جو سوالیہ نظروں سے اسے تکے جا رہا تھا۔ "میرا خیال ہے' یہ خاتون ناخوش ہے۔ زیادہ ناخوش" اس نے پر خیال لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس کی ناخوشی کو خوشی میں تبدیل کرنے میں کوئی دلچسپی ہے؟" یوسف پوچھا۔

"کیوں۔ مجھے کیوں ہوگی؟"

یوسف نے اس کے کٹیلے لہجے اور بے رحمانہ سوال کو نظرانداز کر دیا۔ اس انداز لگالیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے ہی جیسے ایک انسان کے روبرو ہے۔ بین آئزک اندر سے خام اور نرم ہے۔ وہ اوپر سے سخت دل بھی ہے اور سخت جان بھی۔ اسے سوا کسی سے بھی دلچسپی نہیں۔ اس لیے کہ زندگی نے اسے برتا ہے' زخم دیلے ہیں او تلخیوں سے نوازا ہے۔

"ہونی چاہئے۔" یوسف نے کہا "ٹھہرو' میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں تمہیں اس عورت کو خوشی مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے' کیونکہ اس کے عوض و تمہاری ہر خواہش' تمہاری تمام ضروریات پوری کر سکتی ہے۔ وہ تمہیں شناخت' شناخت کاغذات' پاسپورٹ' کام کی ایک قومیت اور ایک گھر فراہم کر سکتی ہے.........."

بین آئزک نے بے حد تند لہجے میں کہا "یہ خیال تمہیں کیسے آیا کہ مجھے ایک گھر کی طلب ہے؟"

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا "یہ طلب تو ہر شخص کو ہوتی ہے؟"

یوسف نے اپنے تجربات اور اپنی خواہشات کو سامنے رکھتے ہوئے بہت بھرپور اور موثر حملہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسانی سرشت میں گھر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ گھر کبھی صرف ایک خواہش نہیں ہوتا' اس کے ساتھ بہت کچھ مشروط ہوتا ہے۔ وہ صرف چار دیواری' در دریچوں' کشادہ اور آراستہ کمروں کا نام نہیں' جب تک اس کے چپے چپے پر آسودہ خواہشیں چلتی پھرتی' ہنستی گاتی نہ ہوں' وہ گھر نہیں ہوتا۔

ادھیڑ عمر لڑکے کو اس وار نے دہلا دیا تھا مگر طبعاً وہ جنگ جُو تھا۔ اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "وہ اس سلسلے میں کس طرح کام آسکتی ہے.......... کیا مدد کر سکتی ہے؟ مجھے اس کے عوض کیا کرنا ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میرے کس کام' میری کس

دمت کے بدلے وہ میرے کام آئے گی؟ میرا اس منکر بوڑھی عورت سے کیا واسطہ ہے؟ میں.........."

"منکر؟"

"تو اور کیا۔ جو شخص موت سے لڑنے کا دعوی کرے' وہ منکر ہی کہلائے گا" بین ئزک کے لہجے میں خفگی تھی "اور تم کیا کھیل کھیل رہے ہو مسٹر؟ اتنا تو میں سمجھتا ہوں لہ تم بے حد مطلبی اور خود غرض آدمی ہو۔ تم بے سبب ہی مجھ سے نہیں مل بیٹھے ہو اور ہارا نام کیا ہے؟"

"نام میں تمہیں بتا چکا ہوں.......... جوزف ڈیوڈسن" یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔

نفتگو کا یہ رخ اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اسے اب بھی پوری طرح یقین نہیں تھا بین آئزک درحقیقت یہودی ہے۔ تاہم اس کا امکان بھی تھا اور اس صورت میں وہ سف کی حیثیت سے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

"لیکن تم نے کچھ دیر پہلے دو ناموں کا تذکرہ کیا تھا" بین آئزک نے اعتراض کیا۔

"یقیناً کیا تھا اور تمہاری طرح میرا بھی دوسرا نام ضرورت ہے۔ جہاں تک میرے د غرض ہونے کا تعلق ہے' وہ میں ہوں' تم بھی ہو۔ نہیں ہو کیا؟ اور میں یہ بات کبھی پاتا بھی نہیں ہوں۔ میں بے غرضی اور خلوص کے دعوے کر کے کسی کو نہیں لوٹتا۔ رف اپنی ذہانت پر انحصار کرتا ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں ہے کہ تم صرف جوزف ڈیوڈسن ہو۔"

یوسف نے الماری کھول کر اپنا شناختی کارڈ نکالا.......... جوزف والا.......... اور بین زک کی طرف بڑھا دیا۔

بین آئزک نے کارڈ کا جائزہ لیا اور پھر اسے واپس دیتے ہوئے بولا "اس سے کیا اہے؟ یہ خاتون.........." اس نے اخبار میں جینا میلکم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ئے کہا ".......... یہ بن اسحاق کے نام سے میرا شناختی کارڈ بھی بنوا سکتی ہیں۔ تمہاری کا مطلب یہی تو تھا" پھر یوسف کے چہرے کا تاثر دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ "خیر' مجھے کیا؟ انے بے پروائی سے کہا "یہ بتاؤ.......... مجھے کرنا کیا ہے؟"

"یہ ہوئی نا بات۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔" یوسف نے خوش ہو کر کہا۔

اس نے بین آئزک کو سب کچھ کہہ سنایا۔ اپنا یہ مفروضہ بھی بتا دیا کہ بائبل میں ا العمری کے متعلق جو بیان ہے' وہ جینا میلکم کے لئے یقینی طور پر متاثر کن ثابت

ہو گا۔ وہ اسے یقین دلا سکے گا کہ کہیں نہ کہیں کوئی راز ہے' جسے دریافت کر کے آدم بھی اپنی عمرِ طبعی کو طول دے سکتا ہے۔

بین آئزک خاموشی سے سنتا رہا۔ یوسف کے خاموش ہونے کے بعد اس

"میرا خیال ہے' تم خود بھی اس پر یقین رکھتے ہو۔"

"میرے یقین کی کوئی اہمیت نہیں" یوسف نے بے پروائی سے کہا "ویسے یہ نا تو نہیں ہے۔"

بین آئزک نے کندھے جھٹک دیے "انکل نتھانیل ہی اس سلسلے میں کوئی رائے دے سکتے ہیں۔"

"اوہ' ہاں۔ انکل نتھانیل.......... سائنس داں' ماہر آثار قدیمہ' لیکن تمہیں معلوم کہ اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔"

"کیا پتا' وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں!" بین آئزک نے افسردگی سے کہا۔ پھر اچ اسے کچھ خیال آگیا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح مجھے شناختی کاغذات پاسپورٹ کیسے مل سکتا ہے؟"

"اگر جینا میلکم قائل ہو گئی تو وہ یقیناً یہ چاہے گی کہ تم اور میں فلسطین جائیں اس سلسلے میں تحقیقی کام کریں۔ وہ بے انتہا دولت مند ہی نہیں' بین الاقوامی اہمیت شہرت کی حامل ہے۔ اس کے اثر و رسوخ کی کوئی حد نہیں۔ وہ تمہیں امریکی شہریت دلوا سکتی ہے۔"

"لیکن اپنے لیے جنت میں جگہ حاصل نہیں کر سکتی!" بین آئزک نے تلخ لہجے کہا۔

"اسے وہاں جانے کی آرزو بھی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہے۔ اگر م تھیوری درست ثابت ہوتی ہے تو اسے زمین پر مزید قیام کی مہلت مل.........."

"میرے خیال میں تو تم اسے جہنم کا ٹکٹ دلوا دو گے۔"

"دیکھو! ہم کوئی بے ایمانی یا بدمعاشی نہیں کر رہے ہیں" یوسف نے اسے سمجھا اسے اندازہ ہو گیا کہ بین آئزک سخت جان' سخت کوش اور خود غرض سہی لیکن کاروبا زندگی کے امور میں ابھی کچا ہے۔ اس کے سامنے بچہ ہے۔ "دیکھو نا' ہم تو اسے ا آئیڈیا فروخت کر رہے ہیں اور پھر ٹھیک ہے کیا.......... دیانت ہے کہاں؟ دنیا نے میر اور تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے' وہ کون سا درست ہے؟ خود جینا میلکم کی تمام دول

کے بارے میں چھان بین کی جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ دیانت داری سے کبھی اتنی دولت حاصل نہیں کی جا سکتی.........."

"یہ بات چھوڑو کہ دنیا نے میرے ساتھ کیا کیا ہے" بین آئزک نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "میں آپ اپنا خیال رکھ سکتا ہوں' جینے کے ہنر سے واقف ہوں۔ ورنہ اب تک مر چکا ہوتا۔ مجھے تم اپنے فلسفے سے علیحدہ ہی رکھو۔"

"دیکھو! اب تک تم ثابت کر چکے ہو کہ تم سخت جان آدمی ہو اور جینا جانتے ہو لیکن اس وقت تم جس دشواری میں پھنسے ہوئے ہو' وہ بہت بڑی ہے۔ امیگریشن والوں کے ہتھے چڑھ گئے تو کمانڈو تربیت کسی کام نہیں آئے گی۔ تمہارے بچ نکلنے کی یہی ایک صورت ہے" یوسف نے بہت محتاط ہو کر بات کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بین آئزک اسے دھمکی تصور کرے یا اس کے ذہن میں بلیک میلنگ کا خیال آئے۔ وہ کئی طرح کی گولیاں استعمال کرنے کا قائل تھا۔ کھٹ مٹھی گولی سے کام چل جائے تو زہر کی گولی استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بین آئزک نے بے چینی سے پہلو بدلا "دیکھو بھائی! وہ کیسی ہی سہی' بہرحال عورت ہے.......... کم زور اور بوڑھی عورت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو مگر ہم اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہے ہیں" یوسف نے جلدی سے کہا "میرے آئیڈیے پر اگر وہ سرمایہ کاری کرتی ہے تو لاکھ دو لاکھ کی ہی کرے گی نا۔ دوسری طرف ٹیلی فون پر ایک منٹ کی گفتگو میں وہ کروڑوں روپے خرچ کر کے ایک ایسی کمپنی خرید لیتی ہے' جو تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے' وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتی ہے۔ لاکھ دو لاکھ کی اوقات ہی کیا ہے؟ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اتنی رقم تو ایک گھنٹے میں کما لیتی ہے۔ بینک میں اس کے کھاتے میں اعداد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے' اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ سمندر میں سے ایک بالٹی پانی نکال لیا جائے تو سمندر میں کوئی کمی تو نہیں ہو جاتی۔"

بین آئزک خاموش بیٹھا' جینا میلکم کی تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔

یوسف کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ کاش اس وقت وہ بین آئزک کے ذہن میں جھانک سکتا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا وہ۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ سوچ سمجھ کر ایک اور وار کرتا۔ بہرحال' کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا "اور یہ بھی تو دیکھو.........." آخر کار اس نے آئزک کی خاموشی سے تنگ آ کر کہا "یہ تو نہیں ہے کہ اسے اپنی رقم کے بدلے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میری تھیوری پر جب تک کام نہ کیا جائے' اسے یوں ہی زبانی

طور پر تو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جینا سے کچھ لے نہیں رہے ہوں گے.......... بلکہ اسے کچھ دے رہے ہوں گے۔ امید ولولے سے بڑھ کر زندگی کے لیے کوئی چیز طوالت بخش نہیں ہوتی۔ ہم پوری سچائی ساتھ اس کے لئے تحقیقی کام کریں گے اور اس کے عوض تنخواہ لیں گے۔ ہم ایک ترتیب دیں گے، فلسطین جائیں گے' وہاں تحقیق کریں گے اور باقاعدگی سے رپور بھیجیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنی سی بات سے جو اس میں زندگی نئی امنگ پیدا ہو گی' وہ کم از کم پانچ سال تک تو اسے نہیں مرنے دے گی۔ اسے تو زند سے چمٹے رہنے کا.......... اس چھوٹتی ڈور کو دبوچنے کا بہانہ چاہیے.........."

اچانک بین آئزک نے اس کی تقریر کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے تصور تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم ایک بات بھول رہے ہو دوست۔ یہ عورت تمہاری بات پر کو یقین نہیں کرے گی۔"

یوسف نے سخت نظروں سے اسے دیکھا' جیسے اس کے آرپار دیکھنے کی کوشش ک رہا ہو۔ "ممکن ہے' تم ٹھیک کہہ رہے ہو" اس نے آہستہ سے کہا "لیکن ایک بات می بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں' وہ تمہاری بات پر یقین کئے بغیر نہیں رہے گی" اس نے لف "تمہاری" پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

چند لمحے وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ تمام نقابیں درمیان سے ہٹ گئی تھیں' کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔ ہر چیز واضح تھی اور ہر حقیقت عیاں۔ ان کے درمیان ایک ہی رشتہ تھا' جو دنیا کا سب سے مضبوط بندھن ہوتا ہے.......... ضرورت کا رشتہ! انہیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ وہ اس وقت گویا اس قدیم دور میں پہنچ گئے تھے' جہاں بارٹر سسٹم رائج تھا' جہاں غلہ اگانے والا سردی سے بچنے کے لیے غلہ نہیں اوڑھ سکتا تھا اور شکاری جانوروں کی گرم کھال کو غذا کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی ضروریات مختلف تھیں' ان کی منزلیں جدا تھیں' ان کے مقاصد متضاد تھے لیکن وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی مدد درکار تھی۔

یوسف اس قسم کی صورتِ حال کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے اور ادھیڑ عمر لڑکے کے درمیان حائل خاموشی کو توڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے تلوار کی طرح لٹکنے دیا تاکہ وقت اور صورتِ حال کا فیصلہ پوری شدت اور توانائی کے ساتھ بین آئزک کے دل و دماغ میں اتر جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس خاموشی سے بڑھ کر قائل کرنے والی کوئی اور دلیل نہیں۔ یہاں لفاظی بھی بے کار ہے۔

پھر اس نے بین آئزک کی آنکھوں میں دیکھ لیا کہ بات اس کے دل میں اتر گئی ہے "ایک پیالی چائے اور نہ پی لیں" اس نے کہا "اس کے بعد تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ چائے دماغ کے جالوں کو پلک جھپکتے صاف کر دیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے جالے صاف ہوں یا نہ ہوں' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چائے کی افادیت کے تو اور بھی بہت سے پہلو ہیں" بین آئزک نے جواب دیا۔

○-----○-----○

منصوبہ ایک دن میں تیار ہو گیا' نوک پلک دوسرے دن درست کر لی گئی۔ اس کے بعد یوسف نے بنیادی مسائل کا جائزہ لیا۔ جینا میلکم کے سلسلے میں اس کی ریسرچ بہت کام آئی۔ یہ بات طے تھی کہ جینا میلکم تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس سے ملاقات کے لئے وقت لینے سے کہیں آسان کسی سربراہ مملکت سے ملاقات تھی۔ اس سلسلے میں یوسف کو بہت زیادہ سر کھپانا پڑا۔ بین آئزک اس سلسلے میں دلچسپی لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے پاس بہترین جواز تھا۔ "میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں.........." یوسف اس جواز سے بہت چڑتا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ کیوں نہیں جانتے' جبکہ جاننا چاہیے۔ تاہم اس نے اپنا یہ فلسفہ بین آئزک پر نہیں تھوپا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بہانے کی آڑ لے کر بین آئزک اشتراک سے دست بردار ہو جائے۔ اگرچہ اس کی صورت حال کے پیش نظر اس بات کا امکان نہیں تھا۔ پھر بھی خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں تھا۔ انسانی ذہن کا کیا بھروسا! کسی بھی وقت کسی بھی راہ چل نکلے۔

دوسرے دن یوسف نے فیصلہ کر لیا کہ جینا میلکم سے اپائنٹ منٹ لینا ممکن نہیں چنانچہ بغیر اپائنٹ منٹ کے ملنا ہو گا۔ کام مشکل ضرور تھا لیکن دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسے بغیر اپائنٹ منٹ کی اس ملاقات کے لیے فضا تیار کرنی تھی اور اس کے بعد اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک خاکہ ترتیب دے لیا' جس میں حسبِ ضرورت کسی بھی وقت میسر آنے والے رنگ بھرے جا سکتے تھے۔

یوسف کا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا تھا کہ اگر مسائل کو مخلوق تصور کر لیا جائے تو وہ افزائشِ نسل کی تیز رفتاری کے سلسلے میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مخلوق کو بھی میلوں پیچھے چھوڑ دیں گے۔ مسئلے کی کوکھ سے مسئلے اور پھر ان مسئلوں کی کوکھ سے مزید مسئلے جنم لیتے

جارہے تھے۔ ان میں اہم ترین مسئلہ ضرورتِ زر کا تھا۔ جینا میلکم تک بے ضابطہ پہنچنے ـ سلسلے میں اسے اچھی خاصی سرمایہ کاری کرنی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے اس کا ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اپنا ڈربہ فلیـ فروخت کردیا اور ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس اور دوسرے میں بین آئزک کا ہاتھ تھام کـ کینٹ کے علاقے کی طرف چل دیا' جہاں سستے رہائشی ہوٹل بکثرت تھے۔ اسے اپنے او بین آئزک کے لیے کمرا حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کمرے کی حالت ایـ تھی کہ اسے اپنے فلیٹ سے دوری کا احساس بھی نہیں ہوا۔ فرق صرف در و دیوار ہی ـ تو تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے کچھ ضروری چیزیں خریدیں۔ بین آئزک کو معمولی قسم کے دو جوڑے دلائے۔ پھر اس نے اپنے سوٹ کے لیے' بے حد نفیس کپڑا خریدا اور ایک بہترین ٹیلرنگ شاپ کا رخ کیا۔ وہاں اس نے تقاضا کیا کہ اسے سوٹ جلد از جلد درکار ہوگا۔ ٹیلر ماسٹر نے ٹرائی کے لیے اسے تین دن بعد آنے کی ہدایت کی۔

بین آئزک حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جوزف ڈیوڈسن کیا کرتا پھر رہا ہے۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ جینا میلکم جیسی عورت سے بغیر اپائنٹ منٹ کے کیسے ملاقات کی جاسکتی ہے۔

سوٹ کا ناپ دینے کے بعد یوسف نے ایک پرنٹنگ پریس کا رخ کیا۔ بین آئزک اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے بین آئزک کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہوٹل کے کمرے تک محدود رہے۔ کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا لے۔ اگرچہ ریسٹورنٹ ہوٹل کی حدود ہی میں نچلی منزل پر تھا مگر اس نے بین آئزک کو وہاں جانے سے بھی منع کر دیا تھا بلکہ اس نے ریسٹورنٹ کے ویٹر کو معقول ٹپ دے کر اسے اپنا اور اپنے ساتھی کا خیال رکھنے کی ہدایت دی تھی۔ ٹپ جیب میں پہنچتے ہی ویٹر تو ان دونوں کے آگے پیچھے گھومنے لگا تھا۔ وہ بار بار آکر پوچھتا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر یوسف نے ایک بار پھر منصوبے پر غور کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے بہتر منصوبہ اس صورت حال میں ممکن نہیں۔ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اس نے دو ہفتے بعد کا دن مقرر کیا۔ بین آئزک کو کسی بات کا علم نہیں تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے کسی قسم کا تجسس بھی ظاہر نہیں کیا۔

بائبل اب بھی یوسف کے پاس تھی۔ وہ آغازِ زندگی کے ذیل میں اس کے تمام

ابواب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ہر ایسی بات جو طویل العمری کے سلسلے میں بطور دلیل استعمال کی جاسکے' اس کے ذہن میں محفوظ ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ بین آئزک سے کسی نکتے کی وضاحت طلب کرتا اور اس کی بات بے حد توجہ سے سنتا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا' جیسے وہ کسی امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور درحقیقت وہ تھا بھی امتحان ہی.......... اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان' جس پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا۔

وہ بے حد مطمئن اور پرسکون تھا کیونکہ جیب کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس رقم میں وہ تین ماہ بہ آسانی گزار سکتا تھا۔

کبھی کبھی وہ بین آئزک کو نفتالی قبیلے کے بارے میں چھیڑ دیتا۔ بین آئزک اپنے انکل نتھانیل کے حوالے سے ان دیکھی سرزمین کی باتیں کرتا رہتا۔ ایسے میں دونوں ہی کی آنکھیں خوب چمکتیں۔ بین آئزک کی آنکھوں میں خواب ہوتے۔ اس کی آنکھیں اس معصوم بچے کی آنکھوں کی طرح چمکتیں' جو صرف چاند کی آرزو ہی نہیں کر رہا ہو بلکہ جسے یقین ہو کہ چاند اس کے ہاتھ بھی آجائے گا۔ یوسف کی آنکھوں میں بھی خواب ہوتے مگر اس کی آنکھوں میں حریصانہ شیطنت چمکتی.......... اس عیار بوڑھے کی طرح' جس نے معصوم بچے کو چاند فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ اس سرزمین کی باتیں سنتا' جہاں لوگ اب بھی طویل عمریں پاتے ہیں۔ وہ اس نوجوان کو دیکھتا' جس کی عمر ۱۴ سال تھی' جس کے اجداد نفتالی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے' جس نے اس حیات آفرین سرزمین پر کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا مگر پھر بھی اپنی عمر سے آدھا نظر آتا تھا۔ وہ اسے بڑی چاہت اور محبت سے دیکھتا۔ وہ ادھیڑ عمر لڑکا ابدی زندگی کے نسخے کی حیثیت رکھتا تھا' جسے بہ آسانی ملک کی متمول ترین خاتون کے ہاتھ بیچا جا سکتا تھا۔

تین دن بعد اس نے ٹیلرنگ شاپ جا کر سوٹ کی ٹرائی دی۔ ٹیلر ماسٹر نے ایک ہفتے بعد سوٹ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہاں سے نکل کر وہ پرنٹنگ پریس گیا اور ڈیلیوری پیکٹ لے کر نکل آیا۔ ہوٹل واپس آکر اس نے بین آئزک کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اس نے بین آئزک کو کچھ رقم دی اور کمرے تک محدود رہنے کی سختی سے ہدایت کی اور ایک بریف کیس میں دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کا سامان رکھ کر وہاں سے نکل آیا۔

کینٹ اسٹیشن پہنچ کر اس نے لاہور کا ٹکٹ لیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ لاہور پہنچ کر اس نے ایک اچھے ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں سے اس نے کراچی کے لیے کال بک کرائی

اور اہم گفتگو کی۔ پھر اس نے ایک مخصوص پتے پر ٹیلی گرام کیا۔ لاہور کے فوراً بعد اس نے راولپنڈی اور پشاور کا رخ کیا۔ وہاں ایک ایک روزہ قیام کے دوران اس نے فون کال اور ٹیلی گرام والی کارکردگی دہرائی۔ واپسی میں وہ ایک دن فیصل آباد میں رکا۔ وہاں ایک روزہ قیام کے دوران اس نے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کو شیشے میں اتارا۔ جیب گرم ہوئی تو اسے یوسف کی ایک مخصوص تاریخ کے سلسلے میں ہدایات بھی ازبر ہو گئیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے اس کی ہدایات پر عمل کرے گا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر یوسف کراچی واپس آ گیا۔

اپنے غیاب میں بس اسے ایک ہی دھڑکا لگا رہا تھا کہ ایسا نہ ہو، وہ کراچی پہنچے تو بین آئزک کو غائب پائے۔ بین آئزک کو کمرے میں موجود پا کر وہ پر سکون ہو گیا۔ اگلے دو تین دن میں اس نے باقی کام بھی نمٹا دیے۔ اب وہ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

فلیٹ فروخت کرنے کے ٹھیک دو ہفتے بعد وہ جینا میلکم کو ایک غیر متوقع ملاقات سے نوازنے کی غرض سے میلکم پیلس پہنچ گیا۔ بین آئزک اس کے ساتھ تھا۔

○-----○-----○

یوسف نے میلکم پیلس کے لیے نکلنے سے پہلے خود کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔ سرمئی رنگ کے نئے سوٹ میں وہ بہت بچ رہا تھا۔ چم چماتے ہوئے نئے جوتے، نئی قمیص، یہ تمام اہتمام اس کے نزدیک بے حد ضروری تھا۔ وہ پہلے تاثر کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے یہ بھاری سرمایہ کاری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی خاطر اس نے بے گھر......... بے ڈربہ ہونا قبول کر لیا تھا۔

ایک دکان کے شوکیس کے پاس ٹھہر کر اس نے بظاہر شوکیس کی آرائش کا جائزہ لیا۔ درحقیقت وہ اپنے عکس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر سے پیر تک اپنے عکس کا معائنہ کیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا... پرفیکٹ۔ ہر چیز اپنی جگہ درست تھی۔ وہ نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا تھا کہ وہ شریف، معزز اور وجیہہ لگ رہا ہے۔ وجیہہ تو وہ یوں بھی تھا لیکن شاید لباس کی وجہ سے اس کی وجاہت پر لفنگے پن کی چھاپ لگ جاتی تھی۔

یہ بات تو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی غرض مند کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے نزدیک اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ بشرطیکہ غرض مند کی غرض پوری کر دی جائے مگر تجربات نے اسے سکھایا تھا کہ غرض مند کو صرف حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کی غرض پوری کرنے کی بجائے اسے ٹرخا دیا جاتا ہے۔ یہی اصل اختلافی نکتہ تھا کیونکہ وہ پیدائشی طور پر غرض مند تھا۔ شروع میں اس نے ٹھوکریں کھائیں اور پھر اس نکتے پر ریسرچ شروع کر دی۔ ماحصل اس ریسرچ کا یہ تھا کہ جس شخص سے غرض ہو، خود اس کو کسی نہ کسی طور پر غرض مند ثابت کر دو اور یہ بھی ثابت کر دو کہ اس کی غرض صرف تم ہی پوری کر سکتے ہو، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے غرض مند وجود پر وقار کی چادر ڈال کر اسے چھپا دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہ تدبیر بڑی حد تک کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اس بار البتہ معاملہ بہت اہم تھا۔ اس نے غرض مند وجود پر صرف وقار کا لبادہ نہیں ڈالا تھا بلکہ اسے خوش لباسی کی ڈھال بھی فراہم کر دی تھی۔ یہ بات مسلمہ تھی کہ خوب صورت وال پیپر کے پیچھے چھپی بوسیدہ دیوار کسی کو نظر نہیں آتی۔

بین آئزک کے لیے اس اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ عام سے لباس میں تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ عام سا لباس بھی اس کی خوب روئی اور وجاہت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک بے ساختہ وقار تھا، جو اس کی فطری بے پروائی سے جھلک رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی سوال کئے خاموشی سے یوسف کے ساتھ چل دیا تھا۔

یوسف اس وقت خود کو ایک مداری محسوس کر رہا تھا، جو ایک تربیت یافتہ بندر کو ساتھ لے کر شہنشاہِ وقت کے حضور ایک بالکل نیا کرتب دکھانے جا رہا ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مداری اتنا خوف زدہ اور اعتماد سے محروم نہیں ہو سکتا، جتنا وہ خود تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا بندر کوئی عام بندر نہیں تھا۔ وہ بے حد ذہین بھی تھا، بولنا بھی جانتا تھا اور غلط وصحیح کے مخدوش نظریات پر غور بھی کرتا تھا۔

بہرحال، اب تو وہ اوکھلی میں سر دے ہی چکا تھا۔ اب دھماکے سے ڈرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی بھاری سرمایہ کاری کے بعد پیچھے ہٹنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اور پھر قسمت اس کے ساتھ تھی۔ اس کی علامتیں تو وہ مسلسل دیکھتا رہا تھا۔

اس نے میلکم پیلس میں داخلے اور جینا میلکم سے ملاقات کو یقینی بنانے کے لیے مکڑی کی طرح جالا بنا تھا۔ لاہور، راولپنڈی اور پشاور سے میلکم پیلس فون کالز کی تھیں کہ کیا مسٹر جوزف ڈیوڈسن سے بات ہو سکتی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ یہ رانگ نمبر ہے، یہاں جوزف ڈیوڈسن نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی......... اس نے جواب میں کہا کہ مسٹر جوزف

ڈیوڈسن کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ چنانچہ کئی اہم کاروباری معاملات ٹھپ پڑے ہیں۔ جوزف ڈیوڈسن کی سیکریٹری سے صرف اتنا پتا چل سکا ہے کہ وہ مس جینا میلکم کاروباری ملاقات کی غرض سے کراچی گئے ہیں۔ اس پر دوسری طرف سے جواب ملا ازکم اس وقت تک تو مسٹر جوزف ڈیوڈسن نے میلکم پیلس میں قدم رنجہ نہیں فرمایا اس کے بعد اس نے درخواست کی کہ مسٹر ڈیوڈسن جیسے ہی میلکم پیلس پہنچیں، انہیر کر دیا جائے کہ لاہور سے مسٹر ایکس نے فون کیا تھا۔ راولپنڈی اور پشاور سے کی والی کالز کا انداز بھی کم و بیش یہی تھا۔ اس کے بعد ٹیلی گرامز کا سلسلہ تھا۔ ٹیلی گرام جوزف ڈیوڈسن کے نام تھے اور میلکم پیلس کے پتے پر بھیجے گئے تھے۔ اس معذرت ساتھ کہ مسٹر ڈیوڈسن کے متعلق اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو پا رہا ہے کہ وہ میلکم پہنچ کر مس جینا میلکم سے ملاقات کریں گے۔ اگر وہ ابھی نہ پہنچے ہوں تو ان کی آمد بے حد ضروری نوعیت کے ٹیلی گرام برائے مہربانی انہیں دے دیے جائیں۔ اس یوسف نے میلکم پیلس میں اپنے لیے اہمیت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اگ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا تو یہ بھی یقین تھا کہ اب تک جوزف ڈیوڈسن کا نام اجنبی نہیں رہا ہوگا۔

جہاں تک فیصل آباد سے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کی کال کا تعلق تھا، وہ تو ق کر سکتا تھا کہ آپریٹر نے آدھا گھنٹا پہلے وہ کال بھی کر دی ہوگی، ہدایات کے عین مطابق کال کرنے کے لیے فرضی جوابی نمبر بھی دے دیا ہوگا۔

ملازم نے انہیں انتظار گاہ میں بٹھایا اور پھر یوسف کے دیے ہوئے نہا خوبصورت وزٹنگ کارڈ کا جائزہ لیا "مسٹر جوزف ڈیوڈسن" اس نے بہ آواز بلند پڑھا۔ یوسف سے پوچھا۔ "آپ نے مس میلکم ذی شان سے اپائنٹ منٹ لیا ہے؟"

"نہ لیا ہوتا تو اپنا وقت ضائع کرنے کے لیے یہاں آتا؟" یوسف نے نرم لہجے کہا "تم یہ کارڈ مس ذیشان کے پاس لے جاؤ۔"

ملازم نے ایک بار پھر کارڈ پر نظر ڈالی اس بار اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چم ابھری "میں معافی چاہتا ہوں جناب۔ آپ کے لیے تو غالباً ذرا دیر پہلے فیصل آباد۔ ارجنٹ ٹیلی فون کال آئی تھی۔"

یوسف نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا "ہاں۔ وہ میری ہی کال ہوگی دراصل میرا شیڈول بری طرح گڑبڑ ہو گیا اور میں مصروف بھی بہت رہا۔ لاہور میں میر

سیکریٹری نے یہاں کا نمبر دے دیا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ میں یہاں آنے والا ہوں۔ بہرحال اس غیر ضروری زحمت پر میں معذرت خواہ ہوں۔"

"کال کرنے والے نے آپ کے لیے پیغام چھوڑا تھا اور ایک فون نمبر، اس درخواست کے ساتھ کہ آپ اس پر کال کرلیں" ملازم نے بتایا۔

یوسف نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی "اطلاع دینے کا شکریہ۔" اس نے نہایت خوش خلقی سے کہا "لیکن میں پہلے مس ذیشان سے ملنا پسند کروں گا، جوابی کال بعد میں کرلوں گا۔"

ملازم نے چاندی کی طشتری پر اس کا وزٹنگ کارڈ رکھا اور اندر چلا گیا۔

اس گفتگو کے دوران بین آئزک، یوسف کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک بالکل مختلف آدمی بیٹھا تھا۔ دو ہفتے کی قربت نے اس کے شخصی تضاد اور فرق کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی آدمی ہے، جس کے ساتھ وہ دو ہفتے سے رہ رہا ہے۔ یہ لہجہ، یہ پر وقار انداز، یہ طور طریقے، جو صرف بڑے لوگوں میں ہوتے ہیں۔ بین آئزک کے لیے شخصیت کی اتنی بڑی تبدیلی بے حد حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یوسف کے لیے یہ لہجہ، یہ انداز اور یہ طور طریقے، یہ سب کچھ محض ایک لباس کی طرح ہے، جسے کسی بھی وقت پہنا جا سکتا ہے اور کسی بھی وقت اتارا جا سکتا ہے.......... حسبِ ضرورت!

"تم بہت عیار ہو" بین آئزک نے ستائشی لہجے میں کہا "لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ تم سے ملنے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گے؟"

"وہ انکار نہیں کرے گی" یوسف نے بے حد یقین سے کہا "تم دیکھ نہیں رہے ہو، میں نے یہاں سب کو پہلے ہی سے بری طرح الجھا دیا ہے۔ ایسا کنفیوژن پھیلا دیا ہے، جیسے یہ ملاقات طے ہو۔ میں نے اپنی شناخت بھی ڈیولپ کرلی ہے۔ اب میں یہاں جانا پہچانا ہوں۔ ظاہر ہے، اپائنٹ منٹ ڈائری میں کہیں میرا نام نہیں ہوگا مگر میری تیار کردہ صورت حال میں اسے کسی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔ ویسے کیا تم نروس ہو رہے ہو؟"

"نہیں۔ میرے لیے نروس ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔"

یوسف نے سر کو اقراری جنبش دی۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بین آئزک کے لیے ستائشی تاثر تھا۔ "تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ ہم دشمن کی صفوں میں گھس چکے ہیں اور یہ جو بڑی عمر کی کنواری خواتین ہوتی ہیں نا، میں انہیں لبھانے کے

ہنر کا بادشاہ ہوں، اسپیشلسٹ ہوں ان کا۔ یقین کرو، یہ مس ذیشان میرے سحر سے نہیں سکے گی۔ جینا میلکم بعد کی بات ہے۔"

ملازم دوبارہ انتظار گاہ میں آیا۔ "مس ذیشان کو یاد نہیں کہ انھوں نے آپ ملاقات کا وقت دیا ہے۔" اس نے یوسف سے کہا "لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ آپ کے ا آنے والے کئی پیغامات ریسیو کر چکی ہیں۔ تاہم، کیونکہ آپ یہاں تشریف لے آئے ہیں لہٰذا وہ آپ سے ملیں گی۔ میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بن اسحاق! تم یہیں بیٹھو۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلوا لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ملازم کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ قالین اس قد دبیز تھے کہ قدموں کی چاپ ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوسف کو وہ سب کچھ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خوش ذوق تھا۔ اسے خوب صورتی سے عشق تھا۔ وہ ایسے ہ ماحول میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ میلکم پیلس کی آرائش کو دل ہی دل میں سراہ رہا تھا حالانکہ اس وقت وہ ذہنی طور پر خوف اور احساسِ فتح مندی کے درمیان معلق تھا۔ وہاں ہر طرف خاموشی تھی، رومان انگیز نیم تاریکی تھی۔ وہ ماحول تھا، جسے سرمئی اجالا یا چمپئی اندھیرا کہنے کو جی چاہے۔ بل کھاتے ہوئے زینے بے حد کشادہ تھے اور ان پر دبیز، خوش رنگ قالین بچھے ہوئے تھے۔ نیم روشن راہ داری میں بڑے بڑے کمرے تھے۔ ناکافی روشنی کے باوجود کمروں کی آرائش اور خوب صورت فرنیچر حسن اور امارت کا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی، کہیں دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی اور کانچ جیسی خاموشی ٹوٹ جاتی۔

وہ راہداری میں مڑے اور ملازم نے ایک بھاری **دروازہ** کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کمرے پر ایک تفصیلی نظر ڈالی، جس کے دور افتادہ حصے میں ایک بہت بڑی آفس ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر گویا روشنی کا سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ میز کے عقب میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کچھ کاغذات تھے۔ اس کی نظریں کاغذات پر جمی ہوئی تھیں۔ میز پر کئی ٹیلی فون تھے۔ ان کے علاوہ ایک ڈکٹیٹنگ مشین بھی تھی۔ کمرے کے دوسری طرف ایک بڑی کانفرنس ٹیبل تھی، جس کے گرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

"مس! مسٹر جوزف ڈیوڈسن" ملازم نے اعلان کیا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

س نے اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا تھا۔

یوسف کا دل ڈوبنے لگا۔ کمرے کی سیٹنگ ایک بہت بڑا نفسیاتی جال تھی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس جال میں پھنس گیا ہے۔ اسے عورت کی میز تک پہنچنے کے لیے اصا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس بچے کی طرح، جو اپنی کلاس ٹیچر کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پہلی بار ے احساس ہوا کہ کمرا بہت بڑا ہے۔

پھر وہ زیر لب مسکرا دیا۔ وہ جس کھیل کا آغاز کرنے والا تھا، وہ نفسیاتی جنگ ہی کی یثیت تو رکھتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حریف کے ہوم گراؤنڈ میں تھا اور اسے پہلے ہی رحلے میں اپنی برتری ثابت کرنی تھی۔

اس نے ٹائی کی گرہ درست کی اور بے حد پُراعتماد انداز میں میز کی طرف بڑھنے ا۔ اس نے میز تک کا تین چوتھائی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ میز کے عقب میں بیٹھی ہوئی ورت نے اپنا نازک کمانی والا چشمہ اتارا اور میز پر اپنے سامنے رکھ دیا۔ پھر اس نے سر ٹھما کر یوسف کو دیکھا۔

یوسف بری طرح ٹھٹکا۔ اس کے قدم جیسے فرش میں گڑ کر رہ گئے۔ اسے ایسا لگا، یسے وہ کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر رک گیا ہو۔ پہلے ہی مرحلے میں اسے شکست ہوئی ی۔ اس کے منصوبے کی بنیادیں لرز کر رہ گئی تھیں۔ اس نے منصوبہ بناتے وقت یہ ت پیشِ نظر رکھی تھی کہ اسے بھنچے ہوئے ہونٹوں والی، ادھیڑ عمر، گھٹی ہوئی، محرومِ محبت نواری عورت سے نبرد آزما ہونا ہے، جو شادی کے امکان کی ہر حد سے گزر چکی ہو گی۔ وہ نی طور پر ایک لڑکی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

لڑکی کا قد نکلتا ہوا تھا۔ اس کی رنگت چمپئی تھی۔ بھورے بال کٹے ہوئے تھے اور ندھوں تک جھول رہے تھے۔ چہرے کے نقوش میں دل کشی اور تیکھا پن تھا۔ آنکھیں فاف نیلی تھیں۔ وہ قیمتی کپڑے کا اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ مجموعی طور پر اس ا شخصیت میں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج تھا۔

یوسف دہل کر رہ گیا۔ وہ حسین لڑکی کسی مقبرے میں نمو پانے والے ادھ کھلے لاب کی طرح تھی... میلکم پیلس کے حوالے سے! اس میں حد درجہ نسوانیت تھی۔ سری طرف آنکھوں سے بے پناہ ذہانت جھلک رہی تھی۔ جبڑے کی ساخت خوب ورتی اور مضبوطی کی مظہر تھی۔ البتہ ہونٹوں کی بناوٹ کسی کمزوری کی دلیل تھی، جس ا وضاحت کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس طلسم کدے سے اس کی نظریں نکلیں تو اس حسین چہرے پر موجود تا میں الجھ کر رہ گئیں۔ اس کے ہونٹ سکڑے ہوئے تھے' جیسے وہ بدمزگی کے ناخوش احساس سے دوچار ہو۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی ت ان کا تاثر بھی خوش گوار نہیں تھا۔ وہ تیز نگاہیں تھیں' وجود میں اتر کر دور گہرائی تک لینے کی اہل نگاہیں۔ ان میں اس کے لئے تمسخر بھی تھا اور غصہ بھی' جیسے اس نے پ نظر میں اسے ناپسند کر دیا ہو۔

وہ حیران' ساکت کھڑے رہ جانے کا ایک لمحہ تھا.......... صرف ایک لمحہ۔ اس میں یوسف نے اپنے وجود میں برہمی اور ناپسندیدگی کی ایک تند لہر اٹھتی محسوس کی.... اس لڑکی کے لیے' جس نے ایک لمحے میں اس کے بہروپ کے نیچے اتر کر حقیقت د تھی جبکہ اس نے بڑی محنت اور توجہ سے وہ روپ دھارا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لڑ اس کی اصلیت بھانپ لی ہے' اس کے عزائم کی بو سونگھ لی ہے اور اب وہ اس کے م میں مدافعت کے لیے چوکس ملے گی۔ وہ اس کے عزائم اور ان کی نوعیت سے بے خ مگر یہ سمجھ چکی ہے کہ وہ اچھے نہیں ہیں۔

یوسف کو اپنے ساتھ شدید زیادتی کا احساس ہوا۔ اس نے ایک بے حا کاروباری مسٹر جوزف ڈیوڈسن کا روپ دھارا تھا' زندگی میں پہلی بار خود کو اہم ثابت کی کوشش کی تھی اور لڑکی نے ایک ہی لمحے میں اس کے چہرے سے اہمیت کی وہ کھینچ لی تھی۔ اب وہ پھر سے سڑکیں ناپنے والا' اسکیمیں سوچنے والا یوسف تھا' جسے نام کے آگے لگانے کے لئے کوئی حقیقی ولدیت میسر نہیں تھی.......... غیر اہم یوسف! کی دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ ذہین اور زیست کرنے کے ہنر سے واقف پاتھ پر چلنے والا یوسف' جسے ضروریات زندگی کے حصول کے لیے تماشے کرنے تھے۔ اسے ایسا لگا' جیسے اس کے بدن پر سے وہ نیا سوٹ اتر گیا ہے' جو اس نے بڑ سے اپنے لیے سلوایا تھا۔

اس عرصے میں' جب لڑکی کی مسحور کن شخصیت نے اسے گھما کر رکھ دیا تھا' ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ کسی تیز رفتار ہنڈولے میں بیٹھا ہے اور اسے دنیا کی ہر چیز گھ نظر آ رہی ہے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی' اپنی قوتیں مجتمع کرنے کی بھرپور کوشش اس نے دل ہی دل میں لڑکی سے کہا ٹھیک ہے لڑکی' تم نے مجھے چکرا دیا ہے' یہ درست ہے مگر یقین کرو' زیادہ دیر نہیں لگے گی' میں بھی تمہیں اسی طرح حیران کردا

ں رنگ میں گر گیا تھا۔ گنتی نو تک پہنچی تھی۔ یہ بھی درست ہے لیکن اب میں اٹھ کر ھڑا ہو گیا ہوں۔ اسکول اور کالج لائف میں باکسنگ کے مقابلوں کے دوران ایسا اکثر ہوتا ہا ہے لیکن بے بی' نو تک گنتی کے بعد جب میں کھڑا ہوتا ہوں تو اصل جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور میں چیمپئن رہا ہوں لڑکی.......... اب بھی ہوں..."

لڑکی نے نظریں جھکا کر اس کے وزٹنگ کارڈ کو دیکھا' جو اس کے سامنے میز پر رکھا ا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں۔ خاموشی کا طلسم ٹوٹا۔ لڑکی کو اپنی بہتر پوزیشن کا اندازہ ا۔ چنانچہ اس نے جارحانہ انداز اختیار کیا "مسٹر ڈیوڈسن! آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پنے وزیٹر کی الجھن محسوس کر لی تھی اور اس سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔ اس کے ال میں وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ وہ اس پر بھی خوش تھی کہ اس نے اس ناخواندہ مہمان ی شخصیت کی بیرونی تہ کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ ویسے بھی اسے زندگی میں اس طرح کی فتوحات ی ضرورت رہتی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی' جس نے زندگی کے دوراہے پر ایک بے ۔اہم فیصلہ کیا تھا.......... بلکہ اسے فیصلہ کرنا پڑا تھا' اور یہ احساس اسے اب تک ستاتا تھا ہ اس کا فیصلہ جرات مندانہ نہیں تھا۔ فیصلہ کرتے وقت وہ باحوصلہ ثابت نہیں ہوئی ی۔

اس کی زندگی جدوجہد میں گزری تو نہیں تھی مگر اس نے ابتدائی زندگی میں وجہد دیکھی بہت تھی۔ وہ اپنے باپ کے حوصلہ مندانہ فیصلے کی پیداوار تھی۔ اس نے پنے باپ کو زندگی سے لڑتے' معاش کے لیے زبردست جدوجہد کرتے دیکھا تھا جب کہ وہ روڑپتی باپ کا بیٹا تھا۔ صرف ایک جرات مندانہ فیصلے نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر ینک دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو جدوجہد میں مسلسل ناکام ہوتے اور ماں کو صبر رتے دیکھا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد فیصلے کا ایک کڑا وقت اس پر بھی آیا تھا..........

ر اس نے بڑی بے حوصلگی سے خود کو جینا میلکم کی ساتھی' سیکریٹری کی حیثیت سے اپنی م امنگوں' خوشیوں اور امکانات سمیت دفن کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے عوض اسے یش زندگی اور ابدی خوش حالی ملی تھی اور یہ نوید بھی کہ ایک روز سب کچھ اسی کا گا۔ آخر وہ جینا میلکم کی بھتیجی تھی' واحد رشتے دار۔ اس کے لیے اس نے راحیلہ ذیشان ے راحیلہ میلکم ذیشان بننا قبول کر لیا تھا' اگر صرف راحیلہ میلکم بننے کا حکم دیا جاتا تو وہ ے بھی قبول کر لیتی۔ اس نے بچپن میں عسرت دیکھی تھی اور اب عمر بھر اس کا سامنا ں کرنا چاہتی تھی۔

ماں باپ کی موت کے بعد پھوپھی کے سوا اس کا کوئی نہیں رہا تھا چنانچہ پھو اسے اپنی شفقت کے نہیں، دولت کے سائے میں لے لیا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس میں کچھ غیر معمولی صفات دیکھی ہیں.......... ایسی صفات جو اس کے لیے قا ہیں۔ ان میں ایک صفت وفاداری بھی تھی، جو جینا کے نزدیک عنقا تھی۔ اس کے وہ ایک ایسی چیز تھی، جسے صرف پیسے سے خریدا جا سکتا تھا، جو بلا قیمت کہیں نہیں م لیکن اس نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ اس کے بے وقوف مگر محبت کرنے والے بدنصیب کی اکلوتی بچی میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ دوسری صفت جو اسے اچھی راحیلہ کی غربت سے نفرت تھی اور وہ غربت سے خوف زدہ بھی رہتی تھی۔

جینا میلکم نے زندگی میں جو کچھ بھی چاہا تھا، خرید لیا تھا مگر وہ وفاداری او نہیں خرید سکی تھی۔ خادماؤں کی کمی نہیں تھی، جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھت لیکن اسے وہ بے لوث محبت اور خدمت گزاری کبھی میسر نہیں آئی تھی، جس کے صرف محبت اور وفا سے پھوٹتے ہیں۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی زندگی کا راحیلہ ہی پُر کر سکتی ہے اور پھر راحیلہ اس کی سگی بھتیجی تھی.......... اس کے خون۔ پھر بھی کاروبار، کاروبار ہوتا ہے۔ جینا نے بھانپ لیا تھا کہ قسمت نے ا موقع فراہم کیا ہے۔ وہ اس بچی کو تاحیات اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے، سونے کی ز باندھ کر اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔ ایک جاں نثار ساتھی، ایک دوست محبت کرنے والی ہستی کی حیثیت سے، سودا ہرگز مہنگا نہیں تھا۔

لیکن کاروباری جینا نے تمام تر اعتماد کے باوجود وفاداری اور محبت کو ناقابل بنانے کے لئے ہر حربہ آزمایا۔ اس نے قدم قدم پر راحیلہ کو پہلے عدم تحفظ کا احسا اور پھر ثابت کیا کہ یہ تحفظ اسے صرف وہی فراہم کر سکتی ہے۔

جینا نے راحیلہ کے سامنے دو راستے رکھے تھے۔ ایک تو تحفظ کا راستہ تھا، کی قربت سے مشروط تھا۔ وہ قبول نہ کرنے کی صورت میں جینا نے راحیلہ کو پیش کہ اس کی بھتیجی ہونے کے ناتے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ راحیلہ کو تعلیم حاصل ک موقع دے، جہاں تک راحیلہ چاہے لیکن اس کے بعد راحیلہ کو اپنے طور پر زندگی ہوگی۔

راحیلہ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پہلی پیش کش قبول کر لی تھی۔ اس نے دیکھا تھا اور جان لیا تھا کہ اپنے طور پر زندگی گزارنا بے حد جان لیوا کام ہے۔ اسے ا

تھا کہ یہ پیش کش قبول کر کے وہ اپنی نسوانیت سے دست بردار ہو رہی ہے۔ جینا کی زندگی میں اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں ہوگا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ صنفِ نازک کی حیثیت سے بقا کی جنگ لڑنا اس کے لیے بہت زیادہ دشوار ہوگا۔ چنانچہ اس نے جان بوجھ کر وہ مہنگا سودا کر لیا۔ اس نے پُرتعیش زندگی کے عوض نسوانی امنگیں اور چھوٹی چھوٹی غیر اہم خوشیاں، جو محرومی کے بعد بہت بڑی اور بہت اہم لگتی ہیں، تج دیں۔

اس وقت اس اجنبی مرد کا سامنا کرتے ہوئے وہ خود کو یہی یاد دلا رہی تھی، یہی باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔ وہ پُرتحفظ، پُرتعیش زندگی گزار رہی تھی۔ تاہم اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی محرومیوں اور اپنے غلط فیصلوں کا انتقام ان بدقسمت غرض مندوں سے لیتی ہے، جو کسی امید پر، کبھی دھوکا دے کر کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جینا میلکم کے دروازے پر آکھڑے ہوتے ہیں۔ اسے علم نہیں تھا کہ غیر شعوری طور پر اس نے طے کر لیا ہے کہ اپنے جیسی کسی قربانی کے بغیر کسی ضرورت مند کو جینا میلکم سے فیض نہیں پانے دے گی۔

وہ جینا میلکم کے فیض کدے کے دربان کی حیثیت رکھتی تھی۔

دوسری طرف یوسف کے ذہن میں بھی یہی خیال گردش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جینا میلکم کو اس سے بہتر دربان نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچتا بھی رہا اور خود کو اس جھٹکے سے سنبھالنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ جو لوگ درحقیقت جینا میلکم سے باضابطہ طور پر کسی کاروباری سلسلے میں ملنے آتے ہوں گے، وہ بھی راحیلہ میلکم ذیشان کے حضور خود کو بے بس محسوس کرتے ہوں گے۔ اسے اس بات کا کامل یقین تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ جب دربان کا یہ حال ہے تو صاحبِ دربار کیسا ہوگا۔ اس کے سامنے لب کشائی آسان تو نہیں ہو سکتی۔ کجا یہ کہ ایک ناموجود شے فروخت کرنا..........

اس نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ راحیلہ صرف ذہین ہی نہیں ہے بلکہ نسوانیت، جبلت اور وجدان کے خوف ناک ہتھیاروں سے بھی پوری طرح لیس ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ وہ کسی بھی مرد کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر سکتی ہے.......... اس کی قوتِ ارادی کو کمزور کر سکتی ہے، اس کی خود اعتمادی کو تباہ کر سکتی ہے۔ صرف اپنے خداداد حسن کے زور پر۔ اس کی چیلنج کرتی ہوئی آنکھوں میں، کہیں گہرائی میں دبی ہوئی، کچلی ہوئی فطری خواہشات نظر آتی ہیں، جو اسے یقینی طور پر مردوں کو ذہنی اذیت پہنچانے پر مجبور کرتی ہوں گی۔ اس کا ترشا ہوا حسین جسم چھوئے بغیر ہی پتھر کی

کسی مورتی کی طرح سرد محسوس ہو رہا تھا‘ جس کے سامنے کبھی کسی پجاری نے ناز پھول جیسے جذبوں کی نذر نہیں گزاری ہوگی۔ وہ اس حسین مندر کی طرح تھی‘ جسے آبا سے دور‘ بہت دور ہونے کی بنا پر پوجا سے پہلے ہی متروک قرار دے دیا گیا ہو۔ ا متروک عمارتوں پر جالے بڑی کثرت سے اترتے ہیں۔ وہاں حشرات الارض خوب پھ پھولتے ہیں۔ کوئی دیا جلانے والا نہ ہو تو سوج بھی روشنی بانٹتے وقت ایسی عمارتوں کو ن انداز کر دیتا ہے۔

یوسف پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی کو اس نے مکمل طور پر ناپسند ہے۔

بہرحال‘ راحیلہ کی نظروں نے اس کا جو ظاہری خول توڑ کر اسے جھٹکا پہنچایا تھا‘ ا کے اثرات زائل ہو رہے تھے۔ اسے احساس تھا کہ اسے کچھ مہلت درکار ہے۔ لڑ حملہ کر چکی تھی۔ اب اسے نہ صرف اپنا دفاع کرنا تھا بلکہ جوابی حملے کے لیے حکمتِ ع بھی ترتیب دینی تھی۔ اس کے لیے چند لمحون کی مہلت درکار تھی۔

”آپ کیسی ہیں مس ذیشان؟“ اس نے کہا۔ ”اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔“

”ضرور‘ ضرور۔ تشریف رکھئے۔“ راحیلہ نے خوش گوار آواز اور سرد لہجے کہا۔ وہ اپنے تضادات پر پوری طرح قادر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا چشمہ اٹھایا اور لیا۔ شیشے کے ٹاپ والی اس بہت بڑی میز کے عقب میں چشمہ لگانے کے بعد گویا وہ قل بند ہو گئی۔ وہ اس کی اپنی مملکت تھی‘ جہاں اس کی حیثیت ایک مطلق العنان حکمراں سی تھی۔

اس نے چشمہ لگا کر بے حد طمانیت سے نووارد اجنبی کو بہ غور دیکھا‘ جو یقینی طور کسی نہ کسی انداز کا لٹیرا تھا۔ وہ مطمئن تھی کیونکہ اس نے بے حد کامیابی سے انٹرویو شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ اب وہ اس کام کے بارے میں سوچ رہی تھی‘ اجنبی لٹیرے کی آمد کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس ادھورے کام طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ اجنبی کا وجود اور عدم وجود برابر ہو چکا ہے۔ وہ چارہ اب ہکلانے اور اپنی نامعقول قسم کی تجویز پیش کرنے کی ناکام کوشش کے سوا نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ لٹیرا ہونے کا تاثر چھوڑنے والا اجنبی کس قسم کا سیلز مین ہے اور کیا چیز فروخت کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال‘ چند منٹ بعد منہ لٹکائے باہر جاتا نظر آئے گا۔

یوسف اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”آپ مائنڈ نہ کریں تو میں سگریٹ سلگا لوں؟“ س نے راحیلہ سے کہا۔

”ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے بے مہری سے جواب دیا۔

یوسف نے سگریٹ نکالی اور بڑی نزاکت اور آہستگی سے اسے سلگایا۔ جلدی کی وئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے نکتۂ نظر سے تو ایک ایک لمحے کی مہلت بہت زیادہ اہم ھی۔ ہر لمحہ اس کے لیے خود کو سنبھالنے میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ آخر وہ میدان کا رانا کھلاڑی تھا۔

”سب سے پہلے تو مجھے یہ اعتراف کرنے دیجئے کہ آپ نے مجھے حیران کر دیا‘ اروں شانے چت کر دیا۔“ اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔ ”آپ کے بارے میں میرا صور بالکل مختلف تھا۔“

اس نے اپنی دانست میں درست سمت منتخب کی تھی۔ اتنی پرکشش لڑکی کے لیے ہی لائن مناسب تھی۔ پھر یہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ اس گفتگو پر لڑکی کے ردعمل سے س کے بارے میں سمجھنے میں مدد ملتی اور اپنی پوزیشن کے بارے میں اندازہ لگانا ممکن ہو اتا۔ لیکن لڑکی کے چہرے دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ س نے عجلت سے کام لیا ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس لڑکی کے روبرو آنے والے گوں کی اکثریت اس کے حسن کی قصیدہ خوانی ہی سے آغازِ کلام کرتی ہوگی۔ لڑکی کے تاثر سے صاف پتا چل گیا کہ لڑکی کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔ اگر اس کی کوئی کمزوری تھی تو کم از کم یہ ہرگز نہیں تھی۔

یہ بات ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تعریفِ حسن کی اس اپسندیدگی کا اصل سبب کیا ہے۔ انسان اپنی جس خوبی سے استفادہ نہیں کر سکتا‘ اس کے کر سے چڑنے لگتا ہے لیکن ظاہر ہے‘ یوسف یہ بات سمجھ نہیں سکتا تھا اور راحیلہ اسے مجھنا نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے اس شاعری سے محفوظ رکھیں مسٹر ڈیوڈسن۔ میں اس معاملے میں بے حد دذوق ہوں۔“ راحیلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ تاہم اندر ہی اندر وہ اس تاثر سے محظوظ ہو ہی تھی‘ جو اس کی شخصیت مردوں پر ہمیشہ مرتب کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی محظوظ ہوتی تھی گر اس بار اس حظ میں برہمی بھی شامل تھی۔ تمام تر شائستگی کے باوجود سامنے بیٹھا ہوا جوزف ڈیوڈسن اسے بدتمیز آدمی محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ شخص ہر اعتبار سے نقلی لگا۔

اس کی شائستگی اور وقار کے نیچے یقیناً بدتمیزی تھی۔ نفیس سوٹ اور ظاہری شخصی
اس کے لفنگے پن کے لیے لبادے کا کام کر رہی تھی۔ اس کی نسوانی جبلت نے اسے
کہ وہ ایک اداکار ہے' جو اس وقت ایک نہایت شریف آدمی کا کردار ادا کر رہا
بہرحال' وہ اس حد تک تو یقیناً شریف تھا کہ اسے ایک شریف' شائستہ طبع اور خوش
آدمی کا کردار ادا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے ک
میں کچھ نہ کچھ اچھائی تھی ضرور..........

"میں نے جو کچھ کہا تھا پوری سچائی سے کہا تھا۔" یوسف نے کہا "اس میں خو
کوئی پہلو نہیں تھا۔ البتہ میرے لہجے میں یا لفظوں میں شائستگی کی کمی رہی ہو تو اس
لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس ملاقات کے سلسلے میں جو کنفیوژن
ہوا ہے' میں اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ میری اور آ
ملاقات طے شدہ ہے۔"

"معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔" راحیلہ نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب
آہی گئے ہیں تو میں آپ کی آمد کا مقصد جاننا چاہوں گی۔"

یوسف کا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اُڑتے ہوئے لمحوں کی ڈور ہاتھوں
چھوٹی جا رہی تھی۔ بات کس انداز سے کہی جائے۔ میں مس میلکم کی خدمت میں ا
منصوبہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ یا یہ کہا جائے.......... می
ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا ہے.......... اور مجھے یقین ہے کہ مس میلکم اس سلسلے
جاننا اور سننا پسند کریں گی..........' وہ سوچتا اور اندر ہی اندر لرزتا رہا۔ اسے یقین تھا
سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی اسے آرپار دیکھ رہی ہے اور وہ ان تمام ہتھکنڈوں سے آگاہ۔
جو اس نے یہاں تک پہنچنے کے لئے آزمائے ہیں۔ اس صورت میں سوال یہ تھا کہ ا
نے اسے باہر ہی سے کیوں نہیں بھگا دیا؟

اس ایک لمحے میں اسے میلکم پیلس میں گزرنے والی زندگی کا ادراک ہو گ
راحیلہ میلکم ذیشان ایک راہ داری کی حیثیت رکھتی تھی۔ جینا میلکم تک پہنچنے کے لیے
شخص کو اس راہ داری سے گزرنا ہوتا تھا۔ یہ ذمے داری بہت بڑی تھی۔ اس کا صلہ خو
کتنا ہی بڑا ہو لیکن ذمے داری کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ راحیلہ کسی غلطی کا خطرہ مو
نہیں لے سکتی تھی۔ اگر کوئی شخص جینا میلکم سے ملنے آیا ہے تو اس سے ملنا اور اسے جا
راحیلہ کے لیے بے حد ضروری تھا۔ وہ بغیر پرکھے ملنے والے کو لوٹانے کا خطرہ مول نہیں

لے سکتی تھی کہ ممکن ہے ملنے والا واقعتاً ملاقات کا مستحق ہو.......... اور وہ ملاقات جینا میلکم کے مفادات کے لیے اہمیت رکھتی ہو۔ راحیلہ کا کام چھان پھٹک کرنا تھا اور اس کام کے لیے مرتکز اور غیر لچک دار جذبۂ فاداری کی ضرورت تھی۔ وہ ان دونوں عورتوں کے باہمی تعلق کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر کس چیز نے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ بہرحال اس نے اس سوال کو مستقبل کے کسی حوالے کے لیے محفوظ کر لیا۔

"مجھے مس جینا میلکم سے ملنا ہے" آخر کار اس نے کہا۔ "میری درخواست ہے کہ آپ میرا پیغام ان تک پہنچا دیں.........."

"پیغام کی نوعیت بتائیے۔"

اب سوچنے اور بہ غور دیکھنے کا کام راحیلہ کو منتقل ہو گیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شاید کوئی ایسی علامت نظر آجائے' جس سے پتا چلے' اس کا پہلا تاثر غلط تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ شخص کسی اہم کام سے آیا ہو۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اور وہ سیاہ تھیں۔ وہ ذہین آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن بے پروا بھی تھا۔ ٹھوڑی کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ ضدی ہو گا۔

اسی وقت یوسف نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ یوسف کو اس تبدیلی کا احساس فوری طور پر ہو گیا' جو لڑکی کے انداز میں بہت آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر رونما ہو رہی تھی۔ دوسری طرف راحیلہ دیکھ رہی تھی کہ وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل رہا ہے اور اب اس کے انداز میں خود اعتمادی نمایاں ہو رہی تھی' جو مردوں کی فطرت کا لازمہ ہوتی ہے۔ اب وہ اسے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا' وہ بتاتی تھیں کہ اب وہ اس حسن سے متاثر نہیں ہو گا' جس کے زور پر اب تک وہ مردوں کی خود اعتمادی کو درہم برہم کرتی آئی تھی۔

یوں ان کے درمیان نظروں اور پھر رسمی سے کاروباری جملوں کا تبادلہ ہوا لیکن پہلی بار راحیلہ کو احساس ہوا کہ یہ ایک طرح کی جنگ ہے' جس میں جوزف ڈیوڈسن نامی یہ مرد اس کا حریف ہے۔ ابتدا میں اس نے اسے دفاع پر مجبور کر دیا تھا لیکن اب وہ ایک بدلا ہوا آدمی تھا.......... اس کے حسن اور اس کے صنفِ نازک سے متعلق ہونے کے احساس سے بے نیاز۔ اب وہ اس سے مرعوب بھی نہیں تھا جبکہ عام طور پر وہاں آنے والے دوسرے مرد اس پہلے جھٹکے سے سنبھل ہی نہیں پاتے تھے۔

اب راحیلہ اس [illegible] جلد از جلد پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ وہ خوب رو اور پُرکشش

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تھا۔ اس کی کشش زمانۂ قدیم کے غیر ترقی یافتہ' بے رحم آدمی کی سی تھی' جسے کوئی خوف زدہ نہیں کرتی تھی' جو اپنے ہر خوف سے بہ زورِ بازو لڑنا جانتا تھا۔ راحیلہ بہت پہلے طے کر لیا تھا کہ وہ صنفِ قوی سے کبھی سمجھوتا نہیں کرے گی۔ اسے مرد سے' رومانس سے' جنسی کشش سے اور محبت سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

یوسف نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا کہ صورت حال بہتر ہو رہی مہلت حاصل کرنے' بڑھانے اور معاملے کو لٹکائے رکھنے کی کوشش بار آور ثابت ہو تھی۔ وہ پہلی بار اپنی برتری ثابت کر رہا تھا۔ حکمرانی مرد ہی کو زیب دیتی ہے۔

"بات سیدھی سی ہے۔" یوسف نے کہا۔ "آپ میرا کارڈ مس جینا میلکم کے پا لے جائیں اور ان تک میرا یہ پیغام لفظ بہ لفظ پہنچا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں چیز فراہم کر سکتا ہوں' جس کی انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ خواہش اور طلب ہے۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں مسٹر ڈیوڈسن!"

"نہیں مس ذیشان' میں بے حد سنجیدہ ہوں۔"

اس کی سنجیدگی نے راحیلہ ذیشان کو دہلا دیا۔ اس کے پاس جینا میلکم سے ملنے خواہش مند لوگ آتے رہتے تھے اور وہ ملاقات کے لیے عجیب عجیب جواز تراشتے تھے یہ اپروچ بالکل نئی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ راحیلہ ا لیے بھی پریشان تھی کہ یوسف کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی تھی اور طرح ط کے سوالات کی متقاضی تھی۔ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا.......... جینا کو وہ چیز فراہم کر جس کی طلب اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہے! وہ برسوں سے جینا میلکم کے ساتھ تھی ا ذہنی طور پر اس سے بے حد قریب بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جینا کی سب سے بڑ خواہش کیا ہے اور اس کا کیا سبب ہے۔ وہ ضدی اور خود سر تھی۔ اسے اپنی دولت پیار تھا اور وہ اپنی دولت پر دانت گاڑے ہوئے محکمۂ انکم ٹیکس کو شکست دینا چاہتی تھی ا اس کے لیے موت کے فرشتے کو شکست دینا لازمی تھا جو عملاً ناممکن تھا۔

تو کیا اس شخص نے' جسے اس نے پہلی نظر میں لٹیرا قرار دے دیا تھا' جینا میلکم کی کمزوری بھانپ لی ہے؟ وہ اسے خطرناک تو پہلے ہی قرار دے چکی تھی لیکن جینا میلکم سب سے بڑی کمزوری بھانپنے کے بعد تو وہ سو گنا خطرناک ہو گیا تھا۔ پھر اس نے سوچا نہیں ہو سکتا۔ موت ایک ناگزیر حقیقت ہے' جس سے مفر کی کوئی صورت ممکن نہیں زندگی بازاروں میں نہیں ملتی۔ ایسا ہوتا تو قارون آج بھی زندہ ہوتا..........

"مسٹر ڈیوڈسن! مجھے یقین ہے' آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کر رہے ہوں گے کہ میں نامہمل پیغام مس میلکم کے پاس لے جاؤں گی۔" اس نے نرم مگر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"جبکہ مجھے یقین ہے' آپ ایسا ضرور کریں گی۔"

راحیلہ نے اپنی پشت کرسی سے ٹکائی۔ "میں ایسا کیوں کرنے لگی؟"

"اس لیے کہ میری بات سچ ہونے کا امکان موجود ہے۔"

"مجھے افسوس ہے مسٹر ڈیوڈسن! آپ کو اس سے بہتر کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں ہموں سے کوئی دلچسپی نہیں اور ہمارا وقت بے حد قیمتی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ی بات ہے' جو آپ کے خیال میں مس میلکم کے لیے اہم ہو سکتی ہے تو وہ مجھے بتائیں۔ فیصلہ کرنا میری ذمے داری ہے کہ مس میلکم کو زحمت دی جائے یا نہیں۔ آپ کا وجودہ پیغام بے معنی ہے۔ میں اسے اتنی اہمیت نہیں دے سکتی۔"

یوسف نے دل ہی دل میں کہا' نیلی آنکھوں والی حسینہ' بڑی پُراعتماد بن رہی ہو الانکہ ہو نہیں۔ میں نے تمہارا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھتے اور پھر ٹھٹکتے دیکھ لیا ہے۔ تم نی محفوظ بھی نہیں' جتنا ظاہر کرتی ہو۔ آخر تم کس چیز سے خوف زدہ ہو؟

بہ آوازِ بلند اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "مس ذیشان' اگر وہ بات آپ سے متعلق تی تو میں آپ کو بتانے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتا لیکن یہ معاملہ ارجنٹ بھی ہے ر بے حد نجی نوعیت کا بھی ہے۔ میں اس سلسلے میں جو بھی گفتگو کروں گا' مس میلکم ہی ے کروں گا۔ اس سلسلے میں کسی اور سے کچھ کہنا مس میلکم کی اہانت کے مترادف ہے۔ پ مائنڈ نہ کیجیے گا۔ میں آپ کو وہ بات نہیں بتا سکتا۔"

شہد' مکھیوں کے لیے بہترین چارہ ہوتا ہے لیکن یوسف جانتا تھا کہ کبھی کبھی مکھیاں رکے کی بوتل میں بھی پھنس جاتی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شدید غصے کے عالم میں یہ ی کیسی لگتی ہے اور اس نے دیکھ بھی لیا..........

راحیلہ کے ہونٹ بھینچ گئے۔ جسم اس کمان کی طرح تن گیا' جس سے تیر نکلنے ہی الا ہو اور پہلی بار اس کے چمپئی رخساروں پر حقیقی سرخی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کی انگلی نطراری طور پر گھنٹی کے بٹن کی طرف بڑھی..........

"مسٹر ڈیوڈسن! انٹرویو ختم ہوا۔" اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ "یہ بات طے ہے کہ میں آپ کا مہمل اور احمقانہ پیغام مس میلکم تک نہیں..."

"ایسا نہ کریں۔" یوسف نے جلدی سے کہا۔ "کیونکہ اس صورت میں آپ کو

پچھتانا پڑے گا۔ مس میلکم کو پتا چل گیا کہ آپ نے کس اہم اور سنہرے موقعے کو ان دروازے سے واپس کر دیا ہے تو وہ آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔"

اس نے راحیلہ کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ تاثر ہو گیا لیکن یوسف دیکھ چکا تھا' راحیلہ کے گھنٹی کے بٹن کے قریب موجود ہاتھ لرزش ہے......... پھر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اب بار اس میں عجیب سی تہ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موجود چیلنج' برہمی' تمسخر' ذہانت اور دور تک دیکھ لینے صلاحیت' ہر چیز دھندلا گئی تھی۔

"مسٹر ڈیوڈسن! مجھے دھمکایا جانا پسند نہیں ہے۔" اس نے کہا لیکن اس کے میں زور نہیں تھا۔ اس نے گھنٹی کا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔

یوسف کو اپنے وجود میں ایک واضح آواز گونجتی محسوس ہوئی۔ فاتحانہ آواز...... لفظوں سے محروم آواز۔ وہ فتح مندی کے بے پناہ احساس سے سرشار ہو گیا۔ اس نے ب دشوار جنگ جیتی تھی اور بڑی شان سے جیتی تھی۔ راحیلہ میلکم ذیشان' جو شروع میں حد جارح اور ناقابل شکست نظر آئی تھی' اب شکست خوردہ تھی اور اس کا انداز مدافع تھا۔

وہ اٹھی اور یوسف کو پہلی بار یاد آیا کہ اس نے جینا میلکم کے بارے میں جو ریسر کی تھی' اس میں راحیلہ میلکم ذیشان کے بارے میں بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ میلکم پہلے میں اس کی پوزیشن' اس کی کمزوریاں' اس کی طاقت سب کچھ اسے یاد آ گیا۔ اس کی سم میں آ گیا کہ وہ کس چیز سے خوف زدہ ہے۔ سیدھی سی بات تھی' وہ دنیا میں کسی بھی چ سے اتنی خوف زدہ نہیں ہو سکتی تھی' جتنا اسے اپنی ملازمت سے محروم ہونے کا خوف تھا۔ جینا میلکم بہت کچھ تھی' اس کی ان گنت حیثیتیں تھیں۔ وہ پھوپھی بھی تھی لیکن س سے آخر میں۔ اس سے پہلے وہ ایک سخت گیر مالکن تھی!

"ارے نہیں۔" یوسف نے کہا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اندر سے سہمی ہوئی اس لڑکی پر پیار آ گیا۔ "میرا مقصد آپ کو دھمکی دینا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو آپ کو معاملے ک نزاکت اور اہمیت کے متعلق سمجھانا چاہتا تھا۔ آپ چاہیں تو میں آپ پر اپنا نکتۂ نظر تمام ت وضاحت کے ساتھ واضح کر دوں۔"

اس کے لہجے کی معقولیت اور دوستانہ انداز نے راحیلہ کو قبولیت کا موقع فراہم ک دیا۔ اس کے لیے وقتی پسپائی کا راستہ جیسے کھل گیا۔ اب اسے پسپا ہو کر اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا تھا' اپنی توجہ کو مرتکز کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ابتدائی فتح اس سے چھن گئی ہے' نہ صرف چھن گئی ہے بلکہ شکست میں تبدیل ہو گئی ہے۔

"دیکھیے مس ذیشان' میں صاف گوئی سے کام لوں گا۔" یوسف نے کہا "ممکن ہے' میرے بارے میں آپ بدترین شکوک رکھتی ہوں لیکن حقائق یہ ہیں کہ آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں یہاں کیا دینے' کس چیز کی تجارت کرنے آیا ہوں۔ جب تک آپ کے بدترین شکوک کی تصدیق نہ ہو جائے' اس وقت تک مجھے یہاں سے نکال دینا آپ کا غیر دانشمندانہ اقدام ہو گا۔ اس لیے کہ اگر بعد میں مس میلکم کو علم ہو گیا کہ میں یہاں کس لیے آیا تھا اور آپ نے کس طرح مجھے یہاں سے نکال دیا تو..." اس نے ایک لمحے توقف کیا اور اشارے سے نتائج کی نشاندہی کی کہ وہ صورت حال راحیلہ کے لیے گردن کٹنے کے مترادف ہو گی۔ پھر اس نے مزید کہا۔ "اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں' اب تک مس میلکم ہماری گفتگو کا کچھ حصہ ضرور سن چکی ہوں گی۔"

راحیلہ کے لیے یہ دھماکا تھا۔ اس بار وہ خود پر ذرا بھی قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی نظریں بے ساختہ چھت کی طرف اٹھ گئیں' جہاں یقیناً کوئی آڈیو باکس پوشیدہ ہو گا۔

راحیلہ کی نگاہوں کی اس دغابازی نے یوسف کے شکوک کی تائید کر دی۔ اسے پہلے ہی شک تھا کہ جینا میلکم جیسی عورت اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہنا یقیناً پسند نہیں کرے گی۔ اسے اپنے اسٹاف میں سے کسی سے بھی بے خبر رہنا پسند نہیں ہو گا اور اس نے اس سلسلے میں یقیناً کوئی اہتمام کر رکھا ہو گا۔ وہ جب جی چاہے' کسی کی بھی گفتگو سن سکتی ہو گی۔

"میں آپ سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ آپ میرا پیغام مس میلکم تک پہنچا دیں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ میرے بارے میں آپ کی جو بھی رائے ہے' آپ اس کا اظہار مس میلکم کے روبرو بھی کر سکتی ہیں۔ آپ ان سے یہ اپیل بھی کر سکتی ہیں کہ وہ مجھ سے ملاقات نہ کریں۔ اب یہ ان کی مرضی کہ وہ آپ کی بات مانتی ہیں یا اپنے تجسس کی تسکین کے لیے مجھ سے ملاقات کا فیصلہ کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں آپ بری الذمہ ہو جائیں گی۔ ذمے داری مس میلکم کی اپنی ہو گی کیونکہ فیصلہ ان کا اپنا ہو گا جبکہ آپ مجھے یہیں سے رخصت کر دیتی ہیں تو ذمے داری آپ کی ہو گی۔ ممکن ہے اس کے نتیجے میں آپ سب کچھ ہار بیٹھیں۔ مس ذیشان......... فیصلہ

کرتے ہوئے اپنی پوزیشن کو مدِ نظر رکھیں۔ میرا مشورہ ماننے ہی میں آپ کا مفاد ہے۔"

راحیلہ نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ دبلی پتلی لڑکی اب بہت بدلی بدلی رہی تھی۔ عورت پن رخصت ہو گیا تھا۔ سیکریٹری پیش منظر میں آگئی تھی۔ اس نے جھکا کر سامنے رکھے ہوئے پیڈ اور پنسل پر نظریں جما دیں۔ اب یوسف اس کے چہر تاثر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ وہ پیغام لکھوا دیں' جو مس میلکم تک پہنچوانا چاہتے ہیں۔" ا نے سپاٹ آواز میں کہا۔

یوسف نے اپنا پیغام دہرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زندگی کی سب سے خواہش پوری کرنے میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔"

کمرے میں' پیڈ پر پنسل کے چلنے کی نرم آواز کے سوا خاموشی تھی۔ پھر راحیلہ پیڈ تھاما اور ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے کمرے سے نکل گئی' جو پہلی نظر میں دیو ہی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ دروازہ اس کی کرسی کے عین پیچھے تھا۔

یوسف خود کو بے حد تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے طویل اعصابی جنگ لڑ تھی اور اب اس کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ اب وہ آگے کی سوچ رہا تھا۔ ابھی تو پہلے مرحلے سے گزرا تھا۔ اصل مرحلہ تو اب درپیش تھا۔ اس نے سوچا.......... کاش دونوں جنگوں کے درمیان وقفہ ہوتا اور ستانے کی مہلت مل جاتی لیکن مہلت بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ وہ خود کو یک جا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ راحیلہ میلکم ذیشان کو شکست دینے کا تصور اسے سہارا دے رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا اور راحیلہ نمودار ہوئی۔ اس نے یوسف کو اس طر دیکھا' جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو.......... جیسے کچھ دیر پہلے ان کے درمیان کوئی ذہنی معرکہ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے انداز میں بے گانگی تھی اور وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح پُراعتماد تھی' جینا میلکم کی کبھی نہ رکنے والی کاروباری اور ذاتی مشین کا اہم ترین پرزہ! وہ احکامات کی تعمیل کر رہی تھی۔ گویا اپنا فرض پورا کر رہی تھی۔ ذاتی جنگ کی اب کوئی اہمیت نہیں تھی۔

"مس میلکم کا کہنا ہے کہ ان دنوں وہ بعض اہم کمپنیاں اور کاروباری ادارے خریدنے میں بہت دلچسپی لے رہی ہیں۔ اگر آپ ان کمپنیوں میں سے کسی کی خریداری کے سلسلے میں اعانت کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ سے ضرور ملیں گی۔"

یوسف نے.......... وہ آپ سے ضرور ملیں گی.......... سن کر اپنا اندرونی جوش دبانے کی کوشش کی پھر بھی اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کے لیے یہی بہت کافی تھا۔ اس کا جینا میلکم سے ملنا ہی بہت تھا۔ اس کے بعد وہ اسے ہینڈل کر سکتا تھا۔ موضوع بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ جب کہ باہر نکالے جانے میں خاصی دیر لگتی ہے۔ اصل اہمیت تو مس میلکم سے ملاقات کی تھی۔

پھر بھی وہ خاموش رہا۔ اس کی چھٹی حس اسے سمجھا رہی تھی کہ کام اتنی آسانی سے ہو گیا ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ہے۔ جینا میلکم کے اس پیغام میں کہیں نہ کہیں اس کے لیے کوئی جال چھپا تھا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ جینا میلکم جیسے بڑے لوگوں سے معاملہ کرتے وقت ذہن کو وسعت دینا اور اپنی سوچ کو محدود ہونے سے روکنا بہت ضروری ہے۔

پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے راستہ نظر آگیا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اپنے وجدان کے اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے کرسی پیچھے دھکیلی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی' ایسے جیسے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ مس ذیشان۔ میرا خیال ہے' میں اپنا موقف یا تو واضح نہیں کر سکا یا مس میلکم کو اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بہرحال اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ آپ بہت مہربان ثابت ہوئیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" اس نے نہایت شستہ انگریزی میں کہا۔

راحیلہ بری طرح چونکی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جوزف ڈیوڈسن کا ردِ عمل اس کی توقع کے برعکس تھا بلکہ توقع نہیں' یقین کے برعکس کہنا چاہیے۔ "تو آپ مس میلکم کے اس پیغام کے جواب میں کچھ نہیں کہیں گے؟" اس نے پوچھا' لہجے میں حیرت تھی۔

"دیکھیے' مجھے بہلایا جانا پسند نہیں۔" یوسف نے سادگی سے کہا۔ "میں یہاں ایک مقصد کے تحت آیا تھا' جو ناجائز نہیں تھا۔ میں نے راست گوئی اور راست عملی کا مظاہرہ کیا۔ میرا کسی کمپنی یا کسی قسم کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میں کسی قسم کا کوئی ایجنٹ ہوں۔ اس قسم کے معاملات میں' میں بالکل کورا ہوں اور اس سلسلے میں مس میلکم کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر میرے پیغام کا یہی جواب ہے تو یہ معاملہ یہیں ختم سمجھا جائے۔ آئی ایم سوری۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا

اور اعصاب چیخ رہے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اب تک کی زند کوئی مرحلہ اسے اتنا گراں کبھی نہیں گزرا تھا۔ تاہم وہ بڑے باوقار انداز میں دروازے طرف بڑھتا رہا' جو اسے قسمت کا بند ہوتا ہوا دروازہ لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کے وجدان نے اسے دھوکا دیا ہے؟ کیا اسے جینا میلکم سے مل لینا چاہئے تھا؟

اس نے دروازہ کھولا اور پھر راحیلہ کی طرف مڑا۔ "تھینک یو ویری مچ م ذیشان۔ گڈ ڈے۔"

راحیلہ پیڈ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب واپسی کا نہ کوئی موقع تھا' نہ جواز۔ اب وہ کمرے سے رخصت ہونے کے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم باہر نکالتا' ایک آواز نے روک دیا۔ وہ آواز عقب سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"ایک منٹ نوجوان! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ بری طرح چونکا۔ پہلے تو وہ اسے فریب سماعت محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ مایوسی وجہ سے اس کے کان بجے ہیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ آواز حقیقی تھی اور وہ آوا راحیلہ کی نہیں تھی جب کہ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔

آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس بار وہ اوپر سے آتی محسوس ہوئی تھی اور اس کی گو اس کے چاروں طرف تھی۔

"راحیلہ!"

راحیلہ نے چھت کی طرف دیکھا' جس میں پوشیدہ لاؤڈ اسپیکر نصب تھا۔ "جی م میلکم؟"

"مسٹر ڈیوڈسن کو میرے پاس لے آؤ۔ میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"بہت بہتر مس میلکم۔"

کلک کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ راحیلہ نے کہا۔ "میرے ساتھ تشریف لایئے مسٹر ڈیوڈسن' میں آپ کو مس میلکم کے پاس لے جاؤں گی۔"

O-----O-----O

وہ ایک جہازی سائز کی میز کے عقب میں بیٹھی تھی۔ میز پر شیشے کا ٹاپ تھا۔ میز کے پیچھے دیوار پر اس کے باپ کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ میز پر ایک جانب ایک گلوب رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک بائبل رکھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ مسٹر ڈیوڈسن!" اس نے یوسف سے کہا "راحیلہ! میرے خیال میں تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔"

راحیلہ کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ ابھری اور وہ سیکریٹریل ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

یوسف اپنا لائحۂ عمل طے کرنے لگا۔ مس میلکم نے راحیلہ ذی شان کو موجود رہنے کی ہدایت دے کر اس کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ جینا میلکم سے تنہائی میں گفتگو کر سکے گا اور اس میں اس کے لیے آسانی بھی تھی لیکن یہاں تو ہر بات اس کی توقع کے خلاف ہو رہی تھی۔ چنانچہ جو کچھ اس نے سوچا تھا' وہ سب دوسری بار درہم برہم ہو گیا۔ جینا میلکم وہ عورت تھی' جسے ابدیت کی آرزو تھی۔ ہر آدمی میں کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی معاملے میں ایک بچہ چھپا ہوتا ہے' جو چاند کی طلب کرتا رہتا ہے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند اسے نہیں مل سکتا۔ ایسے بڈھے بچے' چاند کی خریداری کے چکر میں بہ آسانی بے وقوف بنائے جا سکتے ہیں۔ جینا میلکم کو ابدیت کے چکر میں پھنسایا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اس کی کمزوری تھی لیکن راحیلہ کی تو یہ کمزوری نہیں تھی۔

پھر جینا میلکم بھی اس کی توقعات کے برعکس ثابت ہوئی تھی۔ طویل زندگی کی خواہش اس کی کمزوری سہی لیکن وہ بے وقوف ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی عمر نے اس کی ہوش مندی کو کم کیا تھا......... کم از کم بظاہر تو ایسا نہیں تھا۔ وہ دبلی پتلی اور بوڑھی تھی لیکن اس کی شفاف آنکھیں اس کی عمر سے بے نیاز تھیں۔

یوسف کو احساس ہوا کہ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہا تھا' وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن وہ مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے دوران چند لمحوں میں یوسف نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لے لیا۔ داہنی دیوار پر جینا کی ماں کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ یہ بات صرف اس لیے کہی جا سکتی تھی کہ پورٹریٹ والی خاتون کی شباہت راحیلہ میلکم ذی شان میں تھی' جو اسے یقیناً اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہوگی۔ راحیلہ کی ماں کی تصویر وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

جینا نے اسے جس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا' وہ اس زاویے سے رکھی تھی کہ اس پر بیٹھنے کے بعد اس کا چہرہ جینا اور راحیلہ دونوں کی نگاہوں کی زد میں رہتا۔

"اطمینان سے بیٹھو نوجوان!" جینا نے کہا۔

"جی.......... میں ٹھیک ہوں۔"

پھر جینا نے جس انداز میں گفتگو کا آغاز کیا' اس نے اس کی شخصیت کو پوری عیاں کر دیا۔ "مسٹر ڈیوڈسن! راحیلہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مجھے کس سے ملنا ہے اور سے نہیں ملنا۔ تمہارے بارے میں راحیلہ کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے' اس کے با میں نے تمہیں ملاقات کا موقع دیا ہے۔"

"میں اس سلسلے میں مس ذیشان کو قصوروار نہیں ٹھہراؤں گا۔" اس نے صا گوئی سے کہا "انہوں نے میرے کئی جھوٹ پکڑے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے راحیل دیکھا اور شرارت سے مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ میلکم پیلس میں داخلے کے سلسلے میں ا نے جو ترکیبیں استعمال کی ہیں' راحیلہ نے جینا میلکم کو ان کے بارے میں تفصیل سے دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے لیے اعتراف کر لینے ہی میں بہتری تھیں۔

راحیلہ کے چہرے پر جھلکنے والی برہمی نے اس کے اندازے کی تائید کر دی۔ سا ہی اس نے جینا میلکم کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک دیکھی۔ بڑی بی محظوظ ہونے صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی تھیں۔

"لیکن وہ ترکیبیں میرے لیے ناگزیر تھیں۔" اس نے مزید کہا۔ "کیوں کہ آپ سے ملنا چاہتا تھا اور سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی تھی کہ میں کسی طرح آ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"ممکن ہے' آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔" راحیلہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "آج مجھے فیصل آباد سے کسی ذوالفقار نامی شخص نے فون کیا اور آپ کے لیے.......... پیغام او فون نمبر چھوڑا۔ میں نے اس فون پر رِنگ کیا تو پتا چلا کہ وہاں جوزف ڈیوڈسن نام کا کو آدمی کبھی نہیں رہا۔ میں آپ کے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ جب میں نے مس میلکم جوابی پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ نے بھرپور تاثر دیا کہ آپ واپس جا رہے ہیں.........."

"ہاں' تم بہت اچھے اداکار ثابت ہوئے۔" جینا میلکم نے شگفتہ لہجے میں کہا "بہرحال اب تمہیں میرے تجسس کی تسکین کرنی ہے۔ ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ میری زندگ کی سب سے بڑی اور شدید خواہش کیا ہے؟"

"زندہ رہنا.......... موت پر فتح" یوسف نے بے دھڑک کہا۔

اگر یوسف کو یہ توقع تھی کہ اس جواب پر جینا میلکم کا ردِ عمل بے حد شدید ہو گا

ے مایوسی ہوئی ہوگی کیونکہ جینا میلکم کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ چند لمحے ٹٹولنے والی نگاہوں ے اسے دیکھتی رہی' پھر بولی۔ "احمقانہ بات ہے۔ ہمیشہ تو کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ سچ ہے لیکن کوئی کسی کو اس امر کی خواہش کرنے سے نہیں روک سکتا۔"

"اور میرے بارے میں تمہارا تاثر یہ ہے کہ میری یہ خواہش ہے؟"

"مس میلکم.......... مرنا تو کوئی بھی نہیں چاہتا۔"

اسی وقت بٹن پینل پر روشنی ہوئی۔ جینا میلکم نے ٹیلی فون ریسیور اٹھایا اور چند لمحے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولی' "شکریہ۔ فی الوقت اس کی ضرورت ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دھیان نہ انے کہاں بھٹکا۔ اسے کمرے میں یوسف اور راحیلہ کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ ر وہ مڑی اور اس سے مخاطب ہوئی۔ اس بار اس کے لہجے میں کرختگی اور بے صبری ی۔ "مسٹر ڈیوڈسن! تم مجھے صرف یہی بتانا چاہتے تھے؟"

یوسف کو احساس ہو گیا کہ یہاں اسے تیزی سے کام لینا ہو گا کیونکہ زیادہ مہلت ہیں ملے گی۔ وہ تو اس پر بھی حیران تھا کہ اس سے انٹرویو لینے والے اس سے کیسے نمٹتے ں گے۔ بہرحال اسے یہ بھی یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس عورت کی ہمیشہ زندہ رہنے کی اہش کا ٹریگر موجود ہے۔ بس اس پر انگلی پڑنے کی دیر ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے ۔ دشواری صرف اتنی تھی کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا ہ انٹرویو ختم ہونے والا ہے۔

"آپ اپنے بارے میں میرا اصل تاثر جاننا چاہتی ہیں مس میلکم؟"

جینا میلکم نے اس بات کا جواب نہیں دیا لیکن اس کے کسی انداز سے یہ بھی ظاہر ں ہو رہا تھا کہ وہ اسے اس اظہار سے روکنا چاہتی ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ موت کے مقابلے میں سختی سے ڈٹی ہوئی ہیں اور ڈٹی رہیں ہے"

"اچھا؟ تمہیں یہ یقین کیوں ہے مسٹر ڈیوڈسن؟" جینا میلکم نے پوچھا۔ اس کے لہجے ما دلچسپی بھی تھی اور چیلنج بھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پوری طرح محظوظ ہونے کے موڈ ں ہے۔ انداز ایسا تھا' جیسے وہ دیکھنا چاہ رہی ہو کہ یہ جوزف ڈیوڈسن خود کو کس حد تک ق ثابت کر سکتا ہے۔

"کیونکہ موت کی صورت میں آپ ہر اس چیز سے محروم ہو جائیں گی' جس کے

لیے جیتی رہی ہیں۔ ہر وہ چیز جس سے آپ کو محبت رہی ہے' آپ سے چھن جائے گ عظیم کاروباری مملکت' جس کی بنیاد آپ کے والد نے رکھی تھی' یہ بھی آپ کے ہاتھ جاتی رہے گی۔"

جینا میلکم نے کوئی جواب نہیں دیا.......... کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

یوسف کو احساس ہو گیا کہ اب رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ داؤ تو کھیل ہی چک "محکمۂ انکم ٹیکس سے آپ کی سرد جنگ اب بیس برس پر محیط ہے۔ وہ اس ناگزیر نتیج منتظر ہیں' جسے موت کہا جاتا ہے۔ موت سے صرف اتنا ہی نہیں ہو گا کہ آپ اپنی د سے محروم ہو جائیں گی' بلکہ آپ کا دشمن محکمہ اس دولت کا بہت بڑا حصہ سمیٹ جائے گا۔"

جینا میلکم نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "تم اس کی فکر نہ کرو۔ انہیں ایک دھیل نہیں ملے گا۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

یوسف سوچ میں پڑ گیا کہ پاگل وہ خود ہے یا یہ بوڑھی عورت؟ اس نے ایک وار کیا۔ نسبتاً گہرا۔ "جی ہاں' آپ زندہ رہنے کے لیے لڑتی رہیں گی۔ آپ ہار نہیں گی۔ جب آپ چلنے کے قابل نہیں رہیں گی تو آپ گھسٹنے لگیں گی۔ ممکن ہے' آپ سے لگ جائیں اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ زندگی صرف آپ کی آنکھوں تک محدود رہ جائے۔ یعنی آپ کے تمام اعضاء مرجائیں سوائے آنکھوں کے۔ آپ سینے میں ز کی ہلکی سی برائے نام رمق باقی رکھنے کی جدوجہد کرتی رہیں گی لیکن بالآخر.......... ا کار.........."

راحیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "پلیز میلکم!" اس نے چیخ کر التجا کی۔ "اس شخص سے کہیں کہ یہ خاموش ہو جا پلیز.......... اسے مزید کچھ نہ کہنے دیں۔" وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔

جینا میلکم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ یوسف کی طرف متوجہ ہوئی "میں جاؤں گی۔" اس نے پرلطف لہجے میں کہا "میں یقیناً مرجاؤں گی بشرطیکہ تم نے.......... اپنے وعدے کے مطابق اس سلسلے میں میری مدد نہ کی۔ تمہارا کہنا غالباً یہی ہے کہ تم موت کے چنگل سے بچا سکتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر ڈیوڈسن کہ میں نے زندگی میں سے زیادہ عجیب کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا فروخت کرنا چا ہو؟ ابدی حیات کی کوئی گولی' کوئی شربت' کوئی جڑی بوٹی یا کوئی الیکٹرک بیلٹ؟ اور یہ

بتاؤ کہ اپنا یہ مشہورِ زمانہ راز مجھے کس قیمت پر بیچو گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ راز تو آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔" یوسف نے جواب دیا۔ پھر وہ اٹھا اور گھوم کر جینا میلکم کی میز کے پہلو میں پہنچا۔ جینا میلکم کی نظریں اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے بائبل اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے سوال کا جواب اس میں ہے۔ یہ کوئی پراسرار راز نہیں۔" اس نے کہا۔

جینا میلکم نے کرسی گھمائی اور اس کا سامنا کیا۔ "کیا بات کر رہے ہو؟" اس نے خفگی سے کہا "تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا کی کتاب کیا کہتی ہے؟" پھر اس نے ۱۹ویں الوہی گیت کا دسواں مصرعہ بغیر پڑھے دہرایا "ہمیں جو برس دیے گئے وہ تین بیسی اور دس ہیں۔" اس کی آواز بلند تھی اور اس میں وہ کھنک تھی' جو صرف جوانی سے مشروط ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی آواز بڑھاپے کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہے.......... "اور اگر کسی وجہ سے انہیں بڑھایا گیا تو چار بیسی تک پہنچیں گے لیکن اس کا انجام اذیت اور دکھ ہے۔ اور بالآخر ہمیں اُڑ جانا ہے۔"

"جی ہاں!" یوسف نے کہا "لیکن یہ سب کچھ ہمیشہ سے تو نہیں ہے۔"

"جینا میلکم نے اسے سخت نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا خرافات بک رہے ہو تم؟"

"ذرا آغاز زندگی کا باب نکال کر دیکھیے۔" یوسف نے کہا۔ نہ جانے کیسے اس کی آواز اور لہجے میں اس پادری کا انداز ابھر آیا' جس نے بے خبری میں اسے یہ نکتہ سمجھایا تھا۔ اس نے بائبل کے ورق پلٹے اور مطلوبہ باب نکالنے لگا۔ "آغازِ زندگی کا باب دیکھیے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر پڑھیے' جنہوں نے طویل عمریں پائیں۔ وہ تین بیسی اور دس برس نہیں بلکہ آٹھ آٹھ' نو نو سو برس جیے.........." وہ پڑھ کر سنانے لگا۔

اسے احساس ہو رہا تھا کہ جینا میلکم کی توجہ اس کی طرف نہیں رہی ہے۔ شاید وہ اسے پاگل اور وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتی رہی اور پھر بولی۔ "نوجوان.......... یہ سب کچھ تو میں بچپن ہی میں پڑھ چکی ہوں۔ یہ بتاؤ' اس سے میرے مسئلے کا کیا تعلق ہے؟"

یوسف کو ایسا لگا' جیسے اس کے جسم میں اس روز تقریر کرنے والے پادری کی روح حلول کر گئی ہے۔ وہ ہر بات بھول کر وہ سب کچھ دہراتا رہا' جو اس نے سنا اور پڑھا تھا۔ "جب ان لوگوں کو اتنی عمریں ملیں تو آپ کو کیوں نہیں.........."

ڈیسک پینل پر پھر روشنی چمکی۔ البتہ اس بار رنگ مختلف تھا۔ جینا میلکم کی انگلی خود

کار انداز میں حرکت میں آئی اور اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ بائیں سمت ایک دروازہ کہ نہ کھلنے کی صورت میں کہیں سے بھی دروازہ نہیں لگتا تھا۔ اس دروازے کے ذریعے جوان آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فلیپ میں بندھے ہوئے کاغذا ایک پلندہ تھا۔ اس نے یوسف کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ وہ سیدھا جینا کی طرف ب اس نے کاغذات جی سامنے رکھے اور جھک کر سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔

اچانک کھلنے والے دروازے سے یوسف کو دوسری طرف ایک بڑی دفتری کم کی جھلک دکھائی دی‘ جہاں اچھی خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ وہاں کچھ مشینیں تھیں۔ ان میں ٹیلی پرنٹرز بھی تھے اور ٹیلی گرافک آلات بھی۔

وہ حیران رہ گیا۔ جینا میلکم کے قریب‘ اتنے قریب اس کی کاروباری مملکہ کاروبار پورے زور و شور سے چل رہا تھا اور اگر وہ دروازہ نہ کھلا ہوتا تو وہ اس بات بے خبر ہی رہتا۔

جوان آدمی اور جینا کے درمیان سرگوشیوں کا تبادلہ ہوا۔ جوان آدمی وقتاً فوقتاً تفہیمی جنبش دیتا رہا۔ پھر اس نے کاغذات سمیٹے اور جس دروازے سے کمرے میں آیا اسی سے رخصت ہو گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی کمرے میں دوبارہ خاموشی کا راج ہو گیا۔ جینا میلکم پھر یو۔ کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ یہ بات یقینی تھی اب وہ تفریح لے رہی ہے۔

”ہاں تو نوجوان! یہ جو تم احمقانہ گفتگو کر رہے ہو‘ اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس یوسف سے کہا اور پھر راحیلہ سے مخاطب ہوئی ”راحیلہ میرا خیال ہے‘ تم ٹھیک ہی رہی تھیں۔ یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔“

اس بات کا یوسف پر ردِعمل شدید ثابت ہوا۔ اسے دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آ جینا میلکم ایک بزنس مشین ثابت ہوئی تھی‘ جس کے دماغ کا کیلکولیٹر صرف نفع نقصا کے اعداد و شمار ترتیب دے سکتا تھا جب کہ وہ خود کو ایک فن کار.......... تخلیق کار ثاب کر رہا تھا اور بزنس مشین اس کے تخلیقی ذہن کی فن کارانہ کاوش‘ اس سو فیصد قابلِ یقی کہانی کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے بری طرح غصہ آیا کہ آخر وہ یہاں کر کیا ہے.......... بھینس کے آگے بین بجا رہا ہے۔

وہ غصہ اس کی آواز میں اتر آیا۔ اس روز تقریر کرنے والے پادری کے پُریقی

پُراعتماد لہجے سمیت۔ ”میں آپ کو آپ کے دشمنوں پر فتح یاب ہونے کا طریقہ بتا رہا ہوں۔ آپ کو وقت سے لڑنے کا راز سمجھا رہا ہوں اور آپ اسے احمقانہ گفتگو قرار دے رہی ہیں۔ اپنے کاروباری دماغ کو کام میں لا کر ذرا حساب لگائیں کہ آپ مزید سو سال زندہ رہیں گی تو آپ کی یہ مملکت کتنی وسیع ہو جائے گی؟ سود در سود کے حوالے سے حساب لگائیے کہ آپ کی دولت کہاں سے کہاں جا پہنچے گی؟ ان لوگوں کا تصور کیجیے جنہوں نے کئی صدیوں تک زندگی کے پھول سے رس نچوڑا۔ اگر آپ کو بھی اتنی زندگی مل جائے تو آپ‘ جو ایک کاروباری جینئس ہیں‘ کاروباری دنیا میں کیا حشر برپا کریں گی اور پھر یہ بھی سامنے رکھیے کہ دور جدید سے جدید تر ہوتا جائے گا۔“

اسے بغیر دیکھے احساس ہو گیا کہ جینا میلکم اس کی باتیں نہیں سن رہی ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ کاغذ سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پنسل تھی اور پنسل کاغذ پر بہت تیزی سے تھرک رہی تھی۔

اس لمحے یوسف کو احساس ہوا کہ تمام تر ذہانت‘ اپنی شخصیت کی سفاکی کے باوجود جینا میلکم ایک انسان ہے۔ انسان جس میں کمزوریاں ہوتی ہیں.......... جو اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے اور کوئی کوئی خواہش ایسی ہوتی ہے‘ جس کے لیے وہ تمام ذہانت‘ ہوش مندی اور منطق و توجیہہ اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور جینا میلکم بھی اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود انسان تھی!

جینا نے تھوڑی دیر میں پورا حساب کر ڈالا۔ پھر اس کی پنسل رکی اور نظریں اٹھیں۔ اس بار اس کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی تھی۔ اتنی تیز روشنی جو آدمی کے اندر تک چکاچوند کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا تھا‘ جیسے اس نے جنت کی ایک جھلک دیکھ لی ہے.......... جیسے وہ مملکتِ افلاک کا جائزہ لے آئی ہے..........

لیکن جیسے ہی اس کی نظریں یوسف سے ملیں‘ آنکھوں کی اس روشنی پر گویا دھند اتر آئی۔

اس بار یوسف نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت وہ گویا منبر پر کھڑا تھا اور جینا میلکم اور راحیلہ میلکم ذیشان وہ عقیدت مند تھے‘ جو گزرے زمانوں کی گھن گرج کی بازگشت سننے آئے تھے۔ ”بائبل پر آپ کا ایمان ہے؟“ اس نے چیخ کر پوچھا۔ لہجے میں تحکم تھا۔ اس وقت وہ خود بھی اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

"بالکل ہے۔ یہ خداوند کا کلام ہے۔"

"تو آپ اس بات پر بھی یقین رکھتی ہوں گی کہ آدم نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا اور جنت میں شجرِ زندگی بھی تھا۔ پھر وہ دنیا میں آئے تھے۔ اس زمین پر چلے پھرے تھے۔ ان کی اولاد نے یہاں زندگی گزاری۔ طویل' بے حد طویل زندگی۔ ان میں سے بہت سے تو تقریباً ہزار ہزار سال زندہ رہے۔ انہوں نے اپنی نسل بڑھائی۔ ان کے بیٹے بیٹیاں پا پانچ سو سال زندہ رہے۔ یہ سب کچھ اس کتاب میں لکھا ہے۔"

"ہاں' یہ درست ہے۔ کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ممنوعہ پھل کھانے کی پاداش میں آدمؑ سے ابدی زندگی چھین لی گئی اور انہیں جنت سے نکال دیا گیا۔" جینا چند لمحے رکی جیسے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی "اور خدا نے کہا اب یہ اپنی معصومیت کھو چکا ہے۔ اب اسے نیکی اور بدی کو اپنے طور پر سمجھنا ہوگا۔ جاؤ اسے زمین پر پھینک آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اب یہ شجرِ زندگی کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس کا پھل بھی کھالے اور ابدی زندگی کا سزاوار ٹھہرے۔ یوں یہ زمین آباد ہوئی' جنت سے نکالے ہوئے آدمؑ کی نسل نے زمین کو آباد کیا۔"

"اور اس کے باوجود یہ امکان موجود ہے کہ آدم نے شجرِ زندگی کا پھل کھایا ہوگا۔" یوسف نے بہت تیزی سے حملہ کیا۔ "کیوں کہ انہوں نے ۹۳۰ سال کی عمر پائی اور ان کے بیٹے اور ان کے بیٹوں کے بیٹے.......... انہوں نے بھی نسلوں تک زندگی کا ذائقہ چکھا۔ وہ سب طویل العمری کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر وہ زمین پر ہر سمت میں بکھر گئے.........."

"یہ ممکن نہیں۔" جینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شجرِ زندگی تو باغِ عدن میں تھا۔ جب پہلے آدمی کو نافرمانی کی پاداش میں.........."

"شجرِ زندگی محض ایک علامت ہے۔" یوسف نے اسے خاموش کرا دیا۔ "یہ تو استعارہ ہے' زمین پر پائے جانے والے اثمار کا۔ میں بائبل کا حوالہ تاریخ کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ بائبل بحیثیت تاریخ' یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانوں نے روئے زمین پر بہت طویل عمر پائی۔ وہ اس زمین پر کئی کئی صدیاں جئے۔ وہ روایت بن گئے اس لیے کہ ہر باپ نے جہدِ بقا کی یادیں اپنے بیٹے کو سونپ دیں۔ ان کا بھٹکنا' ان کی گمراہی' خدا کی ان سے ناراضی.......... اور پھر ان کی یہ جدوجہد کہ وہ خاک سے اٹھیں اور آسمان تک پہنچیں' روٹھے ہوئے خدا کو منائیں۔ جب یہ سب کچھ لکھا گیا تو ان یادوں کے حوالے سے لکھا گیا' جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔ ان یادوں میں دیومالا بھی خلط ملط ہوئی لیکن یاد رکھیے' دیومالا کی ضرورت ان حقائق کو سمجھانے کے لیے پیش آئی' جنہیں کسی اور طرح واضح نہیں کیا جا سکتا۔ دیومالائی انداز ہی ان کے لیے آسان ترین پیرایۂ اظہار تھا.........."

جینا میلکم اب سنبھل کر بیٹھ گئی تھی اور بڑی توجہ سے اسے سن رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ مٹھیاں بھینچ گئی تھیں مگر اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ راحیلہ کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تمسخرانہ مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی تھی۔

یوسف اب اپنے ہی سحر میں گرفتار تھا۔ اس کی خود اعتمادی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

"اس زمانے کے لوگ بہت بڑے تھے۔ ہر اعتبار سے دیو قامت تھے۔ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو آمن کے دیس میں جانے سے منع فرمایا تھا' یہ کہہ کر کہ وہاں دیو بستے ہیں۔ جائنٹس.........."

"ان کا اشارہ روحانی طاقت کی طرف تھا۔" جینا میلکم نے احتجاج کیا۔

یوسف نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔ اب اس کی جرات کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اس وقت ہر خوف سے آزاد تھا۔ "ایسا نہیں ہے۔ اشارہ بلاؤں کی طرف تھا' جو ایک زمانے میں زمین پر آباد تھیں۔ دو سال پہلے میں نے مشرق وسطیٰ میں ایک مقبرے کی کھدائی کرنے والے وفد کے ایک سائنس داں سے انٹرویو کیا تھا۔ کھدائی کے دوران تین انسانی دانت برآمد ہوئے تھے۔ اس نے وہ دانت مجھے دکھائے۔ وہ ہمارے دانتوں سے کم از کم چھ گنا بڑے تھے۔ جبڑے کی ہڈی کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ وہ محض ایک ٹکڑا تھا مگر موجودہ انسانی جبڑے سے کہیں بڑا.......... وہ ان دانتوں سے مطابقت رکھتا تھا۔ سائنس داں کا کہنا تھا کہ جس شخص کے وہ دانت ہیں' اس کا قد کم از کم پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ اگر آپ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کو دیکھ لیں تو مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتیں۔ بنی اسرائیل آج تک نہیں بھولے۔" اس نے توقف کیا اور راحیلہ کو دیکھا لیکن وہ اس کے چہرے کے تاثر کو کوئی مفہوم نہ دے سکا۔

"سچائی" چند لمحے بعد اس نے بہ آواز بلند پکار کہا۔ "بائبل میں سچائیاں اور حقائق موجود ہیں۔ خدا نے گمراہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے طوفان بھیجا۔ اس طوفان کا ارضیاتی ثبوت آج بھی ہمارے مشاہدے کے لیے موجود ہے۔ خدا نے گمراہ انسانوں پر بارشِ سنگ کی' ان کے شہر تباہ و برباد کر دیے۔ وہ معتوب شہر آج بھی کھدائی کے بعد برآمد ہو رہے ہیں.......... پتھروں اور ریت کے نیچے دبے ہوئے شہر! ماہرینِ آثار

قدیمہ کی ہر دریافت روایتوں کی تصدیق کرتی ہے۔ ہر روایت' جو اس آسمانی کتاب موجود ہے۔" اس نے بائبل کو چھوتے ہوئے کہا۔

ڈیسک پینل پر پھر روشنی چمکی۔ یوسف کو یقین ہو گیا کہ جو سحر وہ تخلیق کر ر اب ٹوٹ جائے گا لیکن جینا کی توجہ اس کے ہاتھ کے اشارے اور میز پر رکھی بائب مرکوز تھی۔ اس نے ایک بٹن دبایا' جو غالباً یہ پیغام تھا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے ک پینل پر نمودار ہونے والی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ "ہاں نوجوان! کہتے رہو۔" اس "ان تمام باتوں سے میرے مسئلے کا کیا تعلق ہے؟"

یوسف نے بڑی صفائی سے گفتگو کی ٹوٹی ہوئی ڈور کا سرا تھاما۔ "پرانے آد زندگی کا حساب برسوں میں نہیں' صدیوں میں ہوتا تھا۔ انسانی تاریخ کا اولین ریکارڈ بتاتا ہے' جب کہ زندگی اس سے بھی پہلے جاری و ساری تھی۔ پھر عرصۂ حیات بتد سکڑنا شروع ہوا۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ اور ان کی اولاد نے زمین کو پھر آباد کیا۔ عرصۂ حیات سمٹتا رہا' پانچ سو' چار سو' تین سو اور پھر محض دو سو سال رہ حضرت ابراہیمؑ ۱۷۵ سال جیے۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاقؑ نے ۱۸۰ سال کی عمر پا حضرت یعقوبؑ کی عمر وصال کے موقعے پر ۱۴۷ سال تھی اور حضرت یوسفؑ جو سرزمین چھوڑ کر مصر چلے گئے تھے' انہوں نے محض ۱۱۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ کے بعد بائبل میں طویل العمری کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ کیوں؟ یہ تبدیلی آئی تو ا کوئی سبب بھی ہوگا۔ طویل زندگی اور تین بیسی دس برس کی عمر کے درمیان کوئی فاصل تو ہوگا............"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔" جینا نے خشک لہجے میں کہا۔

یوسف نے اپنی آواز دھیمی کر کے ڈرامائی تاثر ابھارا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا جو دل میں اتر جائے۔ "جی ہاں.......... وہ خطِ فاصل ہے طوفانِ نوح!" اس نے تقریباً سر میں کہا۔ "طوفان نے پوری زمین کو ڈبو کر رکھ دیا تھا۔"

جینا کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھری مگر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ "طوفان سے والوں میں حضرت نوحؑ سام اور حام تھے جو پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں زمینی پھل کھایا تھا' جو طوفان سے پہلے زمین پر موجود تھا۔ ان کے وجود میں طویل العم بیج نمو پا چکا تھا۔ طوفان کے بعد زمین چالیس دن تک زیرِ آب رہی اور اس کے

بھری۔ ان کے زادِ سفر میں ہر روز استعمال ہونے والی کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی' جو انسانی ریزگی کی روک تھام کرتی ہوگی' انسان کو موت سے دور رکھتی ہوگی۔ وہ چیز جسے سیلاب نے تباہ کر دیا ہوگا یا وہ کم ہو گئی ہوگی۔ اس کی رفتارِ نمو میں فرق آگیا ہوگا۔ وہ چیز' جسے بالآخر بھلا دیا گیا۔"

یوسف نے جینا میلکم کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی بات کا جینا پر کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔

پھر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا کہ وہ چیز مکمل طور پر ختم ہو گئی ہوگی۔ مادّہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ زمین سے کوئی چیز مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہوئی۔ آغازِ وقت سے اب تک کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا۔ سو وہ جو چیز بھی تھی' جو عنصر بھی تھا' اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کی شکل بدل گئی ہو۔ میرا خیال ہے' میں جانتا ہوں کہ اسے دنیا کے کس حصے میں تلاش کرنا چاہیے۔ اگر مجھے اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی تو آپ دنیا کی وہ پہلی خاتون ہوں گی' جو ناپیدا شدہ نسلوں تک کے درمیان زندگی گزار سکیں گی۔ میں ابدی زندگی کا نہیں' غیر معمولی حد تک طویل زندگی کا وعدہ کر رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے اسے ایسا لگا جیسے وہ جیت گیا ہے۔ جینا میلکم کی نظریں اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں کی طرف بھٹکیں' جو اس کی فنا نہ ہونے والی خواہش کی علامت تھیں لیکن جب اس نے نظریں اٹھائیں تو ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی خواہش کے سیلاب میں بہہ نہیں سکی ہے۔ وہ سحر سے بچ نکلی تھی۔

"بکواس.......... نری بکواس!" اس نے تند لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کمرے میں راحیلہ کا تمسخرانہ قہقہہ گونجا۔ وہ قہقہہ جینا میلکم کے تبصرے کی تائید کر رہا تھا۔

جینا نے فاتحانہ نظروں سے یوسف کو دیکھا اور بولی۔ "خدا نے زمانۂ آغاز میں انسان کو طویل عمر اس لیے عطا فرمائی کہ وہ اس کی زمین کو اپنی اولاد سے جلد از جلد بھر دے۔ انہوں نے زیادہ عمریں پائیں تو محض اس لیے کہ اسی میں خدا کی خوشی تھی۔"

یوسف نے اپنی مایوسی پر قابو پانے کی زبردست کوشش کی۔ ساتھ ہی اسے زبردست غصہ بھی آیا۔ بین آئزک نے بھی اسے یہی جواب دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ عقیدہ انسان کو ذہنی طور پر کس قدر غیر منطقی اور سہل پسند بنا دیتا ہے۔ وہ خدا کی حکمتوں پر اس

کی دی ہوئی عقل کی مدد سے غور تک نہیں کرتا حالانکہ خدا نے خود فرمایا کہ کائنات ک چیز پر غور کرو لیکن غور کون کرتا ہے۔ لوگ تو کلامِ خدا میں بھی صرف لفظ پکڑ کر بیٹھ ج ہیں۔ نہیں جانتے کہ لفظوں کے پیچھے معانی در معانی کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

"اور پھر اگر تمہاری بات مان لی جائے.........." جینا نے تولنے والی نظروں اسے دیکھتے ہوئے کہا "تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خیال کسی اور کے ذہن میں ب نہیں آیا، کسی اور نے اس چیز کی تلاش کیوں نہیں کی؟"

"اس لیے کہ کبھی کسی نے اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔" یوسف نے تند میں کہا "آپ اپنی ہی مثال لے لیں۔ آپ بائبل پڑھتی رہی ہیں۔ آپ کو بہت کچھ یاد ہے۔ آپ ذہین بھی ہیں مگر آپ کو یہ خیال کبھی نہیں آیا۔ اس کی وجہ جانتی ہیں آپ صرف اتنی سی بات ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آپ ذہانت کی نہیں، جذبات کی عینک لگا ہیں۔ آپ اس کی معرفت قبول کرتی ہیں۔ جو بات میں نے کہی ہے، ہر شخص پڑھتا ہے غور کرنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ آپ بتائیں.......... آپ نے پہلے کبھی اس چیز کو ا زاویۂ نظر سے دیکھا؟"

"ہرگز نہیں۔ یہ زاویۂ نظر مہمل اور لغو ہے۔"

"لیکن ممکن ہے اور اسے یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔" یوسف نے اصرار کیا۔

جینا میلکم کے چہرے پر چیلنج ابھرا۔ اس کی زندگی سے بھرپور آنکھوں میں سردمہ سی ابھری، جیسے کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیے جائیں۔ "راحیلہ.......... تمہارا اس سلسلے می کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا۔

اس لمحے راحیلہ میلکم ذیشان کو دیکھتے ہوئے یوسف کے دل میں ترحم کی ایک لہر اٹھی۔ کیوں کہ لڑکی کی آنکھوں میں اچانک بے پناہ خوف ابھر آیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ خطرناک صورت حال سے دوچار کر دی گئی ہے۔ عدم تحفظ اور عدم استحکام کا احساس ابھر آیا تھا۔ اس پر ایک بے حد مشکل فیصلے کی ذمے داری تھوپ دی گئی تھی۔

یوسف اس کی ذہنی کیفیت پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ لڑکی اس تھکن سے دوچار تھی، جو جینا میلکم جیسی عورت کے ساتھ گزارا کرنے کے بعد لازمی تھی۔ اس وقت وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جینا اس سوال کا کیا جواب سننا چاہتی ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی مختلف جواب نہ دے دے.......... ایسا جواب، جو جینا میلکم کی خواہش سے متصادم ہو۔

لیکن جب راحیلہ نے جواب دیا تو وہ اس کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا..........

راحیلہ نے لمحاتی ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ "میں محسوس کرتی ہوں کہ مسٹر ڈیوڈسن آپ کو جو چیز پیش کر رہے ہیں، اگر آپ کو اس کی خواہش ہے تو آپ وہ اپنے طور پر بھی حاصل کر سکتی ہیں.......... ان کے مدد کے بغیر۔"

تاہم اس جواب سے ایک بات کی تصدیق ضرور ہو گئی۔ راحیلہ کی ہچکچاہٹ اور احتیاط ثابت کر رہی تھی کہ جینا میلکم ایک ناممکن سی خواہش کے طلسم میں اس طرح گرفتار ہے کہ خلاف عقل فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ یوسف کے لیے یہ تصدیق ایسی تھی، جیسے کسی بے در کمرے میں کوئی دروازہ کھل گیا ہو۔

"تم نے ٹھیک کہا راحیلہ!" جینا کے لہجے میں اطمینان اور قطعیت تھی۔ "مسٹر ڈیوڈسن، تم نے تو مجھے کچھ بھی آفر نہیں کیا۔ اگر جو کچھ تم نے کہا، اس میں ذرا بھی صداقت ہے تو وہ بائبل کے حوالے کی وجہ سے ہے۔ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ تم میرے لیے اپنی ضرورت اور اہمیت ثابت نہیں کر سکے۔"

اب یوسف کے سامنے جینا کا اصل روپ آیا، جس کی بابت طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ اب وہ ایک بے رحم کاروباری عورت کے روپ میں سامنے آئی تھی، جس کے نزدیک ہر گفتگو نفع اور نقصان کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ اب وہ ہر چیز کو تولنے والی جینا تھی، جس کے ضابطۂ اخلاق میں بوقت ضرورت لٹیرا پن بھی کاروبار ہی کا ایک حصہ تھا، جو کسی بھی ایسی جائیداد، صنعت یا آئیڈیے پر قابض ہونا اپنا حق سمجھتی تھی، جسے کوئی قانونی تحفظ حاصل نہ ہو۔ اب، جب کہ آئیڈیا اس کے علم میں آچکا تھا، وہ سائنس دانوں اور ماہرین آثارِ قدیمہ کی ایسی ٹیم تشکیل دے سکتی تھی، جو جوہرِ حیات کی تلاش میں کرۂ ارض کا چپہ چپہ چھان مارے۔ وہ اب اس سلسلے میں سینکڑوں ہزاروں ماہرین کی خدمات حاصل کر سکتی تھی۔ اب اس کے نزدیک یوسف کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

"آپ کو یہ تو نہیں معلوم کہ آپ کے پاس مہلت کتنی ہے؟" یوسف نے اعتراض کیا۔

جینا میلکم کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ انٹرویو کا وقت ختم ہوا۔ "تھینک یو ویری مچ مسٹر ڈیوڈسن۔ آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ اس لڑکے سے نہیں مل سکیں گی۔" یوسف نے ترپ کا آخری پتا استعمال کیا۔ "اور اس کے بغیر آپ کامیاب ہو ہی نہیں سکتیں مس

میلکم...... میں آپ کی انسانوں کو سفاکی کی حد تک استعمال کرنے کی سرشت اور ا شہرت سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں مَیں بے وقوف ہوں کہ اپنے پتے آپ کے سامنے رکھ دوں گا؟ نہیں خاتون...... میں جانتا ہوں کہ سودے بازی لئے تُرپ کا اِکا اپنے پاس چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔"

اسے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ وقتی طور پر جینا میلکم پھر اس کی طرف متوجہ ہو ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر یوسف کو بہ غور دیکھا۔ "کون لڑکا؟" اس نے پوچھا۔ "یہ ک قسم کی گفتگو شروع کردی تم نے؟"

یوسف ہچکچایا۔ باطنی طور پر اسے افسوس ہونے لگا۔ اب اسے وہ جھوٹ بولنا تھا اس نے جینا میلکم کو پھنسانے کے لیے دو ہفتے پہلے گھڑا تھا۔ اس جھوٹ کے تانے با بُننے کے سلسلے میں بین آئزک کی مذہبی معلومات نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ اس کا تج تھا کہ جھوٹ آگے جا کر آدمی کے لئے بہت بڑا خطرہ بنتا ہے...... آسیب کی طرح پیچھا ک ہے اور کہیں نہ کہیں اسے چت کردیتا ہے۔ وہ عملاً اپنی تھیوری کے قابلِ عمل ہونے امکان ثابت کرچکا تھا۔ اب جینا میلکم کو اسے قبول کرلینا چاہئے تھا۔ ایسی صورت میں کھیل، جو وہ کھیل رہا تھا، فن کارانہ ثابت ہوتا۔ اس صورت میں بین آئزک کا وجود ا کہانی میں ایک غیر ضروری کردار کا سا ہوتا، جسے وہ بڑی بے رحمی سے، بغیر ہچکچائے کہا سے خارج کردیتا...... کسی کامیاب مُدیر کی طرح، جو اس نے بہت دیکھے تھے۔

وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور آگے کی جانب جھکتے ہوئے اس نے جینا میلکم کی آنکھو میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر اس نے مستحکم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "بین آئزک گیلیلی نے نفتالی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے...... انسانوں کی بے حد قدیم نسل سے۔ ا نسل سے جس کا تذکرہ آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ برگزیدہ لوگوں کی نسل ہے، جن نے خدا کی آواز سنی اور اس کے احکامات پر عمل کیا۔ جن کے پاس شجرِ زندگی کا بچا کھ پھل آج بھی موجود ہے۔"

جینا میلکم کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔ اس کے تنے ہوئے عضلات ڈھی پڑ گئے اور انداز میں وہ پہلے جیسا اعتماد نہیں رہا۔

"بین آئزک ہیزر کی ان پہاڑیوں کا باسی ہے، جن کے قدم میروم کا پانی چومتا ہے۔ وہاں اس کا آبائی قبیلہ آباد ہے، جو آغازِ تاریخ سے اب تک پہلے ہی جیسا ہے اور جس دورِ جدید کی کسی تبدیلی کو نہیں اپنایا ہے۔"

"اس سے میرا کیا تعلق ہے؟"

یوسف کچھ اور آگے جھک گیا۔ "میں نے عرض کیا نا کہ طوفان نوح کے بعد شجر ندگی فراموش کردیا گیا لیکن پوری طرح نہیں۔ بین آئزک کے اجداد کی تاریخ گواہ ہے لہ ان کا ایک بزرگ بارزی لئی ۵۱۲ء تک زندہ تھا لیکن یہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کب را ہوا اور اس کی عمر کتنی ہے۔ وہ ان دنوں کی باتیں کرتا تھا جن کے متعلق اس کے قبیلے لے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ایک رات طوفانی بارش میں وہ گول گومتا کی پہاڑی پر ل قدمی کر رہا تھا کہ اسے تین مصلوب لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک کے سر پر انوں کا تاج تھا۔"

جس دوران وہ بول رہا تھا، جینا میلکم کی شخصیت میں تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ تبدیلی وہوم سی تھی لیکن اسے بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا تھا اور یوسف نے محسوس کر بھی لیا۔ ب وہ برف کی طرح سرد اور فولاد کی طرح ناقابل شکست عورت نہیں تھی۔

یوسف کو اپنے جسم میں سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگر دولت بنانے والی یہ مشین، قابل شکست قوت ارادی کی مالک، بے رحم حسابی ذہن کی حامل یہ ہستی، جس نے کچھ دیر لے ایک مستحکم اور ممکن الثبوت نظریے کو مسترد کردیا تھا، اس احمقانہ اور بے بنیاد جھوٹ و قبول کرلیتی ہے تو یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہوگی! یہ تصور ہی اس کے لئے ہیجان انگیز تھا۔

"یہ لڑکا کون ہے، جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو؟" جینا نے پوچھا۔

"اس کی رگوں میں اس بارزی لئی کا لہو دوڑ رہا ہے، جو مسیح کے مصلوب ہونے کے پانچ سو سال بعد موت سے ہمکنار ہوا۔"

جینا کی آنکھوں میں واضح طور پر طمع کی چمک نظر آئی۔ اس کی قابضانہ فطرت ؤری طرح بیدار ہوگئی تھی۔ اس کا حسابی ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں لی بند مٹھیوں کی طرح، یوسف کے جھوٹ کو اپنی مٹھی میں دبوچ رہا تھا۔

"لیکن مس میلکم، آپ اسے نہیں خرید سکتیں۔" یوسف نے بے حد ٹھہرے دئے لہجے میں کہا۔ "جب وہ مجھے ملا تو بھوکوں مر رہا تھا۔ اس پر میرے احسانات ہیں۔ یرے بغیر وہ آپ کے قابو میں نہیں آئے گا۔"

"اس کی عمر کتنی ہے؟"

"کون جانے! مجھے تو وہ وقت اور عمر سے بے نیاز لگتا ہے۔"

جینا کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی اور یوسف سوچتا رہا کہ کہیں اس نے معقولیت کی حد

تو عبور نہیں کرلی۔ اگر اس کی جگہ بین آئزک ہوتا تو اتنے رواں جھوٹ بولنے ہی اس کا دل پھٹ جاتا۔

"تین مصلوب لاشیں' جن میں سے ایک کے سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔" ج سرگوشی میں دہرا رہی تھی۔ پھر اس نے یوسف سے پوچھا۔ "اس وقت وہ نوجوا ہے؟"

"وہ میرے ساتھ آیا تھا۔ انتظار گاہ میں بیٹھا ہے۔"

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" جینا میلکم نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم مجھے ا ملوا سکتے ہو؟"

"جی ہاں مس میلکم' کیوں نہیں؟" یوسف نے کہا اور راحیلہ ذی شان کی مڑا۔ "مس ذی شان! آپ اسے بلوا سکتی ہیں۔ بین آئزک اس کا نام ہے۔"

راحیلہ نے ریسیور اٹھایا۔ مگر اس کے چہرے پر اپنے لئے برہمی' حقارت اور نفرت کا تاثر دیکھ کر یوسف بری طرح دہل گیا' حالانکہ راحیلہ ذی شان کا ردعمل ا لئے خلاف توقع نہیں تھا۔

○-----○-----○

انتظار گاہ میں بین آئزک خود سے بحث کر رہا تھا' لڑ رہا تھا۔ اس کے سا راستے تھے۔ وہاں رک کر اس فراڈ کا تماشا اور اس کے نتائج دیکھے' جس کے بار اسے یقین نہیں تھا کہ یہ ممکن ہے۔ اسے یہ بھی ناممکن معلوم ہو رہا تھا کہ یوسف رسائی جینا میلکم تک ہو سکے گی۔ کسی بھی لمحے وہ منہ لٹکائے بے نیلِ مرام واپس آسکتا دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ چپ چاپ یہاں سے نکل جائے اور پورٹ کا رخ کرے..... قسمت آزمائی کرے۔ ممکن ہے' کسی ایسے جہاز پر کام مل جائے' جس کے کپتان کو کام سے دلچسپی ہو.......... جو خطرناک نوعیت کے سوال نہ کرے اور جسے کاغذات س کوئی غرض نہ ہو۔

اس کے لئے یوسف کو چھوڑ بھاگنے میں افسوس کی کوئی بات نہیں تھی۔ ا زندگی ایک مسلسل جنگ تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ جنگ میں سب کچھ جائز۔ سب سے زیادہ اہم چیز اپنی بقا ہے اور پھر یوسف نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا تھا یوسف کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ یوسف بھی اس جیسا ہی تھا۔ تھوڑے سے کے ساتھ.......... اسے دیکھ کر بین آئزک کو ایسا لگا تھا' جیسے وہ کسی اترے ہوئے آ

ے مقابل کھڑا' اس میں اپنا بے ہنگم' بدنما اور مسخ شدہ چہرہ دیکھ رہا ہو۔ بہرحال فرق اپنی جگہ' رزم گہہ زیست کے دونوں جنگجوؤں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

یوسف کا ساتھ چھوڑنے میں تاسف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں غرض کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کے بغیر ہی یوسف کا کام بن گیا تو وہ اسے ملے بغیر ہی یہاں سے نکلوا دے گا اور اصول بقا کے تحت اس کا یہ عمل ناجائز بھی نہیں ہوگا۔ خطرناک پہاڑوں کو سر کرنے والے' چوٹی کے سفر کے دوران ضرورت پڑنے پر ہر نیم ضروری اور بعض اوقات ضروری بوجھ تک سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ناگزیر اور اہم ترین بوجھ' جس سے نجات حاصل نہیں کی جا سکتی' صرف اپنا وجود ہوتا ہے۔

لیکن دوسری طرف اسے یہ ان جانا احساس بھی ہو رہا تھا کہ جنگ اور خواری کے دن تمام ہوئے۔ اب آسائشات اس کی منتظر ہیں اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے پیش ندی کی پوزیشن میں آگیا ہے۔ آبائی وطن کا تصور ہی اس کے لئے بے حد خوش کن تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا کام بے حد دشوار ہے اور وہ بے حد مشکل صورت حال ے دوچار ہے۔ یوسف جو کچھ کر رہا تھا' وہ اخلاقی اعتبار سے درست نہیں تھا مگر اس سے ے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ یوسف کو کس حد تک استعمال کر سکتا ہے۔

اس کے انداز فکر میں نہ تو خود ترسی تھی اور نہ شیطنت۔ وقت نے اسے اس نداز میں تربیت دی تھی کہ وہ لوگوں اور واقعات کو جذبات کے نہیں بلکہ اپنی ضروریات ر حقائق کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ اسے خدشہ تھا' ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ جب سف اسے اپنی اسکیم کے لئے غیر ضروری سمجھنے لگے۔ اس صورت میں وہ ان تمام ولتوں سے محروم ہو جائے گا' جن کا یوسف نے وعدہ کیا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی یا انہونی ت نہیں تھی۔ ویسے وہ یوسف کو کسی حد تک پسند کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی وجہ یوسف ی صاف گوئی اور ریاکاری سے پاک رویہ تھا۔ وہ بغیر ضرورت کے چہرے پر نقاب ھلنے کا عادی نہیں تھا۔ جبکہ بین آئزک نے ایسے ایسے پیٹ بھرے دیکھے تھے' جنہیں یا کی تمام تر نعمتیں میسر تھیں اور وہ پھر بھی ریاکار تھے۔ وہ صرف لوگوں کو مسخر کرنے کے ئے' خود کو تمام تر انکسار اور عاجزی کے ساتھ بہتر و برتر ثابت کرنے کے لئے اپنے چہروں ینکڑوں نقاب چڑھائے رکھتے تھے۔ نقاب کے نیچے سے نقاب اور اس کے نیچے سے

ایک اور نقاب.......... پھر ایک اور نقاب اترتا چلا آتا تھا۔ بین آئزک کے نزدیک یو ایسے لوگوں سے بدرجہا بہتر تھا۔

البتہ اس میں اور یوسف میں ایک فرق تھا۔ یوسف دولت کے پیچھے بھاگ کیوں کہ دولت اس کی محرومیوں کا ازالہ کر سکتی تھی۔ جبکہ اس کا اپنا مسئلہ بے وطنی دولت سے انسان وطن نہیں خرید سکتا۔ یہ بات یوسف نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وطن اہمیت رکھتا ہے.......... بالکل گھر کی طرح۔ یہ اور بات کہ وطن میں آدمی کو گھر سے اہم کچھ نہیں لگتا۔ وہ وطن کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتا۔ یوسف بے گھر تھا مگر بے نہیں تھا۔ بے وطنی کا عذاب تو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جو بھری دنیا میں قومیت اور تش سے محروم ہوں۔

سو اس کا مقصد کسی نہ کسی طرح وطن پہنچنا تھا۔ وطن کی خدمت تو وہ برسوں کر رہا تھا لیکن اب وہ خاک وطن کو چومنا چاہتا تھا۔ زمین کا ہجر دکھ بن کر اس کے رگ پے میں اتر گیا تھا۔ وہاں پہنچنا کچھ دشوار نہیں تھا مگر اسے اپنی جدوجہد کے پیش نظ آداب کا خیال بھی رکھنا تھا اور آداب سے گراں بار زنجیر کوئی اوز نہیں ہوتی۔ یہ ز قدم اٹھنے ہی نہیں دیتی۔

اسے یاد تھا کہ یوسف نے اسے اشارتا دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس کی مرضی مطابق نہیں چلا تو وہ کام کو اس کے متعلق بتا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھ یوسف ایسا کر سکتا ہے اور اس میں شکایت کی بھی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ وہ ز کے بارے میں کسی خود فریبی میں مبتلا نہیں تھا۔

وہ یوسف کے اندر جانے کے بعد انتظار گاہ میں اکیلا بیٹھا انہی سوچوں سے رہا۔ وہ ایک اچھے جنگ جو کی طرح حساب لگاتا رہا کہ اس کا یہاں موجود رہنا اور یوسف ساتھ دینا اس کے لئے کس حد تک ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے خیالات کی رو اندر موجود اس عورت کی طرف مڑ گئی، جس سے ملاق یوسف کے لئے بے حد اہم تھی۔ وہ اس کے لئے بھی تو اہمیت رکھتی تھی۔ وہ اس لئے جنت کے اس دروازے کی چابی کی حیثیت رکھتی تھی، جس کی اسے عرصے سے تھی۔ یوسف نے اسے ایک بہت بڑی مکڑی قرار دیا تھا جس نے اپنے گرد دولت کا بے مضبوط اور ناقابل شکست جالا بن لیا تھا، جو اپنے محفوظ قلعے میں بیٹھی کسی بھی ایسے شکا منتظر رہتی تھی، جس کی رگوں میں خون کے بجائے دولت دوڑ رہی ہو تاکہ وہ اس پ

اور وہ تمام دولت چوس لے۔ اس حساب سے وہ غذا اور انسان، دونوں کی دشمن اور مجرم تھی۔ اس اعتبار سے اسے لوٹنا کوئی بری بات نہیں تھی۔

اس نے اس عورت کے بارے میں مختلف انداز سے سوچنے کی کوشش کی۔ وہ ایک ایسی عورت بھی تو ہو سکتی ہے، جو اپنی دولت کی اسیر ہو اور اس اسیری کی وجہ سے اس ناگزیر لمحے کا سامنا کرنے سے خائف ہو، جو اسے اس کی عمر بھر کے منافع سے محروم کر ے گا اور جس کی وجہ سے اسے اس دنیا سے اس طرح خالی ہاتھ واپس جانا پڑے گا، جس طرح وہ اس دنیا میں آئی تھی۔

پھر اس نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ اوپر کیا ہو رہا ہے؟ کیا یوسف اور وہ ورت سر جوڑے بیٹھے کوئی سازش کر رہے ہیں؟ انتظار گاہ میں صرف اتنی روشنی تھی کہ سے اندھیرا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے اتنے بھاری تھے کہ نہ ان میں سے روشنی گزر سکتی تھی اور نہ ہوا انہیں ہلا سکتی تھی۔ چنانچہ کمرے ں آواز کے نام پر پردوں کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ انتظار گاہ سے ہر نکلے۔ تیز حدت آمیز دھوپ سے آنکھیں ملائے، تازہ ہوا کی روشنی پھیپھڑوں میں تارے اور نیل گوں آسمان کو اپنے وجود میں سمیٹ لے۔

وہ کچھ دیر گومگو میں مبتلا کچھ سوچتا رہا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ہر طرف ناٹا اور سکوت تھا۔ کبھی کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سکوت کی چادر کو تار تار کرتی۔ یسے میں وہ عظیم الشان مکان آسیب زدہ محسوس ہونے لگتا۔

اسے اپنی جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹکا.......... اس نے یب ٹٹولی، وہ اخبار کا وہ مڑا تڑا صفحہ تھا جس پر جینا میلکم کی تصویر اور انٹرویو شائع ہوا تھا۔ ل نے اخبار جیب سے نکالا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پردہ ذرا سا سرکایا۔ ھوپ تیزی سے کمرے میں لپک آئی لیکن کمرے کے محض ایک گوشے کو روشن کر سکی۔ ل نے جینا میلکم کی تصویر کا جائزہ لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے بوڑھی جینا میلکم کے چہرے کے قوش اسے پہلے ہی ازبر ہو چکے ہیں۔ جینا کی آنکھوں میں عجیب سی شعلگی تھی، جو اس ا شدید برہمی اور ضدی پن کی رہین منت تھی۔ اس کے سر کی اٹھان اس کے غرور کی ماز تھی۔ لیکن اسے پہلی بار جس چیز نے متاثر کیا تھا، وہ یہ تھی کہ وہ اپنے ہر انداز سے خوش معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ تصویر انسان کے ہر انداز کو ظاہر کرنے سے معذور ہوتی ہے پھر بھی وہ تصویر دیکھ کر صاحب تصویر کے ناخوش ہونے کا احساس شدت سے ابھرتا

تھا........ بشرطیکہ دیکھنے والا اسی کی طرح حساس ہو۔ اس وقت بھی تصویر دیکھتے ہو۔ احساس شدت سے ابھرا۔

اس بار تصویر دیکھ کر اسے ایک اور احساس بھی ہوا......... شناسائی کا ا اسے ایسا لگا' جیسے وہ اس عورت کو برسوں سے جانتا ہے۔ اسے جینا میلکم کے چہر کرخت خطوط ماضی میں جاتے' نرم ہوتے محسوس ہوئے اور ان نرم خطوط میں ا لئے اجنبیت بھی نہیں تھی۔

اس نے خود کو یاد دلایا کہ یہ محض اس کا خیال ہے......... تصور یا وہم شناسائی کے اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اسے جینا میلکم کی آنکھوں میں ایک د التجا کروٹ لیتی محسوس ہوئی۔ صرف التجا ہی نہیں' وہاں کوئی اذیت بھی تھی' کوئی اسرا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے زندگی سے کچھ چاہا ہے' لیکن وہ "کچھ" اسے مل نہیں سکا۔

بین آئزک نے چہروں پر حزن و الم بارہا دیکھا تھا۔ اس نے عورتوں کو ا مکانوں کے سامنے بیٹھ کر روتے دیکھا تھا۔ ان مکانوں کے سامنے' جن سے دھواں ا تھا۔ اس لئے وہ دکھ کو سمجھنے' اسے پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جینا می بڑی شدت سے ترس آیا اور اس ترس کے نیچے سے اسے سمجھنے اور جاننے کی خواہش سر ابھارا۔

اس نے کھڑکی سے باہر نیل گوں آسمان کو دیکھا' جو بے حد مختصر اور محدود لگ تھا' آسمان کا محض ایک ٹکڑا۔ وہ اپنے اس جذبے سے خوف زدہ ہو گیا۔ جنگ میں ت اور ترحم کا کیا کام؟ اور اپنے سوا بھی کوئی قابل اعتماد ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ رحم کر والے جنگ میں اپنی زندگی ہار جاتے ہیں۔ دنیا میں نفرت اور تنگ نظری کے سوا دھرا کیا ہے.........

اس کے دل میں وہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش پوری شدت سے ابھری۔ ا وقت اندرونی دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ملازم یوسف کو اندر لے کر گیا تھا' وہ انتظار گاہ میں داخل ہوا۔

"جناب! مالکن نے آپ کو طلب کیا ہے۔ میرے ساتھ چلے آیئے......... پلیز!"

بین آئزک نے اخبار پھر جیب میں ٹھونس لیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا اور سوچتا تھا۔ یہ بلاوا اس کا جواب تھا۔ وہ فیصلے کے حق سے محروم ہو گیا تھا اور اب اسے اس را پر آنکھیں بند کر کے چلنا تھا' جس کے متعلق اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس

نام پر اس کی منزل ہے یا.........

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور ملازم کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

○-----○-----○

یوسف غیر محسوس طریقے سے اس سائے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا' جو جینا میلکم کے وازے کی سمت سے بائیں جانب پھیلا ہوا تھا۔ وہ بین آئزک کے کمرے میں داخلے کے قع پر ایک مخصوص تاثر ابھارنا چاہتا تھا۔

لڑکے نے جیکٹ کندھے پر ڈالی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور مائے ہوئے چہرے کے دل کش کلاسیکی نقوش میں عجیب سی خوبصورتی اور معصومیت ا......... جیسے اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

یوسف نے جینا میلکم کو بہ غور دیکھا' جس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں میز پر اس کے منے رکھی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مٹھیاں کھلیں اور پھر بھنچ گئیں۔

"مس میلکم......... مس ذی شان!" یوسف نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "اس سے ' یہ بین آئزک ہے۔ بارزی لئی کا خون......... گیلی لی کے علاقے میں آباد نفتالی قبیلے یک فرد۔ یہ قدیم بنو اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے۔"

بین آئزک' جینا میلکم کی میز کے سامنے کمرے کے وسط میں یوں کھڑا تھا' جیسے اسے ؛ وجود کا احساس ہی نہ ہو۔ پھر اسے ایک جانب نقل و حرکت کا احساس ہوا تو اس نے ھما کر دیکھا۔ وہ راحیلہ میلکم ذی شان تھی' جس نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا تھا۔

بین آئزک نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور اس مختصر الوجود' معمر عورت چہرے پر مرکوز کر دیں' جو اس کے سامنے' اپنی میز کے عقب میں بیٹھی تھی۔ اب جیسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ اسے اپنے دل میں ایک بار پھر جذبہ ترحم ابھرتا محسوس ہوا' جو اس عورت کی تصویر دیکھ کر ابھرا تھا۔ مگر اس بار اس بے میں عجیب سی گرم جوشی' چاہت اور اشتیاق کی آمیزش تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ' بڑھے' اس عورت کے قدموں میں بیٹھے اور اس سے لپٹ جائے......... کسی ننھے کی طرح! وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا' لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس معمر عورت نے نہ ' کس طرح اس کے دل کے کسی اچھوتے گوشے کو چھو لیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ اس عورت کو تسخیر کرنا ہے......... دو وجوہات کے تحت۔ ا وجہ اب بھی وہی تھی۔ پاسپورٹ اور شناختی کاغذات کا حصول۔ وہ اسے اس کی

شناخت فراہم کرسکتی تھی اور دوسری وجہ ناقابل فہم تھی۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ ا وجود میں‘ ان جانے جذبوں کی راہ داری میں کھلنے والے بند آہنی دروازے‘ جو طویل استعمال کی وجہ سے زنگ آلود ہوچکے تھے‘ کھل رہے ہیں۔

اس نے بڑے احترام سے عورت کے سامنے سر خم کیا اور بولا‘ ”اللہ آ سلامتی سے نوازے۔“

اپنے لفظوں نے خود اسے بھی حیران کر دیا۔ الفاظ اس کے ہونٹوں نے ادا ک لیکن بے ارادہ۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ یہ ملاقات اسے عجیب کیمیادی تب سے دوچار کر رہی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے کیا تاثر مر ہے..........

اس کی گہری آواز نے.......... ان لفظوں نے کمرے کی فضا کو بدل کر رکھ دیا لخت‘ جیسے وقت پیچھے چلا گیا‘ پل بھر میں زمانے گزر گئے اور پھر جیسے وقت ناموجود ہو ہزاروں نسلوں کے درمیان ایک لمحاتی وقفے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی عمر کا تعین ناممک وہ ایک پیرجواں تھا.......... ایک ایسا شخص‘ جس پر سے صدیاں گزر گئی ہوں.......... پامال کئے بغیر!

ایسے میں جینا میلکم اس سے ایک یہی سوال کر سکتی تھی۔ ”تمہاری عمر کت لڑکے؟“ اس نے اسکول ٹیچر کے سے انداز میں تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

”میری عمر جتنی نظر آتی ہے‘ اس سے زیادہ ہے.......... درحقیقت بہت ز بین آئزک نے جواب دیا۔

نیم تاریک سائے میں کھڑا یوسف زیر لب مسکرایا۔ اس نے اپنے لئے بہتر منتخب کی تھی۔ یہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا.......... اس نے دیکھا تھا.......... ا دیکھ رہا تھا۔ اس نے بین آئزک کو حسین راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ا یہ بھی دیکھا تھا کہ راحیلہ نے بین آئزک پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اپنا چشمہ اتار گویا مشین بننے کے باوجود وہ پوری طرح مشین نہیں بنی تھی‘ اس کی نسوانیت خ ہوسکی تھی‘ اس کا دل اب بھی خوبصورتی کے لئے دھڑک سکتا تھا۔ نازک امنگ مہکتے‘ رنگا رنگ جذبے سوئے ضرور تھے لیکن موت کی نیند نہیں.......... اور امنگو جذبوں کی نیند بہت کچی ہوتی ہے۔ دل کے دروازے پر ہلکی سی چاپ بھی ابھرے تو اٹھا کر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ لڑکی نے اپنی نسوانی جبلت کو جارحیت کے نیچے دبا

ر رکھا تھا.......... مگر بین آئزک کی معصوم خوبصورتی نے اسے اپنے نسوانی ردعمل کو بانے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پھر اس نے بین آئزک کا جواب سنا اور اسے سمجھا.......... ن آئزک ان دونوں خواتین کی موجودگی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے بچہ سمجھا جائے مگر س کے بولنے کا انداز‘ اس کی آواز اور بڑی عمر کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کا لہجہ.......... ر چیز بے حد متاثر کن تھی۔

”اور اس دعائیہ جملے کا کیا مطلب ہوا‘ جو تم نے آتے ہی کہا؟“ جینا نے پوچھا۔

”یہ دعا بھی ہے اور سلام بھی۔ یہ میرے اجداد کا طریقہ ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ لیا تھا۔“

”اور نوجوان.......... تم رہنے والے کہاں کے ہو؟“

بین آئزک نے اس سوال کا جواب فوراً نہیں دیا۔ وہ اب بھی اس بات پر غور ر کے الجھ رہا تھا کہ اس عورت نے اس پر اتنا عجیب اور بھرپور تاثر کیسے چھوڑا ہے؟ اس سبب کیا ہے؟ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی اپنی اغراض کی خاطر اس عورت کو خوش ر نے‘ اس کا دل جیتنے کی خواہش کمزور پڑ گئی ہے۔ اس کی جگہ اب اس عورت کے سرد ونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھرکتی دیکھنے کی خواہش نے لے لی ہے۔

پھر اس نے جواب دیا تو جھوٹ بولا مگر اس کے شعور میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ یہ ھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ کم از کم یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہ جواب اس لئے ے رہا ہے کہ بوڑھی عورت یہی کچھ سننا چاہتی ہے۔

”میں گیلی لی کا رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق نفتالی قبیلے سے ہے۔“ اس نے جواب ا۔

یہ قدیم نام اس کے لبوں سے موسیقی کی طرح پھوٹے اور کمرا ان کی گونج سے بھر لیا۔

جینا نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ راحیلہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا ہ نظریں ہٹانا اس کے بس میں نہیں رہا ہے۔

وہ شخص‘ جس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی ڈور تھی‘ جس کی انگلیوں کے اشاروں کٹھ پتلیاں ناچ رہی تھیں‘ بے حد خوش تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا‘ اپنی ذہانت کو راہ رہا تھا لیکن وہ حیران بھی تھا۔ بین آئزک تو پیدائشی اداکار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی رفارمنس میں کہیں جھول نہیں تھا۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ وہ دونوں خواتین کو اپنے

سحر میں گرفتار کرچکا ہے۔

لیکن بین آئزک کے دماغ میں جھانکنا اس کے لئے ممکن ہوتا تو وہ اتنا م رہتا جتنا اس وقت تھا۔

دوسری طرف بین آئزک کو جینا میلکم کی شخصیت میں کردار کی وہ مضبو قوت ارادی اور وقار نظر آیا تھا' جو زمانہ قدیم کے.......... اس کی نسل کے لوگوں تھا۔ اس نے جینا میلکم میں ان خواتین کی جھلک دیکھ لی تھی' جنہوں نے نسل انسانی فخر سرمایہ دیا تھا۔ اس میں صرف ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ صاحب دل نہیں اس کا وجود جذبات کی حدت اور گداز سے محروم معلوم ہوتا تھا۔ بین آئزک کو مح رہا تھا کہ اس کا اپنا دل جینا میلکم کے دل کو وہ حدت اور گداز فراہم کر رہا ہے۔ اسے تھا کہ اس نے جینا میلکم کے اندر دبی ہوئی اچھائی تلاش کر لی ہے۔ اسے صرف ا سرد' برفانی خول کو پگھلانا تھا۔ وہ اس میں ان جذبوں کی روح پھونکنا چاہتا تھا' جن تمام عمر محروم رہی تھی اور وہ محرومی بہت بڑی تھی۔ اس کا وجدان اسے اپنے ا میلکم کے بارے میں بہت سی باتیں بتا رہا تھا۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک کے مانند ہے' جو انسانوں کے بازار میں ممتا ڈھونڈتا پھر رہا ہے.......... ماں سے بچھ بچہ!

"یہاں آؤ بین آئزک.......... میرے پاس بیٹھو۔" جینا میلکم نے تحکمانہ لہ کہا۔

بین آئزک نے فوری طور پر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اپنی جیکٹ بازوؤں پسلیوں کے درمیان دبائے وہ بے حد باوقار انداز میں آگے بڑھا اور جینا کی میز کے پہا رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جینا کے سرد ہاتھ' جن پر نیلی نسیں ابھری ہوئی تھام لئے' بہت نرمی سے' دوستانہ انداز میں اور دہرایا.......... "اللہ آپ کو سلامتی نوازے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "خدا آپ کو حقیقی خوشیا فرمائے ماں۔"

جینا میلکم نے تیزی سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ "نہیں لڑکے.......... یہ نہیں گی۔" اس نے لہجہ تند رکھنے کی کوشش کی تھی مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو در حقیقت لڑکے کا جذبہ محبت اس حد تک پہنچ گیا تھا اور وہ خوفزدہ ہوگئی تھی کیوں ک اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ وہ محبت کی عادی نہیں تھی۔ اسے پوری شدت سے

آئزک کو مسترد کرنا تھا لیکن پہلے ہی مرحلے میں ظاہر ہوگیا کہ یہ کام اس کے لئے آسان ہیں ہے۔

بین آئزک کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے نہ تو جینا میلکم کے ردعمل سے وئی اذیت ہوئی ہے اور نہ ہی وہ اس کی حوصلہ شکنی کا باعث ہوا ہے۔ اس کے انداز سے ا چلتا تھا کہ اس کے نزدیک یہ محض وقتی ناکامی ہے۔ شاید اسے یقین تھا کہ وہ محبت سے اری اور محروم اس بوڑھی عورت کے دل کو تسخیر کر لے گا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" جینا نے کہا "تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟"

بین آئزک نے جو جواب دیا' اسے جھوٹ ہونے کے باوجود جھوٹ نہیں کہا جا سکتا ا۔ وہ اب حقائق کی نہیں' تخیل کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس ورت حال میں اختراع' سچ سے زیادہ خوبصورت اور مؤثر ثابت ہوگی۔ ویسے بھی اس ے بچپن کے خواب اس بچپن سے یک سر مختلف تھے جو اس نے گزارا تھا۔ بچپن کا دوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں تو تتلیوں کے پیچھے بھاگا جاتا ہے.......... رختوں پر چڑھ کر نارنگیاں توڑی جاتی ہیں.......... وہ تو ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت ری چھاؤں سے عبارت ہوتا ہے.......... اس میں بے فکری ہوتی ہے.......... کل کے ہوم سے بے آشنائی ہوتی ہے۔ یہ بچپن کا وہ تصور ہے' جو پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے' مذہب و ملت اور طبقات کی تفریق کے بغیر.......... اور اس بچپن سے محرومی ہی آدمی ے تخیل کو زرخیز کر دیتی ہے۔ وہ اس محرومی کو کبھی نہیں بھولتا۔ وہ کہاں کہاں اس کی انی کی کوشش نہیں کرتا۔ کچھ نہ بن پڑے تو خواب تو اس کے اپنے ہوتے ہیں' ان پر تو ی کا زور نہیں چلتا۔ اس کی چشم تصور میں دودھ اور شہد کی وہ سرزمین' زیتون کے جھنڈ ر پھولوں سے آراستہ وادیاں پھر گئیں.......... وہ خوبصورت پہاڑیاں' جہاں جابجا نڈے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں اور جہاں سرسبز ڈھلوانوں پر مویشیوں کے گلے رتے ہیں.......... جہاں چرواہوں کی حکمرانی ہے۔ اس نے وہ دیس کبھی نہیں دیکھا تھا لین بارہا دیکھا تھا۔ اس کے وجود میں چچا کے سنائے ہوئے گیتوں کی بازگشت اب بھی قص کرتی تھی' "سردی گزر گئی ہے' برسات آ کے جا بھی چکی' پھول کھل گئے' گیتوں کا وسم آگیا' چہکار فاختہ کی فضا میں ہے دیس کی۔ انجیر کے درخت جھکے پھل کے بوجھ سے۔ رسلے اڑی ہے تاک سے خوشبو ہوائے شوخ.........."

اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو بس ادھ کھلی' کھوئی کھوئی آنکھوں سے وہ سب کچھ

دیکھتا رہا، جو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، اس کی سماعت میں ان گیتوں کے پھول کھل تھے جو برسوں پہلے انکل نتھانیل نے بوئے تھے۔

جینا میلکم نے بھی وہ سب کچھ محسوس کرلیا۔ بے وطنی کا دکھ بھی اور وط خواب بھی لیکن وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس نے لفظوں پر اصرار کیا آئزک......... مجھے بتاؤ اپنے بارے میں، سب کچھ بتاؤ۔ میں سننا چاہتی ہوں۔"

بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی امڈی۔ کیا آ کچھ دیکھ لے، اسے بھی سننا چاہتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ یہ تشکیک کیسی؟ دیکھ کر بھی نہیں آتا!

پھر وہ بولتا رہا......... اپنے خواب بیان کرتا رہا۔ جینا میلکم یوں تن کر بیٹھی جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔ راحیلہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھ کر آگے کی ط جھک آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سحرزدگی کی تمام علامات تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی اور جو کچھ سن رہی تھی، اس کا اس دنیا سے تو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اور ہی دنیا تھی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔

جینا میلکم کے چہرے پر جو تاثر تھا، یوسف اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ نہ جانے سوچ رہی تھی، اس کے ذہن میں کیا تھا؟ اس نے یہ فراڈ قبول کرلیا تھا یا مسترد کر دیا وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

بالآخر جینا نے کہا "ایک بار پھر مجھے ویسے ہی پکارو، جیسے ابھی کچھ دیر پہلے پکارا مجھے وہی دعا دو........."

"خدا آپ کو حقیقی خوشیاں عطا فرمائے ماں۔"

اچانک جینا کے چہرے کا تاثر تبدیل ہوا اور اس نے کرخت لہجے میں پوچھا نے مجھے ماں کہہ کر کیوں پکارا؟"

بین آئزک سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ خود بھی اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔ کیا اس کیمیاوی تبدیلی کا یہی سبب تھا اور یہی ماحصل تھا جو اس خاتون پہلی نظر دیکھتے ہی اس نے اپنے اندر رونما ہوتی محسوس کی تھی؟ کیا یہی وہ جذبہ تھا؟

اس کی کسی اضافی حس نے اسے بتا دیا کہ یہ بات کہنے کے لئے یہ مناسب وق نہیں ہے۔ جذبہ کھوٹا ہو تو اس کی بے قدری کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے لیکن کھ

یوں کو لفظ عموماً ناراض ہوتے ہیں۔

چنانچہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ اس کے چہرے راس کی آنکھوں نے جواب دے دیا ہے۔

"خیر چھوڑو۔" جینا نے کہا۔

پھر کچھ دیر خاموشی رہی مگر اس میں سنگینی نہیں تھی۔

چند لمحے کے بعد جینا میلکم کی انگلی حرکت میں آئی۔ شاید وہ اس کے جسم کا واحد زاد عضو تھا۔ اس نے پینل پر کوئی بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحے اس دروازے میں، جس کے تاریک سائے میں یوسف کھڑا تھا، وہ ملازم نمودار ہوا جو بین آئزک کو یہاں لایا تھا۔ وہ اور مؤدب کھڑا ہوگیا۔

"مسٹر ڈیوڈ سن!" جینا نے کہا "میں تم سے بعد میں گفتگو کروں گی۔ اصولی طور پر نے تمہاری تجویز......... پیشکش قبول کرلی ہے۔ تم دونوں یہیں میرے ساتھ رہو ے......... اس گھر میں۔ ولیم تمہیں تمہارے اقامتی کمرے دکھا دے گا۔" اس نے ملازم طرف اشارہ کیا۔ "اور اس دوران بین آئزک کے لئے لباس کا بندوبست کیا جائے گا۔ اسے اچھے لباس میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ راحیلہ! تم فوراً اس سلسلے میں اقدامات کرو۔" رہ بین آئزک کی طرف مڑی۔ "بین آئزک! تم مس ذیشان کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں رورت کی ہر چیز دلوائے گی۔"

بین آئزک کے انداز میں اس محبت کرنے والے کا بے صبرا پن تھا، جسے یہ یقین لیا کہ وہ اپنے محبوب کی محبت جیتنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ئے والہانہ انداز میں جینا میلکم کے ہاتھ تھام لئے اور محبت آمیز لہجے میں بولا "شکریہ ما!"

اس بار جینا نے ہاتھ نہیں کھینچے۔ البتہ بین آئزک کے چہرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں ے دیکھتی رہی۔

بین آئزک نے اپنی جیکٹ کندھے پر ڈالی اور راحیلہ کی طرف بڑھ گیا، جو اپنی میز کے پاس اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چشمہ تھا اور ہونٹوں پر بے حد دل آویز مکراہٹ۔ بین آئزک بھی مسکرا دیا۔

"مجھے آپ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔" بین آئزک نے راحیلہ سے کہا۔

وہ چند لمحے تک ایک دوسرے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے رہے، یوں جیسے انہیں

یقین ہوگیا ہو کہ ان کی باہمی قربت دونوں ہی کے لئے باعث مسرت ہوگی۔ پھر د
سے چلے گئے۔

ان کے بعد یوسف' ملازم ولیم کے پیچھے جینا کے کمرے سے نکل آیا۔ اس
میں ایک خلش کی پھانس رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی
اس گھر میں رہنا ضرور تھا لیکن میزبانوں کے رویے نے ثابت کر دیا تھا کہ نہ و
مطلوب ہے اور نہ ہی اسے قبول کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ.......... مگر اس
یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس کے لئے یہ رویہ تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ عام حالا
اسے اس بات کی پروا بھی نہ ہوتی۔ وہ تو اپنا الو سیدھا کرنے کا قائل تھا اور اس
سیدھا ہوگیا تھا۔ اس کے لئے یہ بات اور زیادہ باعث حیرت تھی کہ ایک عجیب
احساس تنہائی نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ حالانکہ اس نے زند
تنہائی کو ایک دوست کی حیثیت سے قبول کیا تھا اور خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا

بہرحال اس نے اس احساس کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی فتح کا تصور کیا۔ یہ بہت
کامیابی تھی۔ اسے سکون محسوس ہوا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ بین آئزک کے
خواتین سے تعلقات کوئی بھی صورت اختیار کریں' اسے اس سے کوئی غرض نہیں
چاہئے۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے' اس کی اسکیم کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔

اور اس کامیابی کا سہرا بین آئزک کے سر تھا!

O-----O-----O

یوسف کی یہ بات درست ثابت ہوگئی تھی کہ جینا میلکم کے لئے کوئی کام دشوار
ں ہے۔ میلکم پیلس میں ان کے قیام کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ بین آئزک کو شناختی کاغذات
ر پاسپورٹ میسر آگیا تھا۔

لیکن یوسف کے لئے وہ عرصہ بے حد ناخوشگوار بلکہ اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔
خود پر حیران تھا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر پر تعیش
رگی گزار رہا تھا لیکن اب اعصابی دباؤ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ خدشہ تھا' وہ خود ہی
ے فریب کا پردہ چاک کر دے گا۔

بین آئزک اور راحیلہ ذیشان کی قربت اس کے لئے تشویش کا باعث تھی۔

ایک شام اس نے راہ داری میں ان دونوں کو بے حد قریب دیکھا.......... بے حد
ب! اسے یہ دیکھ کر حیرت تو ہوئی مگر کوئی سکون نہ ملا کہ بین آئزک پیش قدمی کر رہا تھا
، راحیلہ مزاحمت کر رہی تھی مگر وہ مزاحمت زبانی تھی۔

یوسف نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں کچھ کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔

لیکن اس کے لئے پریشانی کی بات یہ تھی کہ اسے ان کی قربت سے کیا تکلیف؟
ے ان کے باہمی تعلق سے کیا غرض! وہ جذبوں کے معاملے میں سرے ہی سے کورا تھا۔
ے انسان کے لئے کمزوری کی حیثیت رکھتے ہیں اور کمزوری کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا

اب اچانک اسے یوں لگا' جیسے اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ پیٹ بھرتے
آسائشات میسر آتے ہی طرح طرح کے جذبوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ شورشیں
کر دی تھیں۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ جسم و جاں کی آسودگی فتنوں کو جنم دیتی ہے۔

اس خود سے خوف آنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ جذبہ رقابت سے آشنا ہوا۔ اس
، پوری زندگی مشاہدات اور محسوسات کا تجزیہ کرتے گزاری تھی۔ یہ رقابت کا جذبہ
را اپنے ہونے کا باعث تو نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بھی تو کوئی اور جذبہ کار فرما ہوگا..........

اور شاید اس کے پیچھے کوئی اور جذبہ.......... کون جانے‘ یہ سلسلہ کہاں تک جا الحال تو وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ بین آئزک اور راحیلہ میلکم ذیشان کو یکجا.......... دوسرے سے قریب دیکھ کر اس کے اندر ان دیکھے‘ خوف ناک سانپوں کی پھنکاری لگتی ہیں۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا مگر شاید وہ دونوں ایک دوسرے کی محب گرفتار تھے.......... اور ان کی محبت کا تصور بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ آراستہ کمرا‘ آرام دہ بستر اور جیب میں رقم کی حیات آمیز حدت.......... تو اچا خواہش ابھر آئی تھی جسے بقا کی جنگ نے کبھی سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ چاہے جانے کی خواہش.......... اور وہ خواہش پوری شدت سے ابھری تھی۔ بدا تقاضے اس کے لئے نئے نہیں تھے۔ اس کے نزدیک ان کی حیثیت پیٹ کے تقاضوں ہی تھی۔ کچھ مل گیا تو کچھ کھا لیا‘ نہیں ملا تو بھوکے ہی سو گئے‘ لیکن اس بار معاملہ تھا۔ اب جسم کے نہیں‘ دل کے‘ روح کے تقاضے سامنے آئے تھے‘ اس لئے کہ پہلی بار موقع ملا تھا سامنے آنے کا۔ وہ بین آئزک اور راحیلہ کی ممکنہ محبت سے چڑ اس لئے نہیں کہ راحیلہ اسے اچھی لگتی تھی یا وہ راحیلہ سے محبت کرتا تھا۔ محبت لطیف اور نازک جذبے کا تو وہ ابھی اہل ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ راحیلہ اس سے کرے لیکن راحیلہ‘ بین آئزک کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے لئے محرو تھی اور ناکامی بھی۔ وہ ایک نئی طرح کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

وہ سوچتا اور کڑھتا رہا۔ غضب خدا کا محبت کا یہ ناٹک اس کی آنکھوں کے کھیلا جا رہا ہے‘ اور یہ بین آئزک! اچانک ہی بین آئزک اس کے لئے بازی جیتنے کے استعمال کرنے والا ترپ کا اکا نہیں رہا.......... بلکہ ایک حریف.......... ایک رقیب حیثیت اختیار کرگیا۔ اس نے اپنے اس جذبے کا تجزیہ کیا مگر وہ جذبوں کا آدمی تھا.......... اس لئے نہیں جانتا تھا کہ اس معاملے میں اکثر تجزیے بے سود ثابت ہ ہیں۔ جذبوں میں بھی انسانوں کی طرح اپنے چہروں کو نقابوں میں چھپانے کی اہلیت ہے۔

اس نے خود کو سمجھایا کہ اسے بین آئزک اور راحیلہ کی قربت پر صرف اعتراض ہے کہ بزنس اور تفریح کو یکجا نہیں ہونا چاہئے اور میلکم پیلس میں ان کی موجو بزنس سے تعلق رکھتی تھی۔ خود اسے تفریح کی سوجھتی تو وہ یقیناً باہر کا رخ کرتا لیکن عجیب بات تھی کہ رقابت کے اس تند جذبے کے ردعمل کے طور پر جسم کے تقاضے

ابھرے تھے۔ اس معاملے میں وہ خواہ مخواہ کی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔

اسے راحیلہ میلکم ذیشان پر حیرت تھی۔ برف کی وہ عورت‘ جس نے تحفظ کے حصول کے لئے امنگوں بھری جوانی تجنے کا فیصلہ کیا تھا‘ بہک رہی تھی.......... پگھل رہی تھی.......... اور وہ بھی ایک سڑک چھاپ لڑکے کے سحر کی اسیر ہو کر.......... وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ برف میں حرارت ہوتی ہے‘ وہ مزاجاً سرد نہیں ہوتی۔ بیرونی حدت کا تو صرف بہانہ ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر تو وہ اپنی حدت سے پگھلتی ہے.......... رفتار کم ہی سہی۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ غصے کی شدت سے کھول اٹھا۔ اپنے غصے کی شدت نے اسے خوف زدہ بھی کیا اور وہ چوکنا بھی ہوگیا۔ عقلی طور پر یہ بات اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ دونوں جو کچھ کر رہے ہیں‘ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے ان کے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ان کا تعلق اس کی اسکیم پر منفی طور پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کی سوچ غلط تھی۔ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا‘ غلط تھا.......... اس لئے کہ وہ بین آئزک کی لمحاتی لغزش تھی‘ جس پر راحیلہ نے اسے نرمی سے ٹوک دیا تھا.......... صرف اس لئے کہ بین آئزک اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ منفی مزاحمت نہیں تھی‘ جو جارح کو مزید کچھ کرنے پر.......... پیش قدمی پر اکساتی ہے۔ اگلے چند روز میں ثابت ہوگیا کہ ان کے درمیان ایک عجیب سی دوستی کا رشتہ استوار ہو رہا ہے۔

اب وہ پچھتا رہا تھا کہ کاش اس نے وہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا‘ نہ سنا ہوتا۔ اب اسے راحیلہ ذیشان کے چہرے پر جو تاثر نظر آتا تھا‘ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے عورت کا روپ دھارا ہے‘ اپنی نسوانیت کو قبول کیا ہے اور اس کا یہ روپ بہت زیادہ دلکش تھا۔

اسے یاد تھا کہ اس روز وہ راہ داری میں نکلا تھا.......... اور فوراً ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ کسی خلوت گاہ میں داخل ہوگیا ہے۔ بین آئزک نے راحیلہ کو بانہوں میں تھام رکھا تھا۔ راحیلہ کا سر اس کے سینے پر تھا۔ بین آئزک سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا.......... اچانک راحیلہ بڑبڑائی۔ "مجھے چھوڑ دو بین.......... مجھے جانے دو.........." لیکن اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ان دونوں کو کچھ دیر تو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر جیسے ہی انہیں

احساس ہوا تو ان کا رد عمل وہ نہیں تھا‘ جو ایسے موقعوں پر محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے.......... افراتفری کے عالم میں علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ بین آئزک نے بہت آہستگی سے.......... بتدریج راحیلہ کو اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ اس کے ہاتھ بدستور راحیلہ کے کندھوں پر ٹکے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔

یوسف خاموش رہا۔ جذبوں کا جاہل ہونے کے باوجود اسے احساس تھا کہ کہیں کہیں لفظ اتنے بے وقعت ہوتے ہیں کہ خاموشی آدمی کو کم از کم بیان کی عاجزی سے‘ اپنی بے وقعتی سے بچالیتی ہے۔ وہ خاموشی سے بین آئزک کے بدلے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی گہری ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک تربیت یافتہ قاتل کی نگاہیں تھیں.......... وہ قاتل جو اس کے اندر مگر اوپری، سطح کے بہت قریب چھپا رہتا تھا کہ ضرورت پڑتے ہی سامنے آجائے۔

وہ ان سب کے لئے ایک بے حد خطرناک لمحہ تھا۔

راحیلہ کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکنے والی نسوانیت کہیں گم ہوگئی تھی۔ اس نے یوسف کو گھور کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں حجاب بھی تھا اور اس کے لئے شدید نفرت بھی۔ ”کیوں؟“ اس نے بے حد تند لہجے میں کہا اور اپنے لہجے کی شدت پر خود بھی حیران رہ گئی۔ ”آخر تم ہی کیوں؟ اس لمحے میں مداخلت تم ہی کو کرنی تھی! کیوں؟“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی دوسری راہ داری میں مڑگئی۔

یوسف حیران تھا.......... وہ ”آخر تم ہی کیوں؟“ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بین آئزک نے بھاری آواز میں پوچھا ”میری نگرانی کر رہے ہو تم؟ دیکھو مسٹر ڈیوڈسن‘ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرا راستہ کاٹنے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔“

”مجھے افسوس ہے بین آئزک!“ یوسف نے معذرت کی۔ ”میں تو اتفاقاً یہاں نکل آیا تھا..........“

بین آئزک کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔ ”اتفاقاً نکل آنے کے لئے بھی تم نے مناسب وقت منتخب نہیں کیا۔“

”ابھی چند لمحے قبل تم پختہ کار مرد معلوم ہو رہے تھے.......... بالغ۔“ یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب بچہ بننے کی کوشش مت کرو۔ زندگی تمہاری اپنی ہے اور یہ کھیل بھی تمہارا ہے۔ دونوں سے جس طرح چاہو کھیلو۔ بس یہ یاد رکھنا‘ یہاں اہمیت صرف ایک

لڑی کی نہیں ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ کام کے سلسلے میں عورت کو ملوث کرلیا جائے تو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور کام بگڑ جاتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھو کہ اس گھر میں ہماری موجودگی کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد دنیا کی حسین ترین لڑکی سے زیادہ حسین ہے۔ میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے سوچنا۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کھڑکی کھولی اور کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر باہر دیکھتا رہا۔ وہ صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اسکیم پر عمل درآمد کا.......... عملی قدم اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ جینا میلکم دشوار ثابت ہو رہی تھی.......... مگر اس کی اسکیم کے لئے راحیلہ میلکم یشان اس سے زیادہ خطرناک تھی۔ وہ اس سے خوف زدہ تھی.......... کیوں کہ اس نے احیلہ کا دبا ہوا عدم تحفظ کا احساس ابھارا تھا۔ اس نے جینا میلکم کو متاثر کرکے راحیلہ کے ژورسوخ کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس نے پہلی جنگ میں راحیلہ کو شکست دی تھی۔ اسے ین تھا کہ راحیلہ نے اس کے بارے میں یقیناً چھان بین کرائی ہوگی اور اب وہ جینا میلکم ے سامنے اس کا کچا چٹھا کھولنے کے لئے کسی مناسب موقع کی منتظر تھی۔ بین آئزک سے ں کا اتحاد اس اقدام کے لئے مناسب ترین موقع ثابت ہو سکتا تھا۔ کیا پتا.......... بین ئزک سے اس کی قربت کا سبب بھی یہی ہو۔

ایک پہلو اور تھا‘ جس کی خطرناکی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ بڑا کھیل کھیلنے لوں کو عموماً اس بے یقینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنا اہم ترین مہرہ بڑھاتے وقت کبھی کبھی دب میں بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ مہرہ بے جان ہو تو اس کے حریف لشکر سے جا ملنے کا خطرہ ں ہوتا لیکن جہاں مہرہ ذی عقل انسان ہو اور سینے میں جذبات بھی رکھتا ہو‘ وہاں خطرہ چند ہو جاتا ہے۔ جینا اور بین آئزک کے درمیان جو تعلق استوار ہوا تھا‘ وہ اسکیم کے ے بے حد خطرناک تھا۔ معاملہ ایک ایسی عورت کا تھا جو ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے وم رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ ماتا عورت کا جزو لازم ہوتی ہے۔ سو ایسی عورت‘ جسے کبھی تا کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا ہو‘ کتنی بڑی محرومی کا شکار ہوتی ہے۔ جینا وہ عورت تھی‘ سانے زنجیروں کی گرفت میں زندگی گزاری تھی۔ پہلے باپ کی اور پھر دولت کی زنجیر۔ سانے محبت کی تھی مگر اسے دولت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ، وہ بین آئزک کو دیکھ کر سوچتی ہو.......... اگر میں نے شادی کرلی ہوتی تو آج میرا ایسا ایک بیٹا ہوتا۔ یوسف‘ جینا کی نظر [illegible] تھا کہ اندر باہر

سے پتھر کی طرح سخت یہ عورت' بین آئزک کے لئے تھوڑی سی پگھل گئی ہے۔ صر اندر سے سہی.......... تھوڑی سی سہی لیکن گلیشئر بھی تو اندر سے تھوڑا تھوڑا کر پگھلتا ہے۔

یوسف دیکھتا رہا تھا' اور اسے اس وقت تک خاموشی سے دیکھنا تھا جب تک سب کچھ اس کی اسکیم کی موافقت میں جا رہا تھا۔ اس کی اسکیم میں بین آئزک کی حیثیہ صرف چارے کی سی نہیں تھی بلکہ وہ عناصر میں کیمیائی ردعمل جگانے والے مادے حیثیت بھی رکھتا تھا۔ کامیابی کا انحصار جینا کے اس یقین پر تھا کہ بین آئزک کی رگوں می صدیوں زندہ رہنے والے لوگوں کا خون دوڑ رہا ہے.......... اور وہی اسے جوہر حیات تک پہنچا سکتا ہے۔

یہ کامیابی حاصل ہونے کی صورت میں اس کے لئے دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اسے ان دشواریوں سے لڑنا تھا۔ یہ خالص تیکنیکی مسائل تھے مگر مشینی نہیں تھے۔ بی آئزک کی اہمیت اجاگر کرنے کے نتیجے میں وہ خود پس منظر میں چلا گیا تھا۔ جینا میلکم ک ذہن پر یقیناً اس کے لئے غیرضروری ہونے کا تاثر مرتب ہو رہا ہوگا۔ یہ خطرناک بات تھی۔ جینا ایسی عورت نہیں تھی; جو غیرضروری بوجھ اٹھاتی۔ چنانچہ اب اسے اپنی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنا تھی۔ بین آئزک کی شخصیت کے پیش منظر میں یہ بے حد دشوار کا تھا۔

دوسری طرف بین آئزک کے لئے کھیل کی نوعیت ہی تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ ہ مقصد بھول گیا تھا۔ اسے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ آسائشات کی اس چھت کے نیچے کیو اور کیسے موجود ہے۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ کاغذات کی موجودگی میں وہ بے وطن نہیں رہا تھا۔ فی الوقت اسے کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں تھا۔ یوسف کے وعدے کے عین مطابق جینا میلکم نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے آزادی دلا دی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہوا تھا اور اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ جینا میلکم کے روپ میں اسے ماں مل گئی تھی۔

اس کے دل میں برسوں کی دبی ہوئی محبت تھی' جسے کبھی باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملا تھا اور زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم اس مضبوط اور سخت عورت میں وہی اوصاف تھے' جو خود اس میں بھی موجود تھے۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اگر وہ پولینڈ میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو یقیناً ہندوستان میں بس جانے والی اس انگریز عورت کی کوکھ میں جنم لیتا اور ایسا ہی ہوتا'

جیسا اب ہے۔

ان دنوں اس کی سوچ محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صرف یہی سوچتا رہتا تھا کہ جینا میلکم کو کس طرح خوش کرے۔ جینا کو خوش رکھنے کا ایک طریقہ تو اس نے سیکھ ہی لیا تھا۔ وہ اسے پرانی عربی شاعری سناتا۔ فلسطین کے گیت سناتا۔ ان مقامات کی منظرکشی کرتا' جہاں کبھی اس کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس طرح اس طویل عمری پر جینا کا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے' جس کا یوسف نے جینا سے وعدہ کیا ہے۔

وہ ہر قصے کا آغاز اس طرح کرتا.......... "پرانے زمانے میں جب ہمارے اجداد۔" یا "ہمارے نفتالی قبیلے میں.........." اور وہ ایسا صرف اس لئے کرتا کہ یہ الفاظ سن کر جینا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہراتی۔ اسے مسرت کہہ لو یا خواب' بہرحال وہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ آنکھوں میں نظر آنے والی وہ چمک اس جگمگاہٹ کا استعارہ ہے' جو جینا کے سینے میں چراغاں کر رہی ہے۔

جینا میلکم کو خوش رکھنے کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے پولینڈ میں روسیوں کے ان مظالم کی کہانی کبھی نہ سناتا جو انہوں نے اس کے لوگوں پر توڑے تھے' جس کا نشانہ اس کے ماں باپ بنے تھے۔ وہ اسے اپنے دکھ اور اپنی محرومیاں نہ سناتا.......... بلکہ ان خوش آئند خوابوں کو حقیقت کی طرح بیان کرتا' جو باپ سے.......... اور پھر انکل نتھانیل سے کہانیاں اور گیت سننے کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں بسے تھے۔

جینا میلکم ہمیشہ سحرزدہ سی اسے بولتا دیکھتی رہتی۔

یوسف ایسے میں جینا کو بغور دیکھتا۔ جینا کے چہرے کا تاثر دیکھ کر اسے شدید خطرے کا احساس ہوتا۔ اسے ایسا لگتا' جیسے اس کی بچھائی ہوئی بساط پر فتح کے بہت قریب کوئی اور قابض ہوگیا ہے اور اب وہ محض ایک تماشائی ہے۔

"پہلے جینا.......... اور اب راحیلہ" اس نے خود سے کہا "ذرا دیکھ کر میاں یوسف.......... ہوشیاری سے۔ ورنہ یہ بالشت بھر کا لڑکا تمہیں کلین بولڈ کر دے گا۔ گارڈ چیک کرتے رہو۔"

کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے اس کے خیالات کی رو اچانک راحیلہ کی طرف مڑ گئی۔ چشمہ اتارنے کے بعد وہ یکسر بدل جاتی تھی۔ اچانک احساس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں بے حد حسین ہیں۔ اس کی جلد میں ملائمت تھی۔ رنگت شہد کی یاد دلاتی تھی۔ درحقیقت اس کی بے پناہ خوبصورتی یوسف کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے پرے

دھکیل دیتی تھی۔

اس نے اس ناپسندیدگی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہ اپنی ناکامی، محرومی کم زوری کا رد عمل تھا۔ عام طور پر مرد جس بنیادی کمزوری کا شکار ہوں، اسے عورتوں ہرگز قبول نہیں کرتے۔ جن عورتوں میں وہی کمزوری ہو، وہ ان سے بری طرح کھینچے برداشت کر ہی نہیں سکتے اسے۔ چنانچہ راحیلہ میلکم ذیشان کے لئے اس کی ناپسندیدگی تھی۔ راحیلہ ذیشان نے راحیلہ اور ذیشان میں حد فاصل کی حیثیت سے میلکم کا پیوند کر لیا تھا۔ کیوں؟ صرف تحفظ کی وجہ سے! وہ اپنے حسن سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس فطری تقاضوں کو دبایا تھا۔ وہ اپنی خوشی سے ایک بنجر، بدصورت اور زندگی سے مح عورت سے وابستہ ہو گئی تھی.......... یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی سے محرومی بھی چھو کی بیماری ہے اور اڑ کر لگتی ہے۔ کس لئے؟ صرف اس لئے کہ اسے تحفظ درکار ت تحفظ اور آسائشات کے عوض اس نے اپنی نسوانیت، اپنا عورت پن فروخت کر دیا تھا یہی مسئلہ اس کا اپنا بھی تھا.......... تحفظ!

لیکن اور تمام معاملات میں اس کی نسوانیت مکمل تھی۔ وہ عورت تھی اور عور نظر آتی تھی!

استدلال کی یہ کجی عورت کے سوا اور کس مخلوق میں ہو سکتی ہے؟ ایک طرف تو اس سے نفرت کرتی تھی، اس سے خوف زدہ تھی کہ وہ ایک ایسا فراڈ آدمی ہے، جو ا ہستی کو دھوکا دے کر لوٹنا چاہتا ہے، اس کا خون چوسنا چاہتا ہے، جس سے اس کی وفاداری رشتہ ہے۔ دوسری طرف اس نے بین آئزک کو قبول کر لیا تھا، اس پر یقین رکھ تھی.......... اور کیا عجب، اس سے محبت کرتی ہو۔ کس قدر غیر منطقی رویہ تھا۔

اور یوسف طبعاً ایسا آدمی تھا، جسے اس طرح کے تضاد بری طرح کاٹتے تھے۔ یہاں تو وہ ویسے ہی بے یقینی کی صورت حال سے دوچار تھا، جو اسے نروس کر رہی تھی۔ وہ خو کو غیر متوازن محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں راحیلہ کے رویے کا تضاد اس کے لئے بے حد حوصلہ شکن تھا اور اس کی خود اعتمادی کو بری طرح مجروح کر رہا تھا۔

اس نے سوچا، اس کا حل یہی ہے کہ بین آئزک کو لے کر یہاں سے نکل کھڑا ہو۔

اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور کھڑکی سے باہر اندھیرے میں جھانکتا رہا۔ اندھیرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ہمیشہ مستقبل کا تصور ابھرتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کے تصور میں راحیلہ کے اس لمحے کا عکس تھا، جب وہ بین آئزک کی بانہوں میں تھی اور ایک خالص لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس لمحے اس نے فطرت کے ناقابل شکست تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ سوچتا رہا کہ اس لمحے راحیلہ کی جو کیفیت تھی، اسے کیا کہا جا سکتا ہے؟ سپردگی؟ شاید نہیں۔

پھر اس نے سوچا کہ وہ سب کچھ کب تک برداشت کر سکے گا؟ خول تو اس کا بھی چٹخ رہا تھا۔ خودغرضی اور مطلب پرستی کی تہوں سے چاہے جانے کی طلب جھانک رہی تھی۔

اس صورت حال میں فرار ہی بہتر تھا!

○-----○-----○

دو روز بعد جینا میلکم نے میلکم انٹرپرائز کے ذیلی ادارے بائبلیکل ریسرچ کے ڈائریکٹر ڈیوِڈسن کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وہ بے حد خوش لباس اور بے فکرا لگ رہا تھا۔

یوسف کو جینا کا سوال بے حد غیر متعلق معلوم ہوا۔ وہ اس کے لئے غیر متوقع بھی تھا۔

”فرض کر لو کہ ہم کامیاب ہو جاتے ہیں۔“ جینا میلکم نے کہا ”اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کئی صدیوں تک، کئی نسلوں کے درمیان جینا.......... اور زندگی گزارنا کیسا لگے گا؟“

یوسف کو فوری طور پر کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ دبلی پتلی، عمر رسیدہ جینا میلکم، جس نے اپنی قوت ارادی اور مضبوط شخصیت کے زور پر ایک زبردست مالی مملکت قائم کی تھی، کسی بہت بڑی تبدیلی سے دوچار ہوئی تھی اور وہ تبدیلی راتوں رات رونما ہونے والی تبدیلی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صبح اٹھتے ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ رات کو سونے سے پہلے وہ جتنی بوڑھی تھی، صبح ہونے پر اس سے زیادہ بوڑھی اٹھی ہے، اور اس تبدیلی نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ یہ نہ سہی، کوئی نہ کوئی ایسی ہی بات تھی ضرور۔ کیا پتا، اسے اپنے چہرے پر موجود جھریوں میں اضافہ محسوس ہوا ہو۔ اس کا انداز کسی پرانے زمانے کی ملکہ کا سا تھا، جس نے رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور صبح ہوتے ہی اس کی وضاحت اور اپنی تسلی کے لئے شاہی جادوگر کو طلب کر لیا ہو۔

”اس صورت میں زندگی ایک ایسے شو کے مانند ہوگی، جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔“ یوسف نے جواب دیا ”عام حالات میں زندگی ایک سنسنی خیز فلم کی طرح ہے۔ جیسے ہی

آدمی اصل راز کو سمجھنے کے قریب پہنچتا ہے، کسی تاریک کونے سے موت اس پر جھپ ہے، اور بس شو ختم۔ ہم کامیاب ہوگئے تو آپ کی حد تک ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ وقت گزاری کر رہا تھا، لفظوں کے ہیر پھیر سے کام لے رہا تھا کیونکہ وہ نہی سمجھ پایا تھا کہ جینا میلکم کس موڈ میں ہے اور کیا سننا چاہتی ہے۔ اس کا تو کھیل ہی یہی کہ جینا کی خواہش کے مطابق چلے.......... چلنے کی اداکاری کرے.......... وہ اس کی چاند پالینے کی بچکانا خواہش سے کھیل رہا تھا۔ یہ کام اس وقت تک ضروری تھا جب تک تحقیق کے لئے فیلڈ ورک کا آغاز نہیں کرتا۔ ایک بار فیلڈ ورک شروع ہوگیا تو کو دشواری نہیں رہے گی۔ وہ نہایت سکون سے یہ رپورٹس بھیجتا رہے گا.......... "ہم کامیا کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔" وہ آس لگائے بیٹھی رہے گی، آس کا دامن کبھی نہی چھوڑے گی.......... اور آس اس کے لئے جوزف ڈیوڈسن کی بھیجی ہوئی رپورٹ کا ہوگا۔ فیلڈ ورک شروع ہونے تک اسے یہی بندر اور کیلے والا کھیل کھیلنا تھا۔ جہاں بند نے بے چینی کا اظہار کیا، وہیں اسے ایک کیلا تھما دیا۔

اس کا خیال تھا کہ تحقیقی کام کی کامیابی کی امید جینا میلکم کو زندگی کے راستے پر کم ا کم دس برس اور گھسیٹ جائے گی اور ان دس برسوں میں وہ خود شاہانہ انداز میں زندگ گزارے گا، لیکن جینا کو اس منزل تک لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ قدم قدم پ تخیل کا بے دریغ استعمال کرنا پڑا تھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" جینا میلکم نے کہا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں، جس سے ہاتھوں پر ابھری ہوئی نیلی نسیں اور ابھر آئی تھیں۔ اس وقت وہ بے حد ناتواں لگ رہی تھی۔ انسانوں کی طرح!

یوسف اب بھنچی ہوئی مٹھیوں کا مطلب خوب سمجھنے لگا تھا۔ وہ جینا میلکم کی حصول زندگی کی شدید طلب بلکہ ہوس کی علامت تھیں۔ چنانچہ اس بار جواب دیتے ہوئے اس نے نہ تو خود کو اندھیرے میں محسوس کیا اور نہ ہی اسے کوئی دشواری ہوئی۔ "اس زمین پ آپ کی حیثیت ایک ملکہ کی سی ہوگی۔" اس نے بلا جھجک کہا۔

جینا میلکم نے اپنی کرسی میں پہلو بدلا۔ اس کے انداز میں سکون سا جھلکا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یوسف کا جواب اسے پسند آیا ہے۔ وہ انداز اس بچے کا سا تھا، جو خود کو اپنی پسندیدہ کہانی سننے کے لئے تیار کر رہا تھا۔

یوسف نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "باہر کی دنیا.......... اور اس دنیا کی ہر چیز خواہ

زمین کے کسی خطے میں بھی ہو، آپ کی ملکیت ہوگی۔"

ایسے انٹرویو کے موقع پر اسے ہمیشہ یہ لگتا تھا، جیسے وہ کسی جاں بہ لب مریض کو پانی شکر گھول کر دوا کے نام پر دے رہا ہو.......... اس یقین دہانی کے ساتھ کہ یہ دوا اسے ت یاب کردے گی۔

جینا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں آتش حیات کے شعلوں کا عکس نظر ا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے کندھوں پر رکھے ہوئے عمر رفتہ کے بوجھ میں سے ک کئی برس کم ہوگئے ہوں۔ وہ تبدیلی، جو یوسف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی وس کی تھی، یک لخت معدوم ہوگئی۔

‘بڑی بی کو یہی جواب درکار تھا’ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا ‘اب اس ب پر ایک تہ اور جمانی چاہیے۔’

"آخر میں یہ سب کچھ آپ کا ہوگا۔" اس نے یقین دلایا۔ "دولت دولت کو کھینچتی ۔ آدمی صرف موت سے ہار جاتا ہے۔ وہ قابو میں آجائے تو بات ہی کیا۔ لوگ ختم تے رہیں گے مگر آپ موجود ہوں گی اور آپ کی دولت ان کی دولت کو کھینچتی رہے گی۔ ام کار سبھی کچھ آپ کا ہوگا۔"

جینا میلکم کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ صحیح پٹڑی پر ہا ہے۔

"ٹیکس کی شرح بھی آپ کی دولت میں اضافے کی رفتار سے ہار جائے گی۔" اس مزید کہا۔ "آپ کی صدیوں پر محیط زندگی ساری دنیا کی دولت کو مقناطیس کی طرح اپنی ف کھینچ لے گی۔ ایسے جیسے سورج زمین کی ساری نمی چوس لیتا ہے۔ بینک میں موجود ٹ عددی اعتبار سے کہیں کے کہیں جا پہنچیں گے۔ انکم ٹیکس والے جاتے رہیں گے آتے رہیں گے۔ آپ اپنی جگہ موجود رہیں گی۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جینا میلکم نے لذت آمیز سرگوشی میں کہا۔

"سرمایہ برف کی گیند کی طرح لڑھکتا جائے گا اور اس پر سونے چاندی اور زرد مال تہیں چڑھتی جائیں گی۔ یہ بھی طے ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا، جب زمین پر موجود انسان آپ کا مقروض ہوگا۔ بچے بھی آپ کے مقروض پیدا ہوں گے۔ حکمرانی اور کسے تے ہیں؟ رعایا اور کیا ہوتی ہے؟"

جینا کسی سحرزدہ معمول کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ یوسف کی حیثیت ایک

جادوگر کی سی تھی، جو منتر پڑھ رہا ہو۔ وہ الفاظ کے زور پر جینا کی نگاہوں کے سامنے دنیاؤں کے دروازے کھول رہا تھا۔ اس کی آواز میں کسی ماہر ہپناٹسٹ کی سی گہرائی ا تھا۔

”روئے زمین پر موجود ہر شے اور سمندروں کے سینے پر رواں ہر جہاز ملکیت ہوگا۔ براعظم افریقہ کا ہر کرال آپ کا ہوگا۔ ایشیا کے کچے گھر تک آپ گے۔ پیرو.......... میکسیکو.......... امریکا.......... آسٹریلیا.......... ہر جگہ آپ کی ہوگی۔ ہر مکان، ہر محل، ہر عمارت.......... روئے زمین پر موجود ہر چیز پر آپ کے مہر ہوگی۔ لوگ آپ کے سامنے سر جھکا کر شاہوں کی طرح آپ کو تعظیم دیں گے۔

ہر قیمتی چیز، غلہ، مویشی، قیمتی لکڑی فراہم کرنے والے جنگل، کوئلہ، لوہا چاندی، سونا، پلاٹینم اور یورینیم.......... سب کچھ آپ کا ہوگا اور اسی کے ساتھ کرہ کی پوری آبادی، اپنی قومیت سے بے نیاز آپ کی رعایا ہوگی۔ ان کے جسم، ان کے دل، ان کے جذبات اور ان کی روح سب آپ کی ملکیت ہوگا۔ آپ اس کی تعبیر پائیں گی، جو انسان نے ہمیشہ دیکھا ہے، جس کی تعبیر پانے کی اس نے ہمیشہ ک کی ہے لیکن ناکام ہوگیا ہے۔ دنیا کو فتح کر لینے کا خواب.......... پوری طرح مسخر کر خواب۔ مس میلکم! آپ دنیا کی فاتح اور مالک ہوں گی۔“

وہ کہتے کہتے اچانک خاموش ہوگیا۔ چند لمحے اس نے اپنی بے ترتیب ر درست کیں۔ لہجے میں سچا زور پیدا کرنے کی کوشش میں وہ خود ہیجانی کیفیت سے ہوگیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں زور بیان معقولیت کی حدوں سے آگے تو نہیں نکل گیا۔ اس نے جینا کی طرف دیکھا، وہ کچھ او کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شاہوں کا سا وقار اور دبدبہ تھا۔ اس کے لب ہوگئے تھے اور دہن میں زبان یوں لرز رہی تھی، جیسے اس پر لذت حکمرانی کا ذائقہ رہا ہو۔

”ڈیڈی کو یہ آئیڈیا بہت پسند آتا۔“ چند لمحے بعد وہ خوابناک لہجے میں بولی ڈیڈی بہت بڑے بادشاہ ثابت ہوتے.......... تمام بادشاہوں سے بڑے۔“

یہ بھی ایک کمپلیکس تھا۔ وہ اور اس کے ڈیڈی ایک ہی تھے۔ ایک جان قالب.......... اب اگرچہ میلکم کی موت کو مدت ہوچکی تھی مگر وہ جینا کے قالب میں بھی زندہ تھا۔

”آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ اس آئیڈیے کو حقیقت بنانے سے کتنی قریب ہنچ چکی ہیں۔“ یوسف نے کہا ”مجھے اپنی تھیوری کے حق میں ایک اور ثبوت ملا ہے۔ اب مجھے اور بین آئزک کو روانہ ہو جانا چاہئے۔ بس دشواری یہ ہے کہ ہمیں اسرائیل جانا ہے ور اسرائیل جانے کی کوئی صورت نہیں۔“

”ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔“ جینا نے پُراعتماد لہجے میں کہا ”میرا اثر و رسوخ تو اب ھی شاہوں جیسا ہی ہے۔ اسرائیل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا..........“

”اس مسئلے کا حل امریکا میں ہے۔ میرے اور راحیلہ کے پاس تو پہلے ہی امریکی ہریت موجود ہے۔“ جینا نے بتایا۔ پھر وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکی۔ ”یہ بعد کی باتیں ں، تم پہلے مجھے اس نئے ثبوت کے بارے میں بتاؤ۔“

یوسف نے سوچا، کچھ بھی بتا دیا جائے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میلکم پیلس میں اخلے کے بعد پہلی بار وہ خود کو پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ صورت حال اس کے قابو میں ھی۔ مچھلی چارا نگل چکی تھی۔ پھنس چکی تھی.......... وہ پھر سے ہپناٹسٹ بن گیا۔ اس نے ں موضوع پر اپنی کئی ہفتوں کی فرضی تحقیق کے بارے میں جینا کو بتایا۔ ”ہمیں نفتالی اور الی فلسطین جانا ہوگا۔“ اس نے کہا ”اس بات کا ثبوت مل گیا ہے کہ اس علاقے میں کہیں ہر زندگی کا بیج مدفون ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں ایک تحریری ثبوت..........“

”کیا لڑکے کا جانا ضروری ہے؟“

یوسف اس سوال پر بری طرح چونکا۔ اس سوال کے ساتھ یقیناً الجھنیں بھی وابستہ وں گی۔ اس نے اس کا جواب فوری طور پر نہیں دیا۔

”میں پوچھ رہی ہوں، کیا بین آئزک کا جانا ضروری ہے؟“

اس بار یوسف نے جواب دیا تو اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ”جی ہاں.......... ضروری ہے۔ اس کی مدد کے بغیر میں ان لوگوں سے رابطہ نہیں کر سکوں گا، جو اس جستجو ں معاون ثابت ہوں گے۔ مجھے تو وہ لوگ مل بھی جائیں تو میں انہیں پہچان نہیں سکوں لہ بین آئزک اس تمام جدوجہد میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر..........“

جینا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش ہونے کو کہا اور سر کی اثباتی جنبش سے اضح کیا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہی ہے۔ وہ ڈیسک پر رکھے ہوئے چھوٹے مائیکروفون کی لرف متوجہ ہوگئی، جس کے ذریعے وہ پورے میلکم پیلس میں کہیں بھی، کسی سے بھی بات

کر سکتی تھی۔ "راحیلہ...... اور بین آئزک! تم جہاں بھی ہو' فوراً میرے آفس پہنچو۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

چند منٹ بعد وہ دونوں مختلف دروازوں سے آفس میں داخل ہوئے۔ راحیلہ ہاتھ میں نوٹ پیڈ اور پنسل بھی تھی۔

جینا نے آئزک سے کہا "لڑکے...... مسٹر ڈیوڈ سن نے بتایا ہے کہ اب تمہ ان کے ساتھ فلسطین جانا ہوگا۔"

بین آئزک اس کی طرف بڑھا اور اس نے جینا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "ٹھیک ہے ماں...... مگر میں آپ کے پاس واپس آؤں گا۔" اس نے بے حد محبت کہا۔

یوسف' جینا میلکم کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں محبت کی چمک ابھری۔ ا لمحے کے لئے ان کی کرختی دور ہوئی اور اس کی جگہ ایک اداس سی نرمی نے لے لی۔ ا نے پلکیں جھپکائیں اور انگلی سے بین آئزک کے رخسار کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہ "ممکن ہے' تم واپس آ ہی جاؤ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تم گھر پہنچ کر مجھے بھول جاؤ۔ گ پہنچ کر گھر سے برسوں کے بچھڑے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ تاہم اس کی ضرورت نہیں' اس لئے کہ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔"

یوسف کو جینا کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی...... اور جب اس کی سمجھ میں آ تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"میں اور راحیلہ...... ہم دونوں تم لوگوں کے ساتھ ہی چلیں گے۔" جینا مزید کہا۔ اس بار وہ یوسف سے مخاطب تھی۔ "اگر تم نے روانگی کے سلسلے میں اپنے ط پر کچھ انتظامات کئے ہیں تو انہیں منسوخ کر دو۔ اب تم جاؤ۔ اور راحیلہ! تم ذرا رکو۔ تمہیں ابتدائی انتظامات کے سلسلے میں ہدایات دوں گی۔"

کمرے سے نکلتے ہوئے یوسف کے ذہن میں دو خیالات کلبلا رہے تھے...... ا دونوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے لئے سکون بخش نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ جینا کی با سن کر بین آئزک کے چہرے پر بے پناہ زردی کھنڈ گئی تھی...... اور دوسری چیز راح کے لبوں پر اچانک نظر آنے والی مسکراہٹ تھی۔

اس رات میلکم پیلس پر نسبتاً جلدی سکوت طاری ہوگیا۔ بین آئزک کا کہیں نہیں تھا اور راحیلہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوسف کے اعصاب چٹخنے جا رہے تھے۔

اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ نچلی منزل سے دبی دبی آواز سنائی دے رہی تھی' جہاں راحیلہ کا آفس تھا۔ لیکن یوسف کو کسی ان جانے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دبے قدموں بڑھا تاکہ نچلی منزل پر پہنچ کر ان آوازوں کے متعلق تفتیش کرے۔

اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور یوسف انہیں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے...... لیکن وہ کوئی رومانوی انداز نہیں تھا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ان کے چہروں کی کشیدگی بے حد عیاں تھی۔ بین آئزک بے حد روانی سے گفتگو کر رہا تھا۔

یوسف آگے بڑھا اور دروازے تک پہنچ گیا تاکہ وہ گفتگو سن سکے۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے زبردست صدمے کا باعث تھا۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ بین آئزک اسے بیچ رہا تھا۔

وہ چند لمحے دروازے پر کھڑا خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی معیوب حرکت نہیں تھی کیوں کہ جو کچھ کہا جا رہا تھا' وہ اسی سے متعلق تھا۔ اب اس کے سامنے اپنی بقا کا مسئلہ تھا' جس کے سامنے کسی چیز کی' کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پھر وہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے تمام سوئچ آن کر دیئے۔ کمرا یک لخت روشنی میں نہا گیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے تند لہجے میں کہا "اور کل صبح مس میلکم کو کیا بتاؤ گے تم؟"

بین آئزک بری طرح اچھلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ یوسف کے روبرو تھا۔

لیکن راحیلہ نے سنبھلنے میں حیرت انگیز تیزی دکھائی۔ اس کے انداز میں اس جواری کا سا اعتماد تھا' جس کے پاس تمام اہم پتے موجود ہوں اور جسے یقین ہو کہ وہ بازی جیت چکا ہے "حقیقت سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھی۔" اس نے کہا "اس کے باوجود میں نے تمہارے متعلق چھان بین کرائی۔ ثابت یہ ہوا کہ تمہارے بارے میں میرا ہر قیاس درست تھا اور اب بین آئزک نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔" یوسف نے خشک لہجے میں کہا۔

"جو کچھ سنا' پسند بھی آیا؟" بین آئزک نے پوچھا۔

یہ بات نہیں کہ یوسف کو اس کی توقع نہ رہی ہو۔ اس کے باوجود اپنے خلاف ان

دونوں کے اتحاد نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے راحیلہ کو تو اپنا کھلا دشمن تسلیم کرلیا ت بدترین توقعات کے باوجود وہ بین آئزک کو اپنا شریک کار.......... اپنا ساتھی سمجھنے سے نہیں رہ سکا تھا۔

"اس کی پروا مت کرو کہ مجھے پسند آیا یا نہیں۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں "اب ذرا تفصیل سے گفتگو ہو جائے۔ میں شروع کا حصہ نہیں سن سکا ہوں.......... یہ کہ جینا میلکم کو کیا بتاؤ گے؟" اس نے ہر تکلف بالائے طاق رکھ دیا۔

"اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سن لو۔ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے گا کہ انہیں وقوف بنایا گیا ہے۔ وہ جان جائیں گی کہ تم بدمعاش اور اچکے ہو اور میں پرلے در بددیانت اور جھوٹا ہوں، جو کبھی زندگی میں فلسطین کے قریب تک سے نہ گزرا.........."

"نہیں بین! نہیں۔" راحیلہ نے چیخ کر کہا۔ "تم ایسے نہیں ہو۔ تمہیں اس بہکایا تھا۔"

یوسف نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور نرم لہجے میں بولا "ممکن ہے۔" پھ بین آئزک کو گھورتا رہا۔ "میں تمہیں سمجھ نہیں سکا لڑکے! میرا خیال تھا کہ تم میر اشتراک سے خوش اور مطمئن ہو۔ پھر آخر ہوا کیا؟ یہ تبدیلی کیسی؟ کس چیز سے خوف ہو تم؟"

"یہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں۔" راحیلہ نے تیز لہجے میں کہا۔

یوسف نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔ گویا اتحاد حقیقی تھا۔

"جو.......... یہ کھیل اب ختم سمجھو۔ ہم فلسطین میں.......... میرا مطلب اسرائیل میں مس میلکم کی موجودگی کے دوران اپنا بھرم تین دن بھی قائم نہیں رکھ سک گے۔ سوچو تو.......... انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم نے انہیں پریوں کی کہانی سنا کر بہلایا ت ویسے بھی اب انہیں بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جیسا نقشہ کھینچا تھا کا.......... وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب صورت حال بدل چکی ہے جو!"

"اوہ.......... صرف اس لئے کہ تمہیں شناختی کاغذات مل چکے ہیں۔ اب تمہ کوئی خوف نہیں۔" یوسف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

لڑکے نے بغیر کسی پشیمانی کے سیدھے سے لفظوں میں جواب دیا۔ اس کے لہجے م جذباتیت تک نہیں تھی۔ "نہیں۔ اس لئے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ انھوں

مجھے ایک گھر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے انسان سمجھا ہے۔ شروع میں میں سمجھا تھا کہ اس طرح میں ان کی مدد کر رہا ہوں، انہیں خوشیاں دے رہا ہوں، وہ فرضی کہانیاں سنا کر، جن پر انہیں فوراً ہی یقین آجاتا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ بات آگے جا چکی ہے۔ میں انہیں ایک فرضی کہانی کے زور پر دربدر نہیں پھرا سکتا۔ اور پھر راحیلہ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے۔ اب یہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے کہ راحیلہ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے۔" یوسف نے کہا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں کرسی پر ڈھے گیا۔ لیکن پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور لہجے میں پرفریب گرمجوشی تھی "مجھے تمہارے ضمیر کی بیداری پر خوشی ہے بین آئزک۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ اپنے ضمیر کو اور توانا کرو۔ کیونکہ یہ اس دنیا میں بہت بڑی نعمت ہے اور بہت کم یاب!"

"میرے ضمیر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔" بین آئزک نے تند لہجے میں کہا۔

"ارے ہاں.......... اور تمہیں اس سلسلے میں خاصا کام بھی کرنا پڑے گا۔ کسی دوسرے انسان کی تباہی پر اخلاقی بلندی کا مینار تعمیر کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے ضمیر سے زیادہ حوصلے.......... بلکہ ڈھٹائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف یہی نہیں، پتھر کا دل بھی چاہئے ہوتا ہے۔"

"تم اس کی باتیں مت سنو بین!" راحیلہ نے چیخ کر کہا "یہ لالچی، بدکردار اور بے رحم ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

"ہا.........." یوسف نے قہقہہ لگا کر کہا "میں لالچی بھی ہوں اور بدکردار بھی لیکن بے رحم نہیں۔ کیوں کہ اس کے لئے بے دل ہونا پڑتا ہے، اور خدا کا شکر ہے، میرے سینے میں پتھر بھی نہیں، خلا بھی نہیں، گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔" اس نے سگریٹ سلگائی اور بین آئزک کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا "ذرا خود کو دیکھو اے شریف اور مثالی انسان۔ اور اس پر غور کرو کہ تمہارے اس اچانک پھولوں کی طرح بے داغ، پاک اور معصوم ہو جانے والے ضمیر کا اس عورت پر کیا اثر ہو گا، جس نے تم پر مہربانیاں کی ہیں اور جس کی محبت کا تم دعویٰ کر رہے ہو؟"

بین آئزک کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے لیکن یوسف نے اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ اب وہ اس پر پوری طرح سواری گانٹھنے کے موڈ میں تھا۔

"جاؤ.......... اور صبح مس جینا میلکم کے حضور جا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرلو۔ جب وہ

تمہاری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر بکھرے تو اپنے اس ضمیر کو.......... اپنی حق گو چمکارنا۔ تم اس عورت کے بے ضرر یقین کو تباہ کر دو.......... اس سے اپنی عمر طبعی زیادہ جینے کی معصوم خواہش چھین لو۔ اس کے آنسو دیکھنا۔ اسے کرچی کرچی ہوتے د اور ممکنہ طور پر اسے اپنی آنکھوں سے موت سے پہلے مرتے دیکھنا اور پھر اپنے ضمیر لپٹ کر کہنا میں قاتل نہیں ہوں۔ مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”تم شیطان کے چیلے ہو۔ کس قدر فضول اور لغو باتیں کر رہے ہو!“ راحیلہ برہمی سے کہا ”صرف اس لئے کہ بین آئزک، مس میلکم کے رو بہ رو تمہارے اور ا مشترکہ جھوٹ کا اعتراف نہ کرے۔ لیکن تم بھول رہے ہو کہ اگر یہ مس میلکم تک نہیں پہنچائے گا تو یہ کام میں کروں گی۔ میرے ضمیر پر ایسا کوئی بوجھ نہیں.......... می وجود میں ایسا کوئی زہر نہیں، جس کا تم فائدہ اٹھا سکو۔ مجھے تو مدت سے اس موقع کا ا تھا۔“

”ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں۔“ یوسف نے جواب دیا۔ ”تمہیں مدت سے موقع کا انتظار تھا۔“

راحیلہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں تم آدمی سے مس میلکم کا پیچھا چھڑانے کا یہ موقع ہرگز ضائع نہیں کروں گی.......... بالخصو اس صورت میں کہ میرے پاس بین آئزک جیسا گواہ موجود ہے۔ تم مجھے روک سکتے ہو

”نہیں، میں تمہیں نہیں روک سکتا۔ تم آپ ہی خود کو روک لوگی۔“

”میں خود کو روک لوں گی؟ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟“

”وہ اس لئے کہ تم بزدل ہو مس راحیلہ میلکم ذیشان۔“ یوسف نے بے حد سکو سے کہا ”تم جینا میلکم کو پہلے ہی دن مجھ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر سکتی تھیں۔ تمہ صرف اتنا کرنا تھا کہ مجھے میلکم پیلس سے نکال دیتیں لیکن تم نے ایسا نہیں کیا، اس لئے تم میں جرات ہی نہیں تھی۔ میں نے تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھایا.......... اور تم خو زدہ ہو گئیں کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی۔ تمہیں ہمیشہ.......... ہر وقت.......... لمحے یہی خوف رہتا ہے۔“

”یہ سچ نہیں ہے!“ راحیلہ نے چیخ کر کہا۔ پھر اسے احساس ہو گیا کہ اس کا اندا مدافعانہ ہے۔

یوسف نے ایک لمحے اسے بہت غور سے دیکھا اور بولا ”یہ سچ ہے۔ میں تمہی

اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تم صرف بزدل ہی نہیں، بھگوڑی بھی ہو۔ تمہیں کبھی زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرات نہیں ہوئی۔ تم حسین ہو، ذہین ہو، دلکش شخصیت کی مالک ہو، لیکن تم میں اتنی جرات بھی نہیں جتنی کسی کیمیکل کمپنی میں کام کرنے والی پیکنگ گرل میں ہوتی ہے۔ تم نہ محبت کر سکتی ہو، نہ تمہیں کسی پر ترس آسکتا ہے کیوں کہ تم خود ترسی میں مبتلا ہو۔ تم نے خود کو ایک نارمل عورت بھی نہیں رہنے دیا۔ فطرت کو کچل ڈالا تم نے۔ تم تو صرف ایک خود غرض عورت ہو، جس نے تحفظ اور آسائش کی خاطر اپنے جسم اور اپنی روح دونوں کو گروی رکھوا دیا ہے۔ اور اس کے باوجود تم عدم تحفظ کا شکار ہو۔ کتنے گھاٹے کا سودا کیا ہے تم نے؟ جس تحفظ کے تصور کے لئے تم نے خود کو انسان سے مشین بنا ڈالا.......... خود کو ختم کر دیا، وہ تمہیں خود بھی جھوٹا لگتا ہے..........“

بین آئزک تیزی سے آگے بڑھا.......... لگتا تھا، وہ کچھ کر گزرے گا۔ ”بس جو.......... بہت ہو چکی۔“ اس نے نہایت برہمی سے کہا ”تم بہت کچھ کہہ چکے۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہاری گردن..........“

”میری گردن توڑنے سے کچھ نہیں ہوگا بین!“ یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا، جیسے کسی چیز سے خائف نہ ہو۔ تربیت یافتہ لڑاکے بین آئزک سے بھی نہیں۔ ”کچھ فائدہ نہیں بین، یہ جانتی ہے کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ سچ ہے۔“

لیکن اتنی دیر میں راحیلہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا ”میرے بارے میں تمہاری رائے علم نفسیات کی کتابوں میں چھپنی چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ایک بوڑھی عورت کو بے وقوف بنا کر اسے لوٹنے کے لئے جو ناٹک رچایا تھا، اسے ختم سمجھو۔“

”ہوش کے ناخن لو لڑکی!“ یوسف کا لہجہ زہریلا تھا۔ ”تمہیں اس بات کی فکر نہیں کہ جینا میلکم میرے ہاتھوں بے وقوف بن کر چند لاکھ روپوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس سے جینا کی دولت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ بات یہ نہیں۔ تمہیں پریشانی یہ ہے کہ کہیں میری ریسرچ کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل آئے۔ میں جینا میلکم کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، جبکہ تم اسے مردہ دیکھنا چاہتی ہو۔“

راحیلہ کا چہرہ یوں سپید پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو۔

یوسف نے اس بار اور گہرا چرکا لگایا۔ "تم سمجھ رہی ہو نا؟ میں تمہارے چہر تحریر پڑھ سکتا ہوں۔ رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں' جہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتی رہتی ہو کہ آخر دولت اور حقیقی تحفظ کے حصول کے تمہیں کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تم نے اپنی جوانی درحقیقت اس امید کے عو فروخت کی ہے کہ جینا کے مرنے کے بعد تمہیں ترکہ ملے گا.......... اور ہمیشہ کے تحفظ کا احساس۔ اور اب تمہیں موقع مل گیا ہے۔ تم جانتی ہو' یہ حقیقت جینا میلکم کو کہ ہم اُسے دھوکا دے رہے تھے' اسے شوٹ کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ اس وار بچ نہیں سکے گی۔ یوں تم اسے اس طرح قتل کردوگی کہ کوئی تمہیں اس کا قاتل قرار دے سکے گا۔ یہ سچائی کا خنجر ہے' جسے تم بڑی آسانی سے اس کے دل میں گھونپ کر سمیٹ سکتی ہو۔ واہ.......... کیا بے داغ قتل ہوگا یہ۔ دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پر داغ۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔"

راحیلہ اور بین آئزک پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت تھے۔ خاموشی اتنی گہ تھی کہ اس پر موت کا گمان ہوتا تھا۔ سانس تک کی آواز نہیں تھی۔

○-----○-----○

راحیلہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رو لگی۔ بین آئزک بیٹھا بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے۔" یوسف نے کہا' "میں بتا رہا کہ لوگ یہی سمجھیں گے۔"

اس صورت حال میں مدد اس سمت سے آئی' جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سک بین آئزک اٹھا اور جا کر راحیلہ کی کرسی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس راحیلہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ لیکن اس کی ایک بات د ہے۔ ہم اب جینا ماں کو حقیقت نہیں بتا سکتے۔ بہت دیر کردی ہم نے۔"

یوسف موقع ضائع کرنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ "اب تم نے کی ہے سمجھ دار بات۔" اس نے جلدی سے داد دی۔ اس کا لہجہ نرم تھا لیکن اس میں زور بھی تھا۔ "دیکھو۔ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ راحیلہ تم' بین آئزک' میں اور جینا بھ سمجھنے کی کوشش کرو کہ اب واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ دیکھو' اگر جینا بہت زیادہ سخت ہوتی اور اس سچ کو جھیل بھی جاتی تو آئندہ کبھی تم پر.......... بلکہ کسی پر بھی بھرو

کرتی۔ جبکہ حقیقی صورت حال بہت مخدوش ہے۔ جو کچھ ہم کر چکے ہیں' اسے لوٹا نہیں سکتے۔ بات بہت آگے جا چکی ہے۔"

راحیلہ نے کہا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔" اس نے دراز سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

یوسف آگے کو جھک آیا۔ "دیکھو.......... جینا کو نہ جوانی کی آرزو ہے نہ حسن کی' انہیں آب حیات کی آرزو ہے۔ وہ تو اپنی دولت کو تحفظ دینے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اب مجھے بتاؤ کہ معجزوں کی اس سرزمین پر کیا یہ ناممکن ہے کہ ان کی مدد کی کوئی صورت نکل آئے؟ یہ تم لوگ یقین سے تو نہیں کہہ سکتے نا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہماری کاش ہی جینا کی زندگی بڑھا دے گی۔ ہمیں ان کی خاطر کوشش بہرحال کرنی چاہئے۔"

"میں انہیں خود ان سے بچانا چاہتی تھی۔" راحیلہ نے بین آئزک سے مخاطب ہو کر کہا "وہ بیمار ہیں۔ میرا مطلب ہے' ان کی روح.........."

بین آئزک نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوسف کی منطق نے اسے ہلا دیا تھا۔ اب اسے احساس جرم ستا رہا تھا۔ جینا میلکم کی امیدیں راسخ کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تو اسی کا تھا۔ وہ جو گیت اور قصے کہانیاں اسے سناتا رہا تھا' انہوں نے ہی جینا کو ابدیت کے راستے پر ڈالا تھا۔

یوسف نے اپنی بات جاری رکھی' جیسے مداخلت ہی نہ ہوئی ہو۔ "تم انہیں خود ان سے نہیں بچا سکتیں۔" اس نے راحیلہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے بات آگے بڑھائی "سو بہتر یہی ہے کہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ وہ اب صرف طویل عرصے تک زندہ رہنے کی ہی خواہش کی اسیر نہیں' ان کے دل میں بین آئزک کی محبت بھی گھر کر گئی ہے۔ بین اب ان کے لئے بیٹے کی طرح ہے۔ اب ہمارے لئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں آگے تو بڑھا جا سکتا ہے۔ ان سے کچھ مت کہو۔ ہمارے ساتھ اسرائیل چلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں پہنچنے کے بعد ان کے مقصد کے حصول کے لئے ان تھک کوشش کروں گا۔ بولو منظور ہے؟"

"بین آئزک' بولو کیا کریں؟" راحیلہ کے لہجے میں التجا تھی۔

ادھیڑ عمر لڑکا خود اذیت میں تھا۔ احساس جرم اس کے ذہن سے چمٹ کر رہ گیا تھا مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ "میرے خیال میں ہمارے سامنے کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں انتخاب کا سوال اٹھے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ خود کو جذبوں' خواہشوں اور

پچھتاووں کے ایسے جال میں پھنسا محسوس کر رہا تھا' جس سے نکلنے کا موہوم سا ا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ساتھ ہی وہ پیدائشی فائٹر تھا۔ موہوم ترین امید کی بنیاد پر منصوبے کی عمارت کھڑی کر سکتا تھا اور وہ موہوم ترین امید یوسف نے ایک ط طرح اسے سونپ دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انبیاءؑ کی سرزمین پر معجزہ رونما ہونا بات نہیں۔ وہ خود جھوٹا تھا لیکن خدا کی عدالت میں واقعاتی شہادتوں کی بنیاد پر فی سنائے جاتے۔ وہ تو نیتوں کو جانتا ہے اور ان کی بنیاد پر آدمی کو بخشتا ہے۔ کون جا میں سے کسی کی نیت کی سچائی خدا کی رحمت کو پکار بیٹھے اور خدا کی رحمت جوش جائے تو جینا کے لئے سو پچاس سال کی اضافی مہلت عطا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں

"ہاں بھئی.......... بولو نا۔" یوسف نے راحیلہ سے کہا۔

راحیلہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوسف نے جس طرح صورت وضاحت کی تھی' اس میں تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا' کوئی متبادل صورت نہیں فراڈ کو موقوف کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن راحیلہ کو احساس ہو رہا تھا کہ یو منطق میں کہیں نہ کہیں کوئی جھول ہے' کہیں نہ کہیں یوسف نے اپنی فطری ذریعے کسی حقیقت کو منطق کے زور پر مسخ کیا ہے' لیکن وہ اسے تلاش نہیں کر پائی

دوسری طرف اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ اس احساس کے ساتھ اس کے اند سا سکون اور طمانیت گھر کر گئی تھی کہ ان کا اشتراک ختم نہیں ہو رہا ہے.......... با رہے گا اور یہ کہ اب سب کچھ پہلے ہی جیسا ہو جائے گا۔ وہ اسرائیل جانے کی میں لگ جائیں گے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعتاً اتنی ہی بزدل ہے' جتنا نے زور بیان کے ذریعے ثابت کیا ہے یا کہیں کوئی اور گڑ بڑ ہے' جس وجہ سے شخص کا شکار بنی ہے.......... اس کے ہاتھوں کھلونے کی طرح استعمال ہوئی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے جو۔" بالآخر وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم رضامند ہو۔" یوسف نے جلدی سے کہا "بہت اب ہم سب سکون سے سو سکیں گے۔ چاہو تو اس سلسلے میں مزید گفتگو کل صبح ہو گی۔ اس وقت تک تم بے فکر رہو اور سب مجھ پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا او کر دیکھے بغیر رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

اس نے کاریڈور عبور کیا۔ زینوں پر چڑھتے ہوئے اس کا سینہ احساس فتح سے گیا۔ اس مختصر سی جنگ سے اس نے اپنے لئے دو مثبت نتائج حاصل کئے تھے۔ ا

آئندہ کے لئے بغاوت کا امکان ختم کر دیا تھا اور دوسرے اپنی کھوئی ہوئی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ حیرت انگیز بات تھی کہ جس چیز سے اسے ڈرایا جا رہا تھا' اب مستقبل میں ضرورت پڑنے پر وہ اسی کے زور پر ان دونوں کو دھمکا سکے گا۔ یعنی جینا میلکم کو حقیقت بتا ہنے کی دھمکی دے کر' لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

مگر اپنے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عجیب سی اداسی نے یے اس کے دل کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اندر جیسے اداسی کی کہر اتر آئی تھی۔ نساں فتح جانے کہاں جا سویا تھا۔ وہ ایک کرسی پر ڈھے گیا۔ اس نے پاؤں پھیلا لئے۔ وڑی سینے سے جا لگی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیسی فتح ہے یہ اور میں کیسا آدمی ہوں۔ میں ان افراد کو تباہ کر رہا ہوں' جن کی میں نے پروا کی ہے۔ ان سے پہلے تو کبھی کسی کی پروا ہی ہی تھی مجھے۔ واہ.......... کیسا زبردست آدمی ہوں میں..........!

○-----○-----○

تین دن بعد وہ امریکا کے لئے روانہ ہو گئے۔

واشنگٹن میں قیام کے دوران یوسف کو صحیح معنوں میں جینا میلکم کے اثر و رسوخ کا ازہ ہوا۔ وہ تو واقعی اب بھی ملکہ ہی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اور آئزک کو بہت جلد گرین کارڈ مل گیا۔ پھر پاسپورٹ بنے۔ ویزے لگنے میں بھی کوئی اری نہیں ہوئی۔

اور اس وقت یوسف حیفہ میں ہوٹل میگیڈو میں اپنے سوئٹ کی ٹیرس سے پھولوں روش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو مبارکباد رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی ذہانت رنگ لائی تھی۔ اب وہ بادشاہوں کی سی زندگی ار رہا تھا۔ ابھی چند ماہ پہلے فاقوں کی نوبت آ چکی تھی لیکن اب..........

وہ سان فرانسسکو سے ایک چھوٹے بحری جہاز میں روانہ ہوئے تھے۔ وہ جہاز خاص پر جینا میلکم کے لئے بک کرایا گیا تھا۔ جہاز پر ان کے لئے جیپیں' کاریں' لگژری ز' آلات اور وہ تمام ضروری سامان تھا' جس کی ماہرین آثار قدیمہ کو کسی تحقیقی مہم دوران ضرورت پڑ سکتی ہے۔

سفر کے دوران کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ راحیلہ کا انداز ایسا تھا' جیسے وہ اختلافات بھلا چکی ہے۔ لیکن یوسف کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس راحیلہ کو جس انداز میں اپنی سازش میں شریک کیا ہے وہ اسے کبھی نہیں بھولے گی۔

البتہ ایک بات خوش آئند تھی۔ راحیلہ کی فطرت کا عملی پہلو یوسف کے نقطہ نظر کار آمد تھا۔ اسی کی وجہ سے اب جبکہ وہ اس کی حلیف بن چکی تھی تو اس نے اس حقیق کو قبول بھی کرلیا تھا۔ بین آئزک بھی ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔

یوسف کا منصوبہ بے حد سادہ تھا۔ ابھی اس کے منصوبے کی جزئیات مکمل نہ تھیں۔ اب اس کا انحصار جینا میلکم کے رد عمل پر تھا۔ قوی امکان یہ تھا کہ مقدس سرز کی کشش اور اس کے اسرار مل کر اس کے وجود میں نئی روح پھونک دیں گے۔ مش کامیابی پر اس کا یقین اور پختہ ہو جائے گا۔ طویل زندگی کی امید اور جاں فزا ہو جائے گ ابھی یہاں آئے صرف دو دن ہوئے تھے اور جینا کے چہرے پر رونق بڑھ گئی تھی۔

یوسف نے سوچا تھا کہ سرزمین بیت المقدس کے مظاہر دکھا کر جینا میلکم کے یقین پکا کرنے کے بعد وہ اسے وطن واپس جانے پر رضامند کرے گا۔ اتنی بڑی کاروباری مملک کو اس کے حال پر تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ جینا کی وہاں موجودگی بہت ضروری تھی۔

اپنی کارکردگی پر خوش اور مطمئن یوسف نے اپنے لائحہ عمل کو ذہن میں پھر کیا۔ راحیلہ کو اس نے شکار کرلیا تھا' جال میں پھنسا لیا تھا۔ بین آئزک' جینا میلکم کی مج کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ اب جینا اپنی وصیت میں آئزک کو ہر حال میں شامل کرے گی۔ اس نے سوچا' بین آئزک سے اپنے حصے متعلق بات ابھی کرلی جائے۔ دلیل اس کے پاس موجود تھی۔ اسکیم اس نے سوچی عمل بھی اس نے کیا تھا۔ ورنہ بین آئزک خواب میں بھی جینا کے قریب نہیں پھٹک تھا۔ اس اعتبار سے وہ کم از کم نصف کا حق دار تھا۔

آخری خیال بے حد طمانیت بخش تھا۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو تھی۔

کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے سوچا' یہ بین آئزک ہوگا۔ گزشتہ را سے اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اندر جا کر کال ریسیو کی۔ دو طرف راحیلہ تھی۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔ "جو......... فوراً نیچے آجاؤ۔ میں کا ٹیل بار میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی آیا۔" یوسف نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

وہ نیچے سنسان لاؤنج میں پہنچا' راحیلہ ایک گوشے میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ "کیا بات ہے راحیلہ؟" اس نے پوچھا

بڑی بی کی طرف سے کوئی پریشانی؟"

"نہیں۔ بین آئزک......... وہ غائب ہے۔ میں نے روم کلرک سے معلوم کیا ھا۔ اس سے پتا چلا کہ بین آئزک رات کمرا خالی کرگیا ہے۔ اپنا بیگ وہ ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا۔" راحیلہ نے ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ الا۔ پھر بولی "مجھے ڈر لگ رہا ہے جو۔ اب ہم کیا کریں گے؟"

یوسف نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا' کیا کامیابی کی حدود ں داخل ہونے کے بعد بھی یہ بلبلے کی سی کیفیت رہتی ہے؟ بلبلہ اچانک ہی پھوٹ جاتا ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا میرے قدموں کے نیچے ہے اور ب.........؟ اب ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے زمین قدموں کے نیچے سے کھینچ لی ہے۔ ں احساس سے بھی اسے زیادہ طمانیت نہ ملی کہ اس کے اور راحیلہ کے درمیان ایک ئے تعلق کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ اس سے سہارے کی طلب گار تھی......... اس پر انحصار ر رہی تھی۔ "ہم کیا کرسکتے ہیں؟" بالآخر اس نے دھیمی آواز میں کہا "لڑکا غائب اور شاید لیل ختم۔" دل میں اس نے کہا۔ 'سبھی کچھ ختم سمجھو۔'

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دونوں اپنے اپنے طور پر کچھ سوچتے رہے۔ پھر یوسف ہی نے لب کشائی کی۔ "جینا کو معلوم ہے یہ بات؟"

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ دیر تک چھپی تو نہیں رہ لتی۔ دوپہر کے کھانے پر وہ یقیناً اسے پوچھیں گی اور پھر انہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔" ں نے ایک لمحے توقف کیا پھر پوچھا "جو......... آخر کیوں؟ وہ ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ لیا؟"

یوسف نے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "مذاق کر رہی ہو؟ اس نے وہی کیا' جو ے کرنا چاہئے تھا۔ اگر میں کامیابی کے نشے میں خود ستائی میں مصروف نہ ہوتا تو مجھے ندازہ ہوگیا ہوتا کہ اب یہی ہونے والا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اسے چت کرچکا ہوں گر اب وہ الٹا مجھے چت کرگیا۔ دیکھو......... سوچنے کی بات ہے۔ اسے جس جس چیز کی ضرورت تھی' مل گئی۔ کاغذات' پاسپورٹ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسرائیل پہنچ گیا۔ اب اسے کیا پڑی تھی کہ ہمارے درد سر میں شریک ہو۔"

راحیلہ نے پلکیں جھپکا کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی۔ "لیکن اسے مس میلکم ے ماں کی سی محبت........."

"محبت تو اسے تم سے بھی تھی!" یوسف نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "وہ ت بھی چھوڑ گیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اب اسے جینا میلکم کے سامنے سچ بولنے عذاب سے نجات مل گئی۔ ایسے لوگ ترجیحات کا تعین اسی طرح کرتے ہیں.......... بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ دوسری بات یہ کہ اسے اندیشہ رہا ہوگا کہ میں میں اسے ڈبل کراس کروں گا۔ سو اس نے اس سے پہلے ہی کام دکھا دیا۔"

"تو سب کچھ ختم ہوگیا۔ ہے نا؟"

یوسف نے کوشش کرکے خود کو سنبھالا "ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے لہجے زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تم کسی طرح فی الحال جینا کو بہلائے رکھو۔ انہیں بتاؤ ہم ایک اہم سراغ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ میں اور بین آئز ساتھ ہیں تو کم از کم چند روز تو وہ بے فکر رہیں گی۔ میں اسی دوران میں بین کو تلا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

راحیلہ تلخی سے ہنسی۔ "میرا تو خیال ہے کہ اب تم بھی فرار ہو جاؤ گے!" اس آنکھوں میں مایوسی تھی۔

یوسف چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ اب تک تو یہ خیال اس کے ذہن میں نہ آیا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ خیال برا نہیں تھا۔ اس نے راحیلہ کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہو کہا "یہ ناممکن نہیں لیکن تم فی الوقت ایسا مت سوچو۔" پھر اچانک اس کا موڈ خرا ہوگیا۔ "کاش' اس خبیث لڑکے نے میرے نام کوئی رقعہ ہی چھوڑ دیا ہوتا۔ چاہے اس لکھا ہوتا.......... جوزف ڈیوڈسن' اب تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے جنت مل گئی ہے۔"

"تو تمہیں بھی اس کی پروا تھی۔ زیادہ نہ سہی' بہرحال تھی۔" راحیلہ نے عجی سے لہجے میں کہا۔ یوسف نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی "گڈبائے جو۔"

یوسف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہیں میرے بھاگنے کا کتنا ہی یقین سہی لیک مشورہ ہے کہ گڈبائے کے بجائے "پھر ملیں گے" کہہ کر رخصت ہو۔" اس نے نرم لہ میں کہا۔

"سب بیکار باتیں ہیں۔" راحیلہ نے شکستہ لہجے میں کہا "تم خود کہہ چکے ہو ک عقل مندی اسی میں ہے۔"

"جب تک ذرا سا امکان بھی موجود ہو' میں بھاگنے کا قائل نہیں۔" یوسف نے کہ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا بی بی۔" اس نے پلٹ کر

کہا "ہو سکتا ہے' جلد ہی میں تمہیں خوشخبری سناؤں۔"

O-----O-----O

اس معاملے کے آغاز کے بعد سے اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ یوسف خود کو لت کے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں رجائیت کے بجائے قنوطیت فی۔ اسے احساس تھا کہ بین آئزک کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا انداز نیم دلانہ تھا۔ یہ کام اسے تنہا کرنا تھا.......... اور پہلی بار اسے تنہا ہونا برا لگ رہا لہ وہ خود کو دشمنوں میں گھرا محسوس کر رہا تھا۔ اب پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سلمان ہے اور یہودیوں کے ملک میں ہے۔ لوگ اجنبی' زبان نامانوس.......... بس ایک ھارس تھی کہ وہ بیت المقدس میں ہے۔ مسلمانوں کی وہ مقدس سرزمین' جس پر ہودیوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر عجیب سا دفانی جذبہ امنڈ تا تھا' جسے وہ پوری طرح سمجھ بھی نہیں پاتا تھا۔

اسے احساس تھا کہ بین آئزک کو ڈھونڈ نکالنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ربھی وہ کوشش کر رہا تھا کیونکہ یہ ضروری تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ناکامی کی صورت میں ہ خود کو یہ الزام دیتا نظر آئے کہ اس نے کوشش نہیں کی.......... ہاتھ پیر نہیں مارے۔ ہ پچھتاوے پالنے کا قائل نہیں تھا۔

وہ باہر نکلا تو زبان کی رکاوٹوں نے اسے ہراساں کر دیا۔ اسرائیل میں سرکاری زبان برانی کے علاوہ کئی اور زبانیں بولی جاتی تھیں۔ انگریزی' ہوٹلوں اور شاپنگ سینٹرز تک ندود تھی۔ پورے دن کی خواری کے بعد اسے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ بین آئزک کے لئے کے ایک شخص کو گزشتہ رات تل ابیب جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ ربھی یہ یقین نہیں تھا کہ وہ بین آئزک ہی ہوگا۔ اسرائیل میں بین آئزک جیسے بہت تھے۔

تل ابیب پہنچ کر بین آئزک کے ملنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔ وہاں تو اس کے لئے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں اپنے لئے مناسب کمرا لینا بھی مسئلہ بن گیا۔ راستے سے معلوم نہیں تھے اور اپنا مافی الضمیر واضح کرنا بہت ہی بڑا مسئلہ تھا۔ اسے ابتدا ہی میں ندازہ ہوگیا کہ ۳۵ لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں بین آئزک کو تلاش کرنا ممکن نہیں' یہ لگ بات کہ اتفاقاً کہیں اس سے سامنا ہو جائے۔

پھر بھی وہ مزید ایک دن وہاں رکا۔ اس نے مارکن اسٹریٹ کے تمام بڑے بڑے

ہوٹل کھنگال ڈالے، ساحلوں کے چکر لگائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ لڑکا کہیں فوج بھرتی نہیں ہوگیا۔ امریکا میں قیام کے دوران وہ امریکی لہجے میں انگریزی بولنے پر قاد تھا پھر اس کا پاسپورٹ امریکا کا تھا اور تمام کاغذات اسے امریکی ثابت کرتے تھے۔ چ بڑے اعتماد سے آرمی ہیڈکوارٹر پہنچ گیا لیکن وہاں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اب اسے یقین ہوگیا کہ بین آئزک تل ابیب آیا ہی نہیں۔ اس یقین ک ٹھوس وجہ نہیں تھی، بس ایک توانا سا احساس تھا، جو اسے یقین دلا رہا تھا۔ اگلی صبح و ڈان ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھا بحیرۂ روم کے سینے پر تھرکتے اسٹیمرز کو دیکھتا رہا۔ دو گھن گئے۔ وہ اپنے آپ سے بحث کرتا رہا۔ بین آئزک کے بغیر اسکیم جاری رکھنے کا کوئی سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہوگیا، لیکن اس کی تھیوری پر جینا کا یقین اور بین آ آپس میں لازم و ملزوم بن کر رہ گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بین آئزک کے غائب ہو خبر سنتے ہی جینا اپنا یقین کھو بیٹھے گی۔ یعنی کھیل ختم ہوچکا تھا۔ عقل مندی کا تقاضا یہی جو کچھ میسر ہے، اسے لے کر کھسک لیا جائے۔

راحیلہ ذی شان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ اس وقت بھی نکل بھاگنے پر غور تھا، جب راحیلہ نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اب یوسف نے اس پر عملی انداز میں ہر زا سے غور کرنا شروع کیا۔

نکل بھاگنا بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اس کے پاس کافی رقم تھی، امریکا کی شہریت اور وہ لیڈا ایرپورٹ سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ امریکا پہنچنے میں ا ڈیڑھ دن لگتا اور یہ بات یہیں ختم ہو جاتی۔ راحیلہ اسمارٹ ہوتی تو اپنا منہ بند رکھتی، کہ اس نے اب تک کیا تھا اور وہ اس طوفان سے بھی کسی نہ کسی طرح بخیر و عافیت جاتی۔

لیکن ان لوگوں کو چھوڑ بھاگنے کا تصور یوسف کے لئے بڑا اذیت ناک اور با شرمندگی تھا۔ کیوں......... کیسے؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آ اس نے اسے جذباتیت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس نے خود سے کہا "بیٹا یوسف، تم پڑتے جا رہے ہو، بودے ہوگئے ہو۔ ارے......... تمہیں آج نہیں تو کبھی نہ کبھی تو انہ چھوڑ کر بھاگنا ہی ہے۔ جتنی جلدی بھاگو گے، جینا اور راحیلہ کو اتنی ہی کم تکلیف ہوگ اسی میں ان کی بہتری ہے۔"

مگر پھر اس کے تصور میں راحیلہ در آئی......... میگیدو ہوٹل کے بار میں

ری۔ وہ بہت اداس اور خوفزدہ لگ رہی تھی۔ جب وہ اسے چھوڑ کر آ رہا تھا تو اس کی ہوں میں کیسی التجا تھی، اور یوسف کو یاد تھا، راحیلہ نے پوچھا تھا۔ "اب ہم کیا کریں گے؟" اس وقت اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ اس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ وہ د کو اس کا ساتھی اور شریک سمجھ رہی تھی.........!

لیکن کھیل ختم ہوگیا تھا۔ اس کا خوبصورت اور اسٹروک والا بیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ اب زبین بالنگ کے سامنے خالی ہاتھ ڈٹے رہنے کا کیا سوال تھا۔ یہ تو احمقانہ جذباتیت ہے ر آدمی زندگی کے کھیل میں احمقانہ جذباتیت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

پھر اس نے خود سے کہا کہ نہیں۔ ایک بار یہی سہی۔ میرا اس میں کیا بگڑے گا۔ ہار چکے......... سب کچھ ختم ہوچکا تو اسپورٹس مین اسپرٹ کے مظاہرے میں میرا کیا ا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے میچ میں شکست کے بعد آدمی مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں سے لاتا ہے انہیں......... مبارکباد دیتا ہے۔

یہ خیال اسے دلچسپ بھی لگا اور اس نے اسے پرسکون بھی کر دیا۔ ایک بات اور ہوئی لیکن وہ اس کا اعتراف خود سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اس خیال سے اس میر پر سے بوجھ بھی ہٹ گیا۔

وہ اٹھا، اپنا بیگ لیا، ہوٹل کے کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے وہ باہر نکلا اور حیفہ جانے والی پر سوار ہوگیا۔

حیفہ میں اس نے سیوائے ہوٹل سے راحیلہ کو فون کیا۔ "ٹیکسی پکڑو اور یہاں آ ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

وہ ہوٹل کے لاؤنج میں ملے۔ یوسف نے ٹرکش کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔ کافی پینے دوران اس نے راحیلہ کو اپنی ناکامی کا احوال سنایا۔ "میں نے اپنی طرف سے ہر کوشش لی بی۔ اگر وہ سامنے نہیں آنا چاہتا تو اسے تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ آئی وری بی بی! کھیل ختم ہوچکا ہے۔"

راحیلہ کچھ دیر خاموش بیٹھی دل ہی دل میں جیسے تباہی کا تخمینہ لگاتی رہی، پھر اس آگے کی طرف جھک کر اس کے چہرے کو بغور دیکھا "جو......... تمہیں واپس آنے پر حالات نے مجبور کیا؟" اس نے پوچھا۔

یوسف کا ردعمل بے حد شدید تھا۔ اس نے سوچا......... یہ لڑکی مجھ برے کو اچھا نے کے چکر میں نہ لگ جائے۔ اس نے فوراً ہی تیز لہجے میں کہا "اس سے فرق کیا پڑتا

ہے؟" اندر کی برہمی کو اس کے لہجے نے سرد کر دیا تھا۔ "اگر جاننا ہی چاہتی
مجھے تجسس واپس لایا ہے۔ میں مس میلکم پر اس ناکامی کے اثرات دیکھنا چاہتا ہ
تو میرے بارے میں چھان بین کرائی تھی۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ میں
ہوں اور کہانی نویس بھی۔ اب بولو' تسلی ہوگئی؟"

اگر راحیلہ کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی تو اس نے اسے
چھپایا تھا۔ چہرے کے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن اس کی نگاہیں یو
پار دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں "تم کس طرح کے انسان ہو یوسف؟ انسانوں
انہیں توڑنا اور پھر ان کا ردعمل دیکھنا' یہ کہاں کی انسانیت ہے؟" راحیلہ نے کا
میں کہا۔

یوسف کی برہمی معدوم ہوگئی۔ شرمندگی چھپانے کے لئے ہمیشہ کی طر
سگریٹ کا سہارا لیا۔ بڑے اہتمام سے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر' دیا سلائی
ہاتھوں کے پیالے میں چھپا کے اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی پھر بولا "
میرے بارے میں بہت کچھ معلوم نہیں کر سکی ہو۔ دیکھو.......... یہ ناہموار معاش
تخلیق نہیں کیا ہے۔ میں زندہ ہوں تو اس کے لئے بہت کم عمری میں میں
خودغرض معاشرے میں زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ ایک دو
کمزوریوں کو بھانپتے' ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے مطلوبہ نتائج حاصل کرتے
لئے میں کسی چیز کو اپنی کمزوری نہیں بناتا۔ دولت کو بھی نہیں۔ میں استعمال نہیں
کیونکہ جو استعمال نہیں ہوتے' وہی دوسروں کو استعمال کرنے کے اہل ہوتے
نے مس میلکم کی کمزوری کو کیش کرنا چاہا۔ ناکام ہوا۔ کوئی بات نہیں۔ اگر دول
کمزوری ہوتی تو میری عقل اس مرحلے پر جواب دے جاتی' کمزوری حاوی آ جا
سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود اس سچویشن سے چمٹے رہنے کی کوشش کرتا اور
ہے' اسے بھی گنوا بیٹھتا۔" کہتے کہتے اسے خود ایک خیال آیا۔ اس نے اس اند
سوچا ہی نہیں تھا۔ "اگر میں بھی بین آئزک کی طرح بھاگ جاتا۔" اس نے کچھ تو
بعد پھر کہا۔ "تو بھی مجھ سے سب کچھ چھن جاتا۔ جو عورت مجھے امریکی شہریت
ہے' وہ اسے منسوخ بھی کرا سکتی ہے۔ وہ اپنے وسائل کے ذریعے مجھے کہیں
ڈھونڈ سکتی ہے۔ میرا معاملہ بین آئزک سے مختلف ہے اسلئے کہ میرے اور
مقاصد جدا تھے۔ پھر بین آئزک سے جینا کا ممتا کا رشتہ استوار ہوگیا تھا جبکہ میر

ابی غرض کا کچا رشتہ تھا۔ سمجھیں کچھ؟" اس نے آخر میں فاتحانہ لہجے میں کہا۔ پھر
کرایا اور اس نے جوابی حملہ کیا۔ "اب میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کس طرح
ورت ہو؟ میں نے جینا میلکم کی سلطنت میں نقب لگائی اور گھس گیا' تم تماشا دیکھتی
رکھوالی کرنے والے کتے ایسے تو نہیں ہوتے۔" راحیلہ کا چہرہ سپید پڑتا دیکھ کر
خوشی ہوئی۔ چلی تھی اسے سیدھے راستے پر لگانے! ایسے لوگوں سے وہ ہمیشہ سے
آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اچھا بننے کی خواہش اس کی وہ کمزوری تھی' جسے اس نے
پردوں میں چھپا کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود ذرا سی ترغیب پر وہ خواہش بری طرح
تھی۔ چنانچہ اسے وہ لوگ بہت برے لگتے تھے جو اس کے اندر اچھائی تلاش کرنے کی
ش کرتے تھے۔ "بولو نا' چپ کیوں ہوگئیں؟"

راحیلہ کو خود پر لگنے والے چرکے سے بالکل تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اپنی حقیقت
پہلے ہی تسلیم کر چکی تھی۔ البتہ جوزف نے اپنی شخصیت کا جو خاکہ پیش کیا تھا' وہ اس
لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے بے حد خوشگوار لہجے میں جواب
"میرے بارے میں تو تم کراچی میں سب کچھ جان گئے تھے۔ میں بزدل ہوں' تحفظ کی
ہوں۔ میری ماں نے مجھے یہی تعلیم دی تھی۔ میں نے اپنے باپ کو سفید پوشی کا بھرم
کی جدوجہد میں جان سے گزرتے دیکھا اور سمجھا کہ زندہ رہنا کتنا مشکل کام ہے۔
بچپن ناآسودہ خواہشوں کے کھلونوں سے کھیلتے گزرا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں' اب
ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "تم نے چھان بین کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ
کتنی عجیب ہے کہ تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو ہی نہیں سکتا۔ چھان بین کرنے
لے یقین سے نہیں بتا سکتے کہ تم جوزف ڈیوڈسن ہو یا یوسف۔ کرسچن ہو یا مسلمان؟ اب
خود ہی بتا دو۔"

"فی الوقت تو میں عقیدہ ضرورت کا پیروکار ہوں۔" یوسف نے زہریلے لہجے میں
"جب کچھ بن جاؤں گا تو ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں۔"

دونوں خاموش بیٹھے اپنی اپنی کمزوریوں کی نہ پاٹی جانے والی خلیج کے پار ایک
رے کو دیکھتے رہے۔ پھر راحیلہ نے پوچھا "اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"جا کر مس میلکم کا سامنا کریں گے تاکہ یہ کہانی اختتام کو پہنچے۔"

"اور پھر؟"

"تمہیں کبھی بے روزگاری کا تجربہ نہیں ہوا؟" یوسف نے پوچھا۔

"نہیں۔" راحیلہ نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا "اور حیرت انگیز طور موقع ہے کہ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ اچھا.......... ایک بات بتاؤ۔ مس میلکم کو صدمے سے بچانے کی کوئی صورت نہیں؟"

"دکھ اور صدمے سے بچانے کی.........؟"

"ہاں' میں جانتی ہوں کہ کاروباری معاملات میں وہ بے حد سفاک ہیں۔ ان کے ہاتھوں لوگوں کو اذیت پہنچتے دیکھی ہے۔ خود مجھے بھی کئی بار انہوں نے دی۔ سو انہیں پہنچنے والے مالی نقصان کی مجھے کبھی پروا نہیں ہوگی لیکن اپنی خوا زنداں میں وہ بیمار ہیں.......... بچے کی طرح بے بس ہیں۔ میں انہیں اس معا اذیت سے دوچار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور وہ میری پھوپھی بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو۔ تم یہ معاملہ مجھے ہینڈل کر اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا۔"

لیکن جب وہ جینا میلکم کا سامنا کرنے کی غرض سے میکیدو ہوٹل پہنچے تو پتا وہاں ایسے معاملات درپیش ہیں' جنہیں یوسف بھی ہینڈل نہیں کرسکتا۔ انہیں کاؤنٹر پتا چلا کہ جینا میلکم اب تک تین چار بار انہیں طلب کرچکی ہے اور اس نے حکم دیا وہ جیسے ہی واپس آئیں' انہیں اس کے سوئٹ میں بھیج دیا جائے۔

O-----O-----O

اس کمرے میں' جسے جینا میلکم بطور آفس استعمال کر رہی تھی' تین افراد مو تھے۔ ایک تو جینا خود تھی۔ وہ اپنی کرسی پر شاہانہ انداز میں تن کر بیٹھی تھی۔ اس کے سے توانائی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ چہرے اور آنکھوں پر فاتحانہ چمک تھی۔ اس قریب ہی بین آئزک کھڑا تھا۔ تیسرا ایک بوڑھا شخص تھا' جس کا سر جسم کے مقابلے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دوستانہ تاثر تھا۔ لباس سے وہ کوئی دہقان لگتا تھا

انہیں دیکھ کر وہ اٹھا۔ وہ کھڑے قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ شخصیت میں عجی سا وقار تھا۔ دیکھنے میں وہ دہقان لگتا تھا مگر انداز حکمرانوں کا سا تھا۔ تھوڑی کی بناوٹ زند دلی کی غمازی کر رہی تھی۔

"آؤ بھئی.........." جینا نے چہک کر کہا "مس میلکم یہ ہیں ڈاکٹر نتھانی لیوی.......... بین آئزک کے چچا۔"

ڈاکٹر لیوی دوستانہ انداز میں مسکرایا "مس راحیلہ میلکم! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ میں اسرائیل میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" پھر اس نے شرمیلے انداز میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھا "میں آپ سے ہاتھ نہیں ملا سکوں گا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں اپنی زمین پر کام کر رہا تھا۔ آلو نکال رہا تھا زمین سے۔"

"اور ڈاکٹر لیوی! یہ ہیں جوزف ڈیوڈسن۔ میری مہم کے منیجر۔" جینا نے یوسف کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر لیوی' یوسف کی طرف مڑا۔ "تو یہ ہیں مسٹر ڈیوڈسن' جنہوں نے قدیم نسل کی طویل العمری سے متعلق ذہانت آمیز تھیوری پیش کی ہے۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "بین آئزک نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے یوسف سے ہاتھ ملایا۔ اس کی گرفت میں سختی تھی۔

"ڈاکٹر لیوی بے حد مہربان اور بہت قابل آدمی ہیں۔" جینا میلکم کہہ رہی تھی۔ "بین آئزک نے انہیں یہاں ہماری آمد کا مقصد بتا دیا ہے۔ ڈاکٹر لیوی نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے مطلوبہ مقام تک ہماری رہنمائی کریں گے۔"

یوسف کو اپنی پشت پر روئیں کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ صورت حال غیرمتوقع تھی اور وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ "آپ کا مطلب ہے' تاریخی اہمیت کے کسی مقام پر کھدائی کے سلسلے میں ڈاکٹر لیوی ہماری مدد کریں گے؟ کیونکہ ہم یہاں اسی مقصد سے آئے ہیں۔" اس نے کہا۔

جینا نے اسے تیز نظروں سے دیکھا "ہرگز نہیں۔" وہ بولی۔ "ڈاکٹر لیوی اس مقام سے واقف ہیں' جہاں کے لوگ شجر زندگی کا پھل کھاتے ہیں۔ یہ ہمیں وہاں لے جائیں گے۔"

یوسف پھٹ پڑا۔ "کیا؟ کہاں لے جائیں گے؟" درحقیقت اسے بہت بڑا شاک لگا تھا۔ بین آئزک اور وہ بڈھا فراڈ کتنی صفائی سے اس کی اسکیم کو لے اڑے تھے۔ غضب خدا کا! انہوں نے کوئی جگہ بھی منتخب کرلی تھی اور اب بے وقوف بڑھیا کو وہاں لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اسی لئے تو بڑھیا کا چہرہ اتنا چمک رہا تھا۔ وہ دونوں خبیث اس کی سوچی ہوئی اسکیم پر پوری طرح قابض ہونے کے چکر میں تھے "ایک منٹ خاتون!" اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "بات صاف ہو جانی چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ بڈھے فراڈ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ بین آئزک اسے ڈبل کراس کرنے کے لئے جانے کہاں سے اسے پکڑ لایا ہے۔ "آپ کہتے ہیں کہ آپ بین آئزک کے انکل ہیں؟" اس

نے کہا۔

"ہاں، اور میں اپنے بھتیجے کو زندہ سلامت دیکھ کر بڑی سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔

"اور آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور ہمیں کس چیز کی تلا
ہے؟"

ڈاکٹر لیوی مسکرایا۔ "ہاں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انسان تو طویل عرصے سے ا
چیز کی جستجو کر رہا ہے.........." وہ ہچکچایا، پھر دوبارہ مسکرایا۔ "شاید اس وقت سے، جہ
اسے جنت سے دیس نکالا ملا تھا۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کے کئی نام ہیں۔ مختلف وقتوں میں وہ مختلف روپ میں سامنے آتی رہ
ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا "لیکن یہاں، جہاں اشے یاد رکھا گیا، اسے شجر زندگی کا پھل ک
جاتا ہے۔"

"اور اسے کھا کر آدمی پانچ سو سال تک جی سکتا ہے؟" یوسف کو اس کی ڈھٹائی
حیرت ہو رہی تھی۔ اسی کی باتوں کو اس کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے دہرایا جا رہا تھا۔ جبکہ
وہ خود جانتا تھا کہ یہ جھوٹ جینا میلکم کو بہلانے کے لئے.......... پھنسانے کے لئے اس ن
گھڑا تھا۔ اب اسے یہ دیکھنا تھا کہ بڈھا فراڈ کس حد تک آگے جانے کے موڈ میں ہے۔

ڈاکٹر لیوی نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ شاید اسے اس کے لہجے میں تمسخر محسوس
ہوگیا تھا لیکن اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس پر برہم نہیں ہے۔ "ہاں۔ روایات ا
یہی کہتی ہیں بشرطیکہ ان پر یقین کر لیا جائے۔" اس نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب
سی چمک لہرائی۔ "اور یہ وہ سرزمین ہے، جہاں بیشتر روایات پر یقین کیا جاتا ہے کیونکہ عام
طور پر ان کی بنیاد میں سچائی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو بہت کچھ یاد ہے، اور یہ لوگوں
کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کیا یاد رکھتے ہیں اور کیا بھول جاتے ہیں۔"

یوسف نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "جی ہاں۔ اب یہ بتائیں کہ وہ چیز ملے گی
کہاں؟"

ڈاکٹر لیوی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "کوہ ہرمن کی ڈھلوانوں پر ایک پوشیدہ گاؤں
ہے جو بیت الجبل کہلاتا ہے۔ عام لوگ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ میں برسوں پہلے ایک بار
وہاں گیا تھا۔ اسے بزرگوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس گاؤں کے بہت سے لوگ
بہت زیادہ معمر ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ شجر زندگی کا مقدس راز ان کے قبضے میں ہے۔ اگر

ہم خوش قسمتی سے وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو.........."

"ہم وہاں ضرور پہنچیں گے.......... ہمیں پہنچنا ہوگا۔" جینا نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے کہا ہے کہ تم ایک بار وہاں جا چکے ہو.........."

ڈاکٹر لیوی نے سر گھما کر جینا کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں عجیب سی نرماہٹ اتر آئی "جی ہاں، لیکن یہ دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اب وہ گاؤں ایک ایسے ملک کی سرحد پر ہے، جس سے ہماری سرد جنگ چل رہی ہے لہٰذا دشواریاں تو ہوں گی۔ مگر.........."

جینا میلکم نے پھر مداخلت کی۔ "دشواریاں تو ہوتی ہی اس لئے ہیں کہ انہیں دور کیا جائے، ان سے گزر جایا جائے۔"

یوسف اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ منصوبہ سادہ لیکن کھلم کھلا احمقانہ اور ناقابل یقین تھا.......... بے وقوف بنانے والا۔ ایک ایسا گاؤں، جہاں پہنچنا ناممکن ہے! کم بختوں نے کوئی نئی بات پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بین آئزک کی طرف مڑا۔ "اس شخص کو تم نے کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟"

بین آئزک نے تیز لہجے میں کہا "بدتمیزی سے بات مت کرو۔" اسے یوسف کی بے یقینی اور معاندانہ رویے کا احساس ہوگیا تھا اور اسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس کرشمے پر خوش تھا کہ قدرت نے بچپن کے بچھڑے ہوئے چچا سے اسے ملا دیا ہے، لیکن یوسف کے رویے نے اس کی خوشی کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟" یوسف نے اسے یاد دلایا۔

"شمال کے علاقے میں.......... میتلا کے مقام پر۔" بین آئزک نے جواب دیا۔ حیفہ سے نکل کر اس نے سیدھا ویزمین انسٹیٹیوٹ کا رخ کیا تھا۔ وہاں استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نتھانیل لیوی نے اپنی پوزیشن اور تمام ٹائٹلز کو خیرباد کہہ دیا ہے اور لبنانی بارڈر کے قریب کہیں فرضی نام سے زندگی گزار رہا ہے۔

"یہ تمہیں ملے کیسے؟"

"تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

بس کے ذریعے اور پیدل سفر کرکے بین آئزک نے اس علاقے کو چھان مارا۔ بالآخر میتلا کے باہر ایک قطعہ زمین پر ایک بڈھا شخص زمین کے سینے سے آلو نکالتا نظر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔

اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے نتھانیل لیوی نے پکار کر کہا "بین

آئزک.......... یہاں تک پہنچنے میں تمہیں بہت عرصہ لگا۔ بہرحال خوش آمدید..........

پھر اس نے بین آئزک کو اپنی بانہوں میں بھینچ بھینچ کر خوب پیار کیا۔ بین آئزک کو پہلی احساس ہوا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے۔

"اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے سائنس داں اور اسکالر انکل ہیں۔" یوسف سخت لہجے میں کہا "جن کا تم نے کراچی میں مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔"

"ہاں' یہ وہی انکل نتھانیل ہیں۔"

"اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

بین آئزک کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خطرناک چمک ابھر لیکن ڈاکٹر لیوی نے بڑے سکون سے کہا۔ "ثبوت تو بڑی آسانی سے مل جائے گا بشرطیکہ ہمارے دلوں میں جھانک سکو۔"

بین آئزک کے دل میں بڈھے چچا کے لئے محبت کی ایک موج سی اٹھی۔ اس محبت اور اعتبار ہی کے زور پر تو اس نے چچا کو جینا میلکم کی کمزوری اور جوزف ڈیوڈسن کی فراڈ کی اسکیم کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔ اس نے چچا کے سامنے ضمیر کا وہ بوجھ ہلکا کرد تھا جو جینا کو بے وقوف بنانے کے سلسلے میں وہ محسوس کرتا تھا۔

ڈاکٹر لیوی خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ بغیر ایک حرف ملامت ادا کئے اس نے شرو سے آخر تک پوری کہانی بغور سنی تھی۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد ڈاکٹر لیوی نے پوچھا تھا۔ "کیا وہ عورت اب بھی خدا پر ایمان رکھتی ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ ہر روز بائبل کا مطالعہ کرتی ہے۔"

"تم بہت مشکل حالات سے گزرے ہو بین آئزک۔ اپنی سناؤ' تمہارا خدا پر یقین باقی ہے؟" چچا نے پوچھا تھا۔

"جی ہاں انکل۔ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں اور اسی کے لئے لڑتا ہوں۔ میرے اجداد کی طرح وہ میرا بھی خدا ہے۔"

ڈاکٹر لیوی نے مسکراتے ہوئے کہا "تم داؤد کے لڑاکوں کی طرح بات کر رہے ہو۔" پھر وہ دیر تک خاموش رہا۔ وہ دونوں چھوٹے سے مکان کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ بالآخر ڈاکٹر لیوی نے ایک گہری سانس لی اور اٹھا "بین آئزک اٹھو' ہم اس کے پاس جائیں گے۔" اس نے کہا "میں یہاں پر سکون زندگی گزار رہا ہوں' ترکاریاں اگا رہا ہوں لیکن تم نے اسے زبان دی ہے' اور وعدہ کیا جائے تو پورا بھی ہونا چاہئے۔ ممکن ہے' ہم تمہارے لفظوں کو خدا کی رحمت سے سچ ثابت کر دیں۔ شمال کی طرف ایک ویسا ہی قبیلہ آباد ہے' جیسا تم نے ضرورت مند خاتون کے سامنے بیان کیا تھا۔ اگر ہم خاتون کو وہاں پہنچا دیں تو کم از کم وعدے کا ایک حصہ تو ایفا کر ہی دیں گے۔"

"لیکن انکل' میں نے تو اس سے ابدی زندگی کی بات کی تھی۔ اس کا کیا ہوگا؟"

بوڑھا چچا کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ "وہ تو بہت مشکل ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ تو خدائی حقیقت ہے۔"

جوزف ڈیوڈسن کا کاٹ دار لہجہ بین آئزک کو حال میں کھینچ لایا۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھ سے دل کی بات مت کرو ڈاکٹر۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

اب اس کا رویہ جینا میلکم کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ "مسٹر ڈیوڈسن!" اس نے سرد لہجے میں کہا "میں تم سے مطالبہ کرتی ہوں کہ ڈاکٹر نتھانیل لیوی کے ساتھ احترام سے پیش آؤ۔"

"مس میلکم' اس مہم کا انچارج ہونے کے ناطے آپ کو تحفظ فراہم کرنا میرا فرض ہے۔ اور یہ شخص.........."

"بس' بہت ہو چکی مسٹر ڈیوڈسن!" جینا نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "اب تم ڈاکٹر لیوی کے احکامات کے مطابق عمل کرو گے۔ کھدائی کے آلات اور ہم سب کا خیال رکھنا تمہاری ذمے داری ہوگی لیکن انچارج ڈاکٹر لیوی ہوں گے' وہ بھی اس شرط پر کہ تمہارا رویہ مہذبانہ رہے۔ اس صورت میں ہمارے درمیان جو شرائط طے پائی تھیں' ان پر میری طرف سے عمل ہوگا۔ سمجھ گئے؟ ڈاکٹر لیوی بعد میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے ضروری امور پر ڈاکٹر لیوی سے تبادلہ خیال کرنا ہے۔"

O-----O-----O

یوسف ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ وہ برہم بھی تھا اور پریشان بھی۔ اسے جینا میلکم کے کمرے سے واپس آئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ وہ اس معمے کی کڑیاں ملانے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک حقیقت سے بہرحال انکار ممکن نہیں تھا۔ شکست کے قریب ترین لمحے میں بین آئزک کی واپسی اسے دوبارہ کھیل میں واپس لے آئی تھی' اور وہ واپسی بے حد غیر متوقع تھی' لیکن کھیل میں وہ واپسی بھی کیا واپسی تھی! ایک بڑے مداخلت کار نے جو یقیناً فراڈ تھا' اسے کیپٹن شپ سے ہٹا کر بارھواں کھلاڑی بنا دیا تھا۔ شاید بین آئزک کو

یقین تھا کہ وہ ایک دہقان کو اسکالر بنا کر پیش کرے گا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا یوں وہ پورے میدان پر قابض ہو جائے گا۔

یوسف کو اس امر میں ذرا شبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر لیوی فراڈ ہے۔ اس نے جینا کو دیومالائی' ناموجود گاؤں لے جانے کا خواب دکھایا تھا' جو پہلی بار خود یوسف نے ہی سوچا تھ ظاہر ہے ایسے گاؤں کی تلاش میں تو برسوں گزر سکتے تھے۔ پھر وہاں وہ ناموجود شے تلا کرنا' جس کی مدد سے جینا کی عمر طویل ہو جائے! ہاں......... یہی تو خود اس کا پروگرام لیکن بڈھا فراڈ اس کو ہائی جیک کر چکا تھا اور اب وہی مہم کا انچارج تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ ذرا سی ہی دیر میں جینا میلکم کو پوری طرح قائل کر چکا ہے اسے اپنی افادیت اور اہمیت کا یقین دلا چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ یوسف کہیں بڑھ کر چرب زبان ہو گا۔ صورت حال وہی کی وہی تھی' منصوبہ بھی وہی تھا۔ فر صرف اتنا تھا کہ اب صورت حال پر یوسف کا کنٹرول نہیں رہا تھا۔ وہ اس کھیل میں ا بھی موجود تھا تو صرف اس لئے کہ وہ جینا میلکم پر اپنی انتظامی صلاحیت ثابت کر چکا تھا لیک اس سے کب تک کام چلتا؟ اسے یقین تھا کہ بین آئزک اور ڈاکٹر لیوی یا وہ جو کوئی ہے' موقع ملتے ہی اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔

اب یوسف راحیلہ کی پوزیشن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس بدلی ہوئی صورت حا میں جبکہ اس کی پھوپھی کی دولت پر حملہ ایک طرف سے نہیں' دو طرف سے ہو رہا ہے' کس کا ساتھ دے گی؟ اس کا جواب بے حد آسان تھا۔ جہاں اسے زیادہ فائدہ نظر آ گا......... یعنی بین آئزک کے کارنر میں......... اور اگر اس عمل میں جوزف ڈیوڈسن حصے میں ذلت آتی ہے تو یہ بات راحیلہ کے لئے طمانیت بخش ہو گی۔

لیکن اگر وہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جوزف ڈیوڈسن اتنی خاموشی سے......... بغ کچھ کئے زندگی کی سب سے اہم دوڑ میں شکست تسلیم کر لے گا تو وہ احمقوں کی جنت م رہتے ہیں۔ جوزف ڈیوڈسن زندگی کے سب سے بڑے داؤ میں پتے شو کرائے بغیر ہار نہی مانے گا۔

افسوس اسے سب سے زیادہ اس بات کا تھا کہ اس جیسے عقل مند اور جہاں دید آدمی کو ایک عام سے پناہ گزین نے لوٹ لیا تھا۔ اس نے اس کے پنجوں سے اس کی زند کا سب سے قیمتی شکار چھین لیا تھا اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر لیوی سچ مچ ڈاک نتھانیل لیوی ہی ہو۔

یوسف نے فیصلہ کیا کہ اسے بہت احتیاط سے کام کرنا ہو گا اور صبر و تحمل سے کام لینا ہو گا۔

* * *

یوسف اور ڈاکٹر لیوی یروشلم میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے دوستانہ ہم مشربی میں مصروف تھے۔ سامنے قدیم شہر کے آثار' دیواریں اور مینار نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کا انداز بظاہر دوستانہ تھا لیکن یوسف کے ذہن میں دوستی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو پتے شو کرانے کے موڈ میں تھا۔

جینا میلکم اپنے کمرے میں تھی اور غصے میں تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس پر زیارتیں تھوپ دی تھیں۔ جبکہ وہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اس تاخیر پر وہ برہم تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مصر تھا کہ وہ عام سیاحوں کی طرح سفر کریں گے تاکہ ان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں۔ اسی لئے انہوں نے سب سے پہلے یروشلم کا رخ کیا تھا۔ اب وہ یہاں اپنے خطوط کے جوابات کا منتظر تھا جو اس نے میتلا پوسٹ کئے تھے۔

یوسف فکر مند تھا۔ اسے ڈر تھا کہ خراب موڈ میں جینا اس پر الٹ پڑے گی۔ اب وہ اس کے لئے غیر ضروری جو تھا۔ وہ کسی بھی وقت اسے نکال سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یوسف کے لئے ضروری تھا کہ وہ دوبارہ اپنی اہمیت ثابت کرے۔ ایسے میں اسے ایک پرانی کہاوت یاد آئی۔ جب کسی کو شکست نہ دے سکو تو اس کے حلیف بن جاؤ۔

اسی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر لیوی کو دعوت دے ڈالی۔ اب وہ ٹیرس پر بیٹھے پی رہے تھے۔ یوسف وہسکی سے شغل کر رہا تھا جب کہ ڈاکٹر لیوی کے ہاتھ میں مارٹینی کا جام تھا۔ وہ جام کو پرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے خوشی ہویدا تھی۔

"بہت خوب!" ڈاکٹر لیوی کہہ رہا تھا۔ "برسوں بعد میں نے مارٹینی چکھی ہے۔ بلکہ اسرائیل آنے کے بعد یہ پہلا موقع ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں مسٹر ڈیوڈسن۔"

یوسف نے رسمی باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "میں سوچ رہا ہوں ڈاکٹر لیوی کہ مجھے اپنے کھیل میں شامل کرنے کا اس سے مناسب وقت اور کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

ڈاکٹر لیوی کا ردعمل یوسف کی توقع کے مطابق نہیں تھا۔ نہ تو اسے الفاظ کے

نامناسب چناؤ پر غصہ آیا' نہ ہی اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ اس نے بڑے سکوا سے جام سے ایک گھونٹ لیا اور جام کو میز پر رکھ دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم لفظ "کھیل' استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کھیل کہہ لو' شعبدہ کہہ لو یا فراڈ۔ جو جی چاہے کہہ لو۔ میں صرف یہ جاننا چاہت ہوں کہ تم آخر ہو کس چکر میں۔ اگر بات معقول ہے تو ہم مل کر کام کرسکتے ہیں۔ می تمہاری مدد کروں اور تم میری مدد کرو لیکن میں اپنی پوزیشن بہرحال جاننا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "ویسے تمہاری تشویش میری سمجھ سے باہر ہے۔ پھر بھی کہو' کہاں سے شروع کروں؟"

"خود سے شروع کرو۔ یہ کسان والا کیا چکر ہے؟ ڈاکٹر نتھانیل لیوی اور سبزیوں کی کاشت! تم کسے بے وقوف بنا رہے ہو اور مقصد کیا ہے تمہارا؟" یوسف نے ہر تکلف بالائے طاق رکھ دیا۔ "بین آئزک نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا چچا ربی رہ چکا ہے' ماہر آثار قدیمہ ہے اور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ اس کے پاس یورپ کی ممتاز یونیورسٹیوں کی اسناد موجود ہیں.........."

ڈاکٹر لیوی نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی در آئی "یہ درست ہے کہ میرے پاس ڈگریاں ہیں مگر بدقسمتی سے زراعت کی ڈگری نہیں ہے میرے پاس جبکہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اسی ڈگری کی ہے۔"

"اگر تم بین آئزک کے چچا نتھانیل لیوی ہو تو شمال کے اس گاؤں میں تمہارا کیا کام؟ تمہیں تو تل ابیب یونیورسٹی میں یا کسی اور انسٹی ٹیوٹ میں درس و تدریس میں مصروف ہونا چاہئے تھا۔" یوسف نے اعتراض کیا۔

ڈاکٹر لیوی نے یوسف کو بغور دیکھا۔ "نوجوان' تمہیں یہاں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ سمجھ سکو۔ لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔ اسرائیل کو کسی فلسفے کی نہیں' سب سے زیادہ ضرورت غذا کی ہے۔ میں وہ کام کر رہا ہوں' جس کی میرے خیال میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بہرحال اگر تمہاری تسلی کے لئے یہ ضروری ہے تو میتلا پہنچ کر تمہیں اپنی ڈگریاں بھی دکھا دوں گا۔ اور بتاؤ.......... کیا الجھن ہے تمہیں؟"

یوسف کو ایسا لگا' جیسے وہ مذاق بن رہا ہے۔ اسے احساس ہوگیا کہ ڈاکٹر لیوی کوئی سادہ لوح دہقان نہیں.......... وہ ذہین تھا.......... تعلیم یافتہ تھا اور شاید اس سے بڑھ کر عیار بھی تھا۔ "الجھنیں تو بہت سی ہیں۔" اس نے کہا "مثلاً یہ کہ تم مس میلکم کو کہاں لے

نے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"بیت الجبل' جسے بزرگوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔"

"یہ کہاں ہے؟"

"سرحد کے پار.......... شام کی حدود میں.......... کوہ ہرمن کی ڈھلوانوں پر۔" ڈاکٹر ی نے جام سے ایک اور گھونٹ لیا۔ "تمہیں تو اس روایت کے متعلق علم ہوگا۔ طوفان ح کے دوران دو پہاڑ ایسے تھے' جہاں سیلاب کا پانی نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک تھا کوہ رات اور کہا جاتا ہے کہ دوسرا کوہ ہرمن تھا۔"

"سرحد پار کرنا خطرناک ہے؟"

"یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر شام کی طرف سے کیوں نہ داخل ہوا جائے؟"

"بات معقول ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن مسئلہ یہ کہ ہم تیکنیکی اعتبار سے اس وقت شام کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ مجھے شام داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"ہمیں تو مل جائے گی۔" یوسف نے اطمینان سے کہا "اور ہم تمہارے بغیر بھی جا ہیں۔ تم ہمیں ہدایات دے دو.......... راستہ سمجھا دو۔"

"یہ بات اتنی معقول نہیں۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا پھر بولا "ایک اور جام منگوا لوں؟ ل کا ترسا ہوا ہوں۔ تمہارے لئے اسکاچ کا آرڈر دے دیتا ہوں۔" اس نے ویٹر کو ے سے بلایا اور اس سے رواں عبرانی میں کچھ کہا پھر وہ یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔ ا' تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ عقل مندی نہیں۔ تم اس علاقے سے ناواقف ہو۔ وہ گاؤں ، تلاش کروگے؟ اور اگر تم نے گائیڈز کی خدمات حاصل کیں تو اپنے سفری غرض و ا کو نہیں چھپا سکو گے۔ پھر وہاں ایسے قبائل بھی موجود ہیں جو مس میلکم کے زبردستی نا بن کر تاوان وصول کرنے کی سعادت ضرور حاصل کریں گے۔ اور آخری .... اگر تم اتفاق سے بیت الجبل پہنچ بھی گئے تو وہاں کے لوگوں سے کس زبان میں کروگے؟ انہیں کیسے بتاؤ گے کہ تم کیوں آئے ہو؟"

"تو تم نے ہر بات کا خیال رکھا ہے۔ ہر بات کا جواب ہے تمہارے پاس؟" یوسف ہریلے لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔" ڈاکٹر لیوی نے سادگی سے کہا۔

"اچھا اس گاؤں میں ہے کیا؟"

"کچھ چھوٹی جھونپڑیاں ہیں' پتھر کے مکانات ہیں' کچھ غار ہیں' بہت سے معم اور عورتیں ہیں.......... یہ وہ لوگ ہیں' جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے و لوگوں کی طویل العمری کا راز پالیا ہے۔"

یوسف سوچ رہا تھا' بڈھا واقعی بہت تیز ہے۔ میری پوری تھیوری اور گھڑی ، مکمل کہانی پر قابض ہو بیٹھا ہے۔ "یہ بتاؤ' کیا ان کا خیال درست ہے؟ کیا وہ واقعی طو العمری کے راز سے واقف ہوگئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"اور وہ مادہ کس نوعیت کا ہے؟"

"کھمبی کی طرح کی کوئی چیز ہے۔ میرا خیال ہے' غاروں میں اگائی جاتی ہے۔"

"تم وہاں جا چکے ہو؟"

"ہاں۔"

"کیوں گئے تھے؟"

ویٹر ڈرنکس لے آیا۔ ڈاکٹر لیوی نے جیب سے چمڑے کا پرس نکال کر ڈرنکس ادائیگی کی پھر اس نے جام بلند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری صحت کے نام مسٹر ڈیوڈسن پھر اس نے یوسف کے سوال کا جواب دیا۔ "تم بھول رہے ہو کہ میں سائنس داں ہوا میری فطرت میں تجسس بہت زیادہ ہے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ "اور ا وجہ اور بھی تھی۔ میں وہاں بارزی لئی نام کے ایک شخص سے ملنا چاہتا تھا۔"

یوسف تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ کچھ بھی ہو' وہ خود پر قابو رکھے گا۔ لیکن یہ نام سن اس کو اپنے رد عمل پر قابو نہیں رہا۔ "بارزی لئی!" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "تم مطلب ہے' وہاں سچ مچ بارزی لئی نام کا کوئی آدمی موجود ہے؟"

ڈاکٹر لیوی کو اس کے تعجب پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ "یہ کوئی نامانوس نہیں.......... خاص طور پر ہمارے خاندان میں۔" اس نے کہا "یہی وجہ ہے کہ میں ج بھی کہیں یہ نام سنتا ہوں تو ملاقات کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔"

یوسف اب تک اتنی بری طرح نہیں دہلا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا بارزی لئی کا نام اس نے گھڑا تھا یا بین آئزک نے۔ "اس بارزی لئی کی عمر کتنی تھ اس نے پوچھا۔

"مجھے اندازہ نہیں۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا "بہرحال وہ بیت الجبل کے بزرگ ترین ون میں سے تھا۔ اسے خود بھی اپنی عمر کے متعلق معلوم نہیں تھا لیکن یادداشت اس کی ب کی تھی.......... بہت زیادہ پرانی باتیں بھی اسے یاد تھیں۔"

یوسف اگر خود پر قابو نہ پاتا تو یقیناً آپے سے باہر ہو جاتا۔ بڈھا اسے بالکل ہی بے ف سمجھ رہا تھا۔ اب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ بین آئزک اور بڈھے فراڈ نے مل کر بردست ہنڈیا پکائی ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر گمشدہ گاؤں' جس کا پتا صرف ایک شخص کو لوم تھا۔ پر اسرار کھمبی اور وہ راز جس کی حفاظت کی جاتی تھی' جسے کسی پر افشا نہیں کیا تا تھا۔ اب اگلے مرحلے میں بڈھا فراڈ ایک پرانا بوسیدہ نقشہ پیش کرے گا' جس پر پوشیدہ ے میں داخلے کے مقام پر دو ہڈیاں اور ایک کھوپڑی بطور علامت بنے ہوں گے..........

ڈاکٹر لیوی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا "میرے پاس بیت الجبل کے راستے کا ایک ف نقشہ موجود ہے۔" اس نے کہا "وادی بیت الجبل میں داخلے کا راستہ عام نظروں سے شیدہ ہے۔ میں نے دس سال پہلے وہاں سے واپس آتے ہوئے یہ نقشہ بنایا تھا۔"

یوسف نے نقشے کا جائزہ لیا۔ ہڈیاں اور کھوپڑی ندارد تھی۔ باقی وہ ویسا ہی تھا' جیسا ں نے سوچا تھا۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس کے اندازے درست ہونے کا مطلب تھا لہ فراڈ بے حد روایتی انداز میں کیا جا رہا ہے۔ کم بخت اوریجنلٹی کا خیال بھی نہیں رکھ ئے۔ ذہانت کا مظاہرہ بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ بات اور واضح ہوگئی تھی کہ بین ائزک نے بڈھے کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسے اعتماد ہوگا کہ جینا پر اپنے بھرپور تاثر اور اکٹر لیوی کی ساکھ کی بنیاد پر یوسف ان کا راستہ نہیں روک سکے گا.......... اور وہ جینا کو ں کی دولت سمیت اس کی ناک کے عین نیچے سے لے اڑیں گے۔

اس نے جام کو اتنی سختی سے بھینچا کہ اس کی پوروں پر سفیدی ابھر آئی۔ "ڈاکٹر وی' آپ بہت تیز ہیں۔ آپ بھی اور آپ کا بھتیجا بھی۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں۔ أپ کو بتاؤں کہ آپ کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟"

"میں ضرور سننا چاہوں گا لیکن پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور پوچھیں۔"

"تمہیں طویل العمری کی اس تھیوری کا خیال کیسے آیا؟ اس سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے۔ کروڑوں انسان بائبل پڑھتے ہیں لیکن ان میں تم دوسرے آدمی ہو' میری معلومات کی حد تک جس نے باضابطہ طور پر اس کی جستجو کی تجویز پیش کی ہے۔ تم سے پہلے

ڈبلن یونیورسٹی کے پروفیسر لائم اوموییرّ نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ یہ پندرہ سال پہلے کی با ہے۔ وہ اس جستجو میں مشرق وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اچانک بیمار پڑا مرگیا۔ وہ کوہ ہرمن پر وادی بیت الجبل میں یقیناً دلچسپی لیتا۔"

چند لمحے تو یوسف کو اپنا سر پانی میں تیرتا محسوس ہوا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ دیو وار قہقہے لگائے۔ یہ کیا تماشا ہے، کون کسے بے وقوف بنا رہا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا، اس عملی مذاق کا ہدف کون ہے؟ جینا میلکم؟ یا یوسف عالم؟ یا یہ سچ ہے کہ اپنی بے مائیگی ا معاشی بدحالی سے نجات کے لئے فراڈ کی ایک اسکیم بناتے وقت وہ کوئی سائنٹیفک حقیق دریافت کر بیٹھا ہے؟ اس نے اس راز کا خواب سوچا ہے، جس سے پوری دنیا میں صر دو پروفیسر واقف تھے اور اب جینا اپنی دولت کی مدد سے اس خواب کی تعبیر حاصل کر گی۔ پھر وہ اس جوہر حیات کو حلق سے اتارے گی اور صدیوں زندہ رہے گی.......... عظ فراڈ یوسف عالم کے سحرانگیز بیان کے عین مطابق۔ اس سے تو ثابت ہوتا تھا کہ یوسف عا جینیس ہے..........

اس نے خیالات کی یلغار کو روکا اور خود کو ہدایت دی.......... ذرا سنبھل ک یوسف.......... بے وقوف بننے کی کوشش مت کرو۔ بے وقوف بنانے کی ہر اسکیم می ابتدا میں مکھن کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص بہت تی ہے۔ ممکن ہے، یہ سچ کہہ رہا ہو لیکن یہ مت بھولو کہ یہ تمہیں دولت کے اس کھیل س باہر نکالنے کی کسی اسکیم پر عمل کر رہا ہے..........

"لیکن مقام کے معاملے میں تم غلطی پر تھے۔" ڈاکٹر لیوی نے اپنی بات جار رکھی۔ "جغرافیائی اعتبار سے نفتالی میں کامیابی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میرا خیال ہے، یہا بین آئزک نے تمہیں بھٹکا دیا۔ وہ بھی عام نوجوانوں کی طرح رومانیت پسند ہے اور حقائ اس کے پاس زیادہ نہیں۔ بہرحال، یہ بات ہے کہ اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ اس نے یوسف کے چہرے پر نظریں جما دیں او مارٹینی کا ایک گھونٹ لیا پھر وہ مسکرایا "ہاں.......... یاد آیا، تم مجھے میرے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کرنے والے تھے۔"

یوسف کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے دوسرا جام نہ قبول کیا ہوتا۔ دوسری طرف بڈھے پر مے نوشی نے کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کہا تھا.......... بین آئزک نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے.......... لیکن کیا کچھ؟ یہ کہ جوزف ڈیوڈ

ن دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا اور فراڈ ہے، جو دولت مند بوڑھی عورتوں کو بے وقوف بانے سے ذرا نہیں چوکتا؟ اور اگر سب کچھ بتا دیا ہے تو یہ بڈھا شخص خطرناک ہو گیا ہے۔ ر جینا پر اس کے اثر و نفوذ کو بڑھنے سے نہیں روکا گیا تو اصل اسکیم بنانے والے کا تو پتا ی صاف ہو جائے گا۔ یوسف یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے بین آئزک کو کیا کچھ بتایا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے بین آئزک کے سامنے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ جو تھیوری وہ جینا میلکم کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے، اسے خود اس پر یقین نہیں ہے۔ بلکہ اس نے ہمیشہ اس تھیوری پر کامل یقین ظاہر کیا تھا اور یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اسے سچ ثابت کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ اس صورت میں اس کے لئے ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔ کیوں؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ اس باخبر اور ہاں دیدہ بوڑھے کی شخصیت اس کے لئے پریشان کن تھی۔

وہ سوچ رہا تھا، یہ شخص کون ہے؟ کیا چیز ہے؟ بین آئزک نے بتایا تھا کہ وہ اپنے لم اور علمیت کے حوالے سے مشہور ہے۔ تو پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر ایک دور دراز لاقے میں ترکاریاں کیوں کاشت کر رہا تھا؟ اور اس کی تیز فہمی اور طمانیت کا راز کیا تھا؟ ور اسے دیکھ کر یوسف کو اپنے اعصاب کیوں چٹختے محسوس ہوتے تھے؟

یوسف خوفزدہ تھا کہ ڈاکٹر نتھانیل لیوی ایک فراڈ ہے۔ وہ بین آئزک کا انکل ہرگز نیں۔ وہ کوئی مقامی نوسرباز ہے، جسے بین آئزک نے انتقاماً اپنے ساتھ ملایا ہے۔ اس لئے کہ یوسف نے جس طرح کراچی میں اسے استعمال کیا تھا، وہ اسے پسند نہیں تھا۔

لیکن اب وہ اور خوف زدہ تھا.......... اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ ڈاکٹر لیوی رحقیقت اسکالر ڈاکٹر لیوی ہے۔

"اسے چھوڑو، بعد میں کبھی سن لینا۔" اس نے ترش لہجے میں کہا "یہ بتاؤ، یہاں کب تک رہنا ہوگا ہمیں؟ میں مس میلکم کا مزاج جانتا ہوں۔ وہ اپنی چلانے کی عادی ہے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ دشوار تر ہوتی جائے گی۔"

ایک بیل بوائے ان کی میز کی طرف آیا۔ "ڈاکٹر لیوی؟" اس نے پوچھا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف ایک ٹیلیگرام بڑھا دیا۔

ڈاکٹر لیوی نے لفافہ چاک کر کے ٹیلیگرام نکالا اور پڑھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی۔ وہ ٹیلی گرام جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "اب ہم شمال کی جانب سفر شروع

کرسکتے ہیں۔ انتظامات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ مس میلکم کی طرف سے بے فکر میں انہیں سنبھال لوں گا۔ اپنے ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بالکل پریشان کن ہوں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ اسرائیلی حکومت کو.......... بلکہ کسی کو بھی اس بات کی ملے کہ درحقیقت ہم کہاں اور کس مقصد کے تحت جا رہے ہیں۔ خود تم نے بڑی ذہا سے اپنی مہم کو ایک آڑ فراہم کی تھی۔ ہم اسی آڑ سے استفادہ کریں گے۔ اچھا.......... اب تم مطمئن ہو نا؟"

یوسف نے ایک گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اور ڈاکٹر لیوی کی جنگ ا ختم نہیں ہوئی ہے لیکن عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ فی الوقت جنگ بندی کرلی جا۔ اس نے کہا "میں ایک بات اور جاننا چاہتا ہوں۔ تم اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟ اپنا چھوڑ چھاڑ کر اتنی دشواریاں جھیلتے ہوئے جینا میلکم کو بیت الجبل کیوں لے جا رہے ہو؟"

ڈاکٹر لیوی جواب دینے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر اس نے ایک سر بھر کر کہا "تم عجیب آدمی ہو مسٹر ڈیوڈسن۔ تم نے پرانے واقعات سے ایک قرین قیا نظریہ اخذ کیا' پھر تم نے اس پر عمل کے لئے ایک دولت مند عورت کو آمادہ کیا۔ جو حیات کی تلاش کے سلسلے میں تم اس عورت کو فلسطین لے آئے۔ اب جبکہ تم اچا کامیابی سے بہت زیادہ قریب پہنچ گئے ہو تو.......... اتنے نروس' اتنے ناخوش لگ ر ہو۔"

"مجھے چھوڑو۔" یوسف نے کہا "میں تمہارا زاویہ نظر جاننے میں دلچسپی ر ہوں۔ تمہیں اس مشقت سے کیا حاصل ہوگا۔"

ڈاکٹر لیوی نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا "دیکھو.......... میرے بھتیجے۔ مس میلکم سے کچھ وعدے کئے' اپنے تخیل کے زور پر اسے کچھ خواب دکھائے۔ میں ا کا انکل ہوں.......... خاندان کا بڑا۔ سو یہ میری ذمے داری ہے کہ میں امکان کی حد تک اس کا قرضہ چکاؤں۔ یہ ہے اس معاملے میں میری دلچسپی کا سبب۔"

یوسف نے کندھے جھٹک دیئے۔ "اگر تم کہتے ہو تو یہی سہی" اس نے کہا لیک اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے اسے سب کچھ نہیں بتایا ہے۔

ڈاکٹر لیوی نے جام خالی کر کے رکھ دیا۔ "مسٹر ڈیوڈسن' برسوں کے بعد میں نے ا اچھا وقت گزارا ہے.......... اتنا انجوائے کیا ہے۔" اس نے بڑی سچائی سے کہا۔ اس آنکھوں میں معصومیت تھی۔ "میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

* * *

وہ یروشلم کی جس سڑک سے نکلے' وہ انہیں سورماؤں کے درے تک لے آئی۔ زورہ اور تمناث سے گزر کر وہ سنگلاخ اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے دوسری طرف ادی ایلاہ میں پہنچے۔

اس قافلے میں دو ٹرالر تھے' جنہیں جیپیں کھینچ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جینا ور راحیلہ کے لئے تھا اور دوسرے میں ڈاکٹر لیوی' بین آئزک اور یوسف تھے۔ اس کے لاوہ ایک اسٹیشن ویگن تھی' جس میں سامان رسد تھا۔ جینا کی ذاتی بڑی لیموزین تھی جسے وفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ قافلے میں باورچی کے علاوہ دوسرے ملازمین بھی تھے جو کیمپ لگانے ور اکھاڑنے کا کام کرتے تھے' اس کے علاوہ دیگر خدمات بھی انجام دیتے تھے۔

قافلے کی رفتار بہت سست تھی۔ وہ جگہ جگہ رکتے بھی تھے۔ ڈاکٹر لیوی اس تاثر کو بت کرنا چاہتا تھا کہ جینا ایک دولت مند عیسائی عورت ہے' جس کی اسرائیل آمد کا مقصد قدس مقامات کی زیارت اور بعض مقامات پر کھدائی کرنا ہے۔

ابتدا میں اس دکھاوے کی وجہ سے ہونے والی تاخیر جینا میلکم کو بے حد گراں گزری لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہی کہ آہستہ روی سے سہی' بہرحال اپنی منزل کی طرف بڑھ تو رہی ہے۔ وہ جب بھی کہیں رکتے تو اس سرزمین کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگتا۔ خود جینا بھی اس کے سحر سے نہ بچ پاتی۔ پھر ڈاکٹر لیوی جیسا آدمی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ہر مقام کے اریخی حوالے کو یوں بیان کرتا کہ سماں باندھ دیتا۔ وہ ماضی سے عشق کرتا تھا اس لئے ایسے موقعوں پر اس کے بیان میں عجیب سا حسن اور رنگینی آجاتی تھی۔

زورہ اور تمناث یادداشت کو جھنجوڑنے والے نام نہیں تھے۔ زورہ عربوں کا ایک پہاڑی گاؤں تھا۔ وہاں ایک سیمنٹ فیکٹری تھی' جس کی عمارات نیچے وادی میں تعمیر کی گئی تھیں۔ تمناث چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان واقع تھا۔

وہ سب جینا کے ساتھ اس کی لیموزین میں سفر کر رہے تھے۔ جینا سیمنٹ فیکٹری میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکی۔ "اس کا نام شمعونؑ کے نام پر رکھا گیا ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے بتایا۔ "یہیں وہ پیدا ہوئے تھے اور اس پہاڑی کے قریب ہی کہیں دفن ہیں۔"

جینا نے بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلایا۔ کار کچھ آگے گئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور بولی "تم نے سیمسن ہی کہا تھا نا؟"

"جی ہاں۔ شمعونؑ اور سیمسن ایک ہی بات ہے۔"

وہ تمناث پہنچے تو ڈاکٹر لیوی نے کھنڈرات کی طرف اشارہ کیا "کبھی یہ جگہ سر تھی۔ یہاں جامنی انگوروں کی بیلیں تھیں۔ آپ نے بائبل میں اس کا تذکرہ پڑھا ہوگا وہ جینا سے مخاطب تھا۔

جینا نے نفی میں سرہلایا۔ اس کا ذہن تو شمال کی آرزو میں الجھا ہوا تھا' جہاں لوگو کے پاس شجرحیات کا راز موجود تھا.......... جہاں کے لوگ بے حد طویل عمریں پاتے تھے

"بائبل میں اس کا تذکرہ کچھ یوں ہے کہ شمعون" تمناث واپس آئے۔ انگور باغ کے قریب ان کا ایک شیر سے سامنا ہوا اور انہوں نے شیر کی گردن یوں مروڑ د جیسے وہ کسی بچے کی نازک سی گردن ہو۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا "اور یہی وہ مقام ہے' جہا وہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت یہ جگہ سرسبز تھی مگر اب سنگلاخ زمین ہے۔ اب یہا دھول اڑتی ہے لیکن ایک بار پھر یہ زمین لہلہائے گی۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

جینا نے پھر اثبات میں سرہلایا۔

ڈاکٹر لیوی نے آگے جھک کر عبرانی میں ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے گاڑ سڑک سے اتار لی۔ وہ سڑک انہیں شمال میں لیڈا کی طرف لے جاتی۔ اب گاڑی ک راستے پر دوڑ رہی تھی۔ وہ راستہ انہیں دوبارہ پہاڑوں میں لے جا رہا تھا۔ ایک چٹانی چ کے پاس پہنچ کر ڈرائیور نے کار روک دی۔ وہ ایک تنگ ریتیلی وادی تھی' جسے دو چشمو نے تقسیم کردیا تھا۔

ڈاکٹر لیوی نے بین آئزک سے کہا "جانتے ہو' اس وقت کہاں کھڑے ہو؟"

"نہیں۔ کیا یہاں جنگ ہوئی تھی؟"

"یہ وادیِ ایلاہ ہے۔"

بین آئزک کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ "اوہ.......... مجھے سمجھ جانا چاہئے تھا۔" اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا اور جینا سے بولا "پلیز ماں.......... یہاں تھوڑی د ٹھہر جائیں۔ آہ.......... میں نے کتنی بار اس جگہ کو خواب میں دیکھا ہے۔"

یوسف نے جینا کی بدمزگی بھانپ لی "کیوں بھئی.......... کیا خاص واقعہ پیش آیا تھا یہاں؟" اس نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

وہاں تین جانب پہاڑیاں تھیں۔ نیچے درمیان میں ایک گھاٹی تھی اور ربع میل چوڑی مسطح زمین کی ایک پٹی تھی' جہاں گندم اور جو کاشت کی گئی تھی۔ ایک چھوٹے سے قطعے پر سورج مکھی کے پودے تھے۔

"یہاں ایک صاحب ایمان شخص نے اپنے سے کہیں طاقتور ایک گھمنڈی اور شیخی ے کا غرور خاک میں ملایا تھا۔" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

یوسف نے بڈھے اسکالر کو گھور کر دیکھا۔ اسے اس کا جملہ ذومعنی محسوس ہوا تھا۔ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کہیں اس پر طنز تو نہیں کر رہا ہے لیکن ڈاکٹر کے چہرے پر صرف معصومیت تھی۔ وہ وادی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت کی نگاہیں دور' بہت ماضی میں جھانکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ وہ مقام ہے' جہاں داوٗد نے دست بدست لڑائی میں گولائتھ کو ہلاک کیا تھا۔"

اس سادہ سے جملے میں جیسے کوئی سحر تھا' جس نے سب کو اسیر کرلیا۔ یوسف نے جسم میں سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"کیا.......... کیا کہا تم نے؟ کونسی جگہ ہے یہ؟" جینا نے چونک کر پوچھا۔

"درۂ ایلاہ کے اوپر وادی السنت کے اس سرے پر بنو اسرائیل تھے' جو وحشیوں حالت جنگ میں تھے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

"واقعی؟" راحیلہ نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے وادی کی طرف اشارہ کیا۔ "دونوں کے جنگ سے گریز کو سمجھنے کے لئے فوجی ماہر ہونا ضروری نہیں' یہ بات ایک عام بھی سمجھ سکتا ہے۔ بنو اسرائیل اس طرف والے پہاڑ پر تھے جبکہ دوسری چوٹی پر قابض تھے۔ وادی اتنی تنگ تھی کہ صرف قتل عام کے لئے ہی موزوں سمجھی جاسکتی ۔ کوئی فوج بھی اپنی بلندی کی پوزیشن سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی اور حملہ کرنے لئے نیچے اترنا ضروری تھا۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں' یہاں سے دیکھ کر بھی ازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنو اسرائیل نسبتاً مضبوط پوزیشن میں تھے اسی لئے وحشیوں نے طرف سے ایک ایک منتخب جنگجو کے درمیان مبارزت کی تجویز پیش کی۔ انہیں یہ بھی تھا کہ ان کے پاس گولائتھ جیسا دیو پیکر اور طاقتور لڑاکا موجود ہے.........."

"تو.......... تو وہ لوگ حقیقت تھے.......... سچ مچ کے تھے..........؟" راحیلہ کے میں حیرت تھی۔

بین آئزک نے خفگی سے کہا "تو کیا تم انہیں افسانوی کردار سمجھتی رہی ہو؟"

راحیلہ گڑبڑا گئی۔ ڈاکٹر لیوی' بین آئزک کی برہمی پر مسکرایا' "اب تصور کرو۔ پتھر ختم ہوچکا تھا' وہ دھات کا زمانہ تھا۔ جنگجو آہنی نیزوں' ڈھالوں اور خودوں سے لیس

تھے۔ دونوں طرف ہزاروں جنگجو تھے، جو نہ پہل کرنا چاہتے تھے اور نہ محاذ چھوڑنے لئے تیار تھے۔”

ڈاکٹر لیوی کی آواز اور لہجہ تخیل کو مہمیز کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب نگاہوں کے سامنے دو قدیم فوجیں صف آرا ہوگئیں۔ فوجوں کی نقل و حرکت کے نتیجے اٹھنے والے گرد و غبار کے بادل تک جیسے مجسم ہوگئے۔ ریت پر منعکس ہوتی دھوپ ڈھالیں چمچمانے لگیں۔

ڈاکٹر لیوی نے اپنی بات جاری رکھی۔ “یوں نو عمر چرواہا آگے آیا۔ اس کے پا ایک غلیل، پانچ گول ہموار چھوٹے پتھر اور خدا پر یقین کامل کے سوا کچھ بھی نہیں ۃ امکان یہی تھا کہ وہ پتھر اس نے یہیں چشمے کے کنارے سے اٹھائے ہوں گے۔ یہیں کے درمیان مقابلہ ہوا.......... شاید اسی جگہ، جہاں گندم کی فصل اور سورج مکھی کے ق کے درمیان دیوار ہے۔ دیو قامت گولائتھ نو فٹ کا تھا..........”

“تمہیں یقین ہے اس پر؟” یوسف نے مزاحیہ لہجے میں دریافت کیا۔

ڈاکٹر لیوی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ “تم سے زیادہ تو نہیں ہوگا۔” اس نے جوا دیا “تم ہی نے تو بین آئزک کو بتایا تھا کہ پرانے ڈھانچے کی دریافت سے پرانے لوگوں دیو قامت ہونے کی تصدیق ہوئی ہے۔” اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ “گولائتھ کے بار میں میرا اندازہ ہے کہ وحشی اسے اس انداز میں استعمال کرتے ہوں گے، جیسے اب ٹینک استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسے روکنے والی کوئی طاقت نہیں تھی لیکن جذبہ ایمانی کے زور غلیل سے پھینکے گئے ایک چھوٹے سے پتھر نے اسے تباہ کر دیا۔” اس نے توقف کیا اور جینا میلکم کی طرف مڑا۔ “میرا خیال ہے، اب واپس چلیں۔”

وہ پہلا موقع تھا کہ جینا کے انداز میں عجلت نہیں تھی۔ وہ کوئی جواب دینے بجائے نیچے وادی میں چشمے کے کنارے کو دیکھتی رہی.......... جیسے اس کی آنکھوں سامنے اس قدیم معرکے کا منظر ہو۔ پھر اس نے کہا “مجھے سب کچھ سناؤ۔”

ڈاکٹر لیوی نے بین آئزک سے کہا “تمہیں یاد ہے؟”

بین آئزک ایک چٹان سے ٹیک لگائے، ایک جنگجو کے نقطہ نظر سے اس مبارز کا تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں فوجوں کی عسکری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاک لیوی کی آواز سن کر وہ چونکا “وحشیوں کی جانب سے گولائتھ آگے بڑھا۔ اس کا قد.......... وہ خواب ناک لہجے میں دنیا کی اس قدیم ترین جنگ کا احوال بیان کرتا رہا، جس مہ

زدروں نے طاقتوروں کو زیر کیا تھا۔ وہ اب داؤدؑ کا خطاب دہرا رہا تھا۔ “تم میرے لے میں تلوار، نیزہ اور ڈھال لے کر آئے ہو جبکہ میں خدائے پاک کی طرف سے آیا ں، جس کے تم منکر ہو..........”

جینا سحر زدہ سی سن رہی تھی۔ اب جیسے اسے بیت الجبل پہنچنے کی جلدی نہیں تھی شاید اس لمحے اسے بیت الجبل یاد بھی نہیں تھا۔

“سو آج کے دن خدائے پاک نے مجھے تم پر فوقیت عطا فرمائی۔ میں تمہیں زیر وں گا.......... خاک میں ملاؤں گا اور آخر میں تمہاری گردن تن سے جدا کر دوں گا۔” آئزک دہرا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سا دبدبہ تھا۔

جینا کو اب اس سرزمین کے سحر نے پوری طرح اسیر کر لیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس رہا تھا کہ وہ جو خدا کو مانتی تھی تو اس یقین میں بھی ایک طرح کا پھیکا پن تھا.......... بے ل تھی۔ خدا اس کے لئے اب تک محض ایک لفظ رہا تھا.......... سفید کاغذ پر چھپا ہوا نام، جو کتاب کی جلد کے درمیان مقید تھا، لیکن اب پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وایک متحرک قوت ہے۔

“ہمیں لنچ لیڈا میں کرنا ہے۔” یوسف نے یاد دلایا۔

سحر جیسے ٹوٹ گیا۔ وہ سب گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ سفر شروع ہوگیا۔

وہ عجیب سرزمین تھی۔ وہاں قدیم و جدید آپس میں گھل مل جاتے تھے۔ گاؤں میں ف ستھرے مکانات تھے۔ بنگلے، جن کے سامنے پھولوں کی روشیں تھیں۔ جا بجا چھوٹے ٹے باغ تھے، مغرب کی طرف بہت اونچا ٹیلا تھا جہاں کھدائی کی گئی تھی وہاں سے ہڈیاں انک رہی تھیں۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے دیواروں کے آثار دیکھے۔ یہ وہ دیواریں ں، جہاں سول اور اس کے بیٹوں کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی سربریدہ لاشیں لٹکی ان کے نوں کی بے رحمی اور سفاکی کی کہانیاں سناتی رہی تھیں۔ یہ مقام بیت الشّین تھا۔ یہ سفر ، دوران پہلا مقام تھا جہاں عہد نامہ قدیم و جدید یکجا ہوتے نظر آئے تھے۔

وہ اس ٹیلے سے واپس آ رہے تھے، جو درحقیقت مدفن تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے اچانک لہ “یسوع مسیحؑ بھی یہاں ایک بار آئے تھے۔ انہوں نے یہاں دو کوڑھیوں کو خدا کی ضی سے شفا بخشی تھی۔”

جینا حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ “یہاں! یسوع مسیحؑ!”

“ہاں، وہ اس مقام سے واقف تھے۔ نزارتھ یہاں سے بمشکل پندرہ میل دور

ہو گا۔"

"نزارتھ!" جینا نے دہرایا اور گردوپیش کا یوں جائزہ لیا' جیسے اس مقام کو پہلی دیکھ رہی ہو۔ جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ وہ کھیت' وہ پہاڑیاں' وہ مکان.......... "نزارتھ قریب ہے!" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ "نزارتھ کیوں نہ چلیں ڈاکٹر؟" اس نے کہا۔

یوسف نے جلدی سے کہا "وہ ہمارے راستے سے ہٹ کر ہے مس میلکم۔ وہا پہنچنے کے لئے ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا اور اگر ہم نے قیام کیا تو ایک اور دن ضائع جائے گا۔ ہمیں تو ٹائبریس سے گزرنا ہے اور ہم جس قدر جلد.........."

جینا نے اثبات میں سر تو ہلا دیا لیکن درحقیقت وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ ڈا لیوی کی طرف مڑی۔ "کیوں ڈاکٹر' نزارتھ راستے سے بہت ہٹ کر ہے؟"

ڈاکٹر لیوی چند لمحے اس سوال پر غور کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی بالآخر اس نے کہا "نزارتھ کچھ لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے' ان کے لئے یہ مسافت ایک قدم کی ہوتی ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں' جو اس کے لئے ہزاروں میل کا سفر طے کر۔ ہیں' پھر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"ایک قدم.......... اور ہزاروں میل.........." جینا نے خواب ناک لہجے می دہرایا۔

وہ سب جینا کو بغور دیکھ رہے تھے۔ پہل راحیلہ نے کی۔ اس نے کہا "فاصلہ زیاد تو نہیں مس میلکم! ہمیں وہاں جانا چاہئے۔"

جینا نے ایک لمحے اسے حیرت سے دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں بولی "میں نزارتھ جا چاہتی ہوں مسٹر ڈیوڈسن!"

یوسف نے کندھے جھٹک دیے۔ وہ راحیلہ کے رویے کا تجزیہ کرنے کی کوشش ک رہا تھا۔

O-----O-----O

سفر جاری تھا۔ اس دوران فلسطین کی منفرد اور انوکھی فضا جینا میلکم پر اثرانداز ہ رہی تھی۔ اس نے اپنی شخصیت پر جو خول چڑھایا ہوا تھا' وہ چٹخ رہا تھا۔ اس نے زندگ صرف دولت کماتے' دولت بڑھاتے گزاری تھی۔ سفر اس نے متعدد کئے تھے لیکن پر تعیش۔ اور وہ ہمیشہ شہروں میں رہی تھی۔ اس نے صحرا نہیں دیکھے تھے' جنگل نہیں دیکھے

ھے۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اسے اپنی دنیا بہت چھوٹی لگنے لی تھی۔ اسے اپنے وجود میں بڑے بڑے خلا محسوس ہو رہے تھے اور اس بات کی خوشی نی کہ اب وہ خلا آہستہ آہستہ بھر رہے ہیں۔

وہ جانتی تھی کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز میں جلوہ نما ہے لیکن مایا جال میں بھی نگاہ اسے دیکھ نہیں پاتی۔ لیکن یہاں' اس سرزمین پر آنکھ سب کچھ دیکھنے لگتی ہے۔ ب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ ہر طرف جلوہ نما.......... ہر طرف.......... ہر طرف۔

اور وہاں کام ہو رہا تھا۔ جوان اور بوڑھے.......... سب مل کر کام کر رہے تھے۔ وہ ملیں اگا رہے تھے۔ برہنہ' بے آب و گیاہ پہاڑوں پر شجرکاری ہو رہی تھی۔ پانی کے سول کے لئے کھدائی کی جا رہی تھی۔ کہیں کوئی فیکٹری تعمیر ہو رہی تھی تو کہیں مکانات ائے جا رہے تھے۔

مگر ایک بات اسے بری لگی۔ اس سرزمین کے باشندوں کو ترقیاتی کاموں میں ظرانداز کیا جا رہا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں کے گاؤں بدحالی کی بدترین مثال تھے۔ وہاں غربت ی۔ جینا جیسی بے نیاز عورت کو بھی ان کی غربت کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور ں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"یہ سست لوگ ہیں۔ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔" ڈاکٹر لیوی نے بتایا۔

"غربت کے مارے ہیں' وسائل کی کمی ہے۔ اگر انہیں وسائل میسر ہوں.......... اہم کر دیے جائیں.........."

"تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ نہ بھولیں ہ یہ صدیوں اس سرزمین کے مالک رہے ہیں۔ ان کی کاہلی اور ناکارہ پن نے اس زمین کو صحرا بنا کر رکھ دیا ہے' اجاڑ دیا ہے اسے۔ ہم اس زمین کو اس کی شادابی لوٹانے ے لئے جان مار رہے ہیں۔"

"لیکن یہ ہے تو انہی کی۔" یوسف نے بے ساختہ کہا۔ اس نے خود کو قابو میں کھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چپ نہ رہ سکا۔

"ان کی نہیں.......... یہ زمین پوری دنیا کے لوگوں کی ہے.........."

"لیکن انہی پر تنگ کر دی گئی ہے۔" یوسف نے کہا۔ وہ اب بھی اس گفتگو کو ثیات کی حدود سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے ں پر زمین تنگ کر دی ہے لیکن اس نے عین وقت پر الفاظ تبدیل کر دیے تھے۔ وہ جانتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تھا کہ اس کے لئے اس بحث میں پڑنا نہ صرف فضول بلکہ مخدوش ہے۔ اس سرزمین پ اسے جوزف ڈیوڈسن ہی رہنا تھا۔ اس کے یوسف ہونے کا راز کھل جاتا تو شاید وہ زندہ نہ بچتا لیکن وہ اپنی ماں کی خواہش کے عین مطابق خالص مسلمان تھا اسی لئے اس مسلمانوں کی برائی نہیں سنی جا رہی تھی۔

"زمین تو یہاں ہم پر تنگ کر دی گئی تھی.........." ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

"میرا خیال ہے' آپ کے اجداد خود یہ زمین چھوڑ بھاگے تھے اور وجہ وہی تھی اب آپ فلسطینیوں سے منسوب کر رہے ہیں۔ آسمانی کتابیں گواہی دیتی ہیں کہ آپ کا اور ناکارہ تھے۔ آپ لوگ تو یہ چاہتے تھے کہ آپ کی جنگ بھی خدا لڑے.........."

"یہ درست ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے اداس لہجے میں کہا "لیکن مجھے خوشی ہے میری قوم نے صدیوں کی بے گھری سے سبق سیکھ لیا۔ یہ زبانی بات نہیں' اس کا مظاہرہ تم خود قدم قدم پر دیکھ رہے ہو۔ اب ہم محنت کرتے ہیں اور جو غلطی ہم کر رہے تھے' وہ اب عرب مسلمان کر رہے ہیں.........."

"لیکن کہلاؤ گے تو غاصب ہی۔" یوسف ایک کیفیت میں بولے جا رہا تھا..........

چاہنے کے باوجود۔

"کیوں؟ اس زمین پر ہمارا حق نہیں؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' صلیبی جنگیں" یوسف نے بروقت خود کو روک لیا وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ صلیبی جنگیں ہم نے لڑی ہیں۔ عیسائیوں کے ساتھ۔ ایک لمحے توقف کے بعد اس نے اپنا جملہ پورا کیا۔ "ہم نے مسلمانوں سے لڑیں۔ تم نے تو کو زحمت نہیں کی۔ اور تم جانتے ہو کہ اسرائیل کیسے وجود میں آیا۔ تم غاصب نہیں تو.........."

"بے خبر لوگ ہمیں غاصب کہیں تو مجھے برا نہیں لگتا۔" ڈاکٹر لیوی نے سادہ میں کہا "لیکن کم از کم فلسطینیوں کو ہمیں غاصب نہیں کہنا چاہئے۔ جانتے ہو' دولت یہودیوں نے جب فلسطین کا رخ کیا تو فلسطینیوں کی زمینیں خریدیں۔ فلسطینیوں نے ان بے وقوفی پر مسکراتے ہوئے ہنسی خوشی اپنی زمینیں انہیں بیچ دیں۔ یہ سوچ کر کہ انہیں اور ناکارہ زمین کے دام مل رہے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ آخر میں وہی زمین انہیں واپس مل جائے گی کیونکہ یہودیوں کو بالآخر مایوس ہو کر واپس جانا ہے' لیکن مایو فلسطینیوں ہی کے حصے میں آئی۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ یہودی کتنی محبت اور محنت سے کا

رہے ہیں۔ حقائق ہمیں غاصب نہیں' فلسطینیوں کو لالچی اور کاہل ثابت کرتے ہیں۔"

"اول تو مجھے اس بات پر یقین نہیں۔" یوسف نے تیز لہجے میں کہا۔ اسے اب خود یرت ہو رہی تھی۔ اسے بین آئزک سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔ بین آئزک طینیوں سے بحث کر رہا تھا۔ ایسے میں اس نے بین آئزک کو سمجھاتے ہوئے کہا .... "یہ مت بھولو کہ تم اس وقت ایک جذباتی قوم کے درمیان ہو۔" اس وقت کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس قوم کا فرد نہیں۔ لیکن اب وہ خود جذباتی ہو رہا تھا۔ ایسا پہلے ی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً اسی پوزیشن میں تھا' جس میں بین آئزک کو کراچی دوچار دیکھا تھا۔ وہاں بین آئزک کے چیتھڑے اڑ سکتے تھے تو یہاں وہ خود اسی نوعیت خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا دماغ تو کام کر رہا تھا لیکن اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں ۔ "اور اگر یہ درست بھی ہے تب بھی تم جانتے ہو کہ یوں نہ ہوتا تو یہ کام کسی اور ح ہوتا۔ اسرائیل تو ایک بین الاقوامی سازش کے تحت قائم ہوا ہے۔"

"حقائق میں اگر مگر کی گنجائش نہیں ہوتی۔" ڈاکٹر لیوی نے سرد لہجے میں کہا "اور اپنی بات ثابت کر سکتا ہوں لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ امریکا میں کوئی اینٹی اسرائیل بھی موجود ہے۔"

گفتگو اب نہایت خطرناک مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ یوسف کو اپنے ہاتھ پاؤں ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تاہم اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ "امریکا جمہوری ملک ہے' وہاں اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے' اور یہ سوچ رکھنے والا میں آدمی بھی نہیں ہوں وہاں۔"

"چھوڑو اس بحث کو۔" جینا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف ۔ "مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تم لوگ مقامی لوگوں کو' عرب بستیوں کو نظرانداز زیادتی کر رہے ہو۔ ان کے ساتھ بھی اور اپنے ساتھ بھی۔"

"میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں اس لئے کہ مجھے اس سرزمین سے ہی نہیں' اس کے ندوں سے بھی محبت ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں کہا "لیکن میں بااثر لوگوں کے نے اپنا موقف دہرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسرائیل بھی ایک جمہوری ملک ے۔"

یوں بات ختم ہو گئی۔ پہلی بار یوسف کو ڈاکٹر لیوی پر فتح کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر لیوی فعانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر دل ہی دل میں وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا

کہ ڈاکٹر لیوی بھی کسی حد تک درست کہہ رہا ہے۔ پانی کی تلاش میں زمین کا سینہ کے لئے ضروری نہیں کہ بھاری وسائل موجود ہوں۔ دو مضبوط بازو' ایک کدال پھاوڑا اور کچھ کرنے کا جذبہ بھی کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ فلسطین کی زبوں حالی کے ذ خود فلسطینی تھے اور ان کے عرب حکمراں۔ انہوں نے اس سرزمین کی دیکھ بھال دیانت داری سے ادا نہیں کیا تھا۔

اب وہ جس سڑک پر سفر کر رہے تھے اس کے اطراف میں درخت لگائے جا تھے۔ پودے ابھی بمشکل ایک فٹ اونچے ہوئے تھے۔ صحرا کی تپتی دھوپ میں شجر کا کام ہو رہا تھا۔ بالٹیوں اور ڈبوں میں پانی بھر بھر کے لایا جا رہا تھا۔ کام کرنے والے ا بدن سے ننگے تھے۔ ان کے جسموں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ چشموں اور کنوؤں سے بڑے ڈرموں میں پانی لانے کا کام ٹرکوں سے لیا جا رہا تھا۔

وہ جودہ کا علاقہ تھا' جسے اگلے پچیس برس میں جنگلاتی علاقہ بنانے کا پروگرام تھا راستے میں ان کا قافلہ جا بجا رکتا رہا۔ ڈاکٹر لیوی رک کر کام کرنے والوں سے کرتا' کچھ پوچھتا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ نہ کچھ کہتا۔ اسے جیسے وہاں جانے والے ہر کام میں دلچسپی تھی۔ وہ جیسے بیک وقت تین دنیاؤں میں رہ رہا تھا۔ میں' جو ان ٹیلوں کے پیچھے مدفون شہروں اور قلعوں میں دھڑک رہا تھا۔ حال میں' جو کی نگاہوں کے سامنے تھا اور مستقبل میں جو اس کے تصور میں تھا۔ یوسف اس چڑنے کے باوجود اسے پسند کرنے پر مجبور تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر انہیں ایک قوی الجثہ' باریش روسی نظر آیا۔ اس کا بالائی بدن دھوپ میں تمتما رہا تھا۔ رنگت جھلس گئی تھی۔ وہ زمین سے سر نکالتے ہ ایک ننھے سے پودے پر جھکا ہوا تھا۔ اجڑی ہوئی اس زمین پر وہ بھری بھری نئی نویلی کو مستقبل کی علامت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ روسی یہودی پودے کے اردگرد کی مٹ تھپتھپا رہا تھا۔ پھر اس نے چھوٹے سے ڈبے سے مٹی پر پانی ڈالا۔

ان کی موجودگی کا احساس کرکے روسی اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ میں نہا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے پودے کے اردگرد کی نرم مٹی پر ٹپک رہے تھے۔ اس آنکھوں میں افتخار تھا۔ اس نے جینا کو دیکھ کر عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ اس کی بات سن ڈاکٹر لیوی نے قہقہہ لگایا۔ "یہ کہہ رہا ہے' تم پر سلامتی ہو چھوٹی ماں۔ جنگ بہت تھی لیکن میں جیت گیا ہوں۔ یہ پودا شجر بن کر رہے گا۔" اس نے جینا کو بتایا۔

قریب کھڑے ایک اور شخص نے کہا "یہ کئی دن سے اس کے لئے پریشان تھا۔ ایسے جیسے یہ کوئی ننھی کونپل نہیں' اس کا نوزائیدہ بیمار بیٹا ہو۔"

وہ سب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

جینا نے کہا "اسے میری طرف سے مبارکباد دو۔ کہو کہ اس نے بہت بڑی جنگ جیتی۔ بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔"

"اور اسے یہ بھی بتاؤ کہ اس درخت سے سایہ حاصل کرنے تک یہ بہت بوڑھا ہوچکا ہوگا۔" یوسف نے کہا۔

اس بار روسی یہودی نے زوردار قہقہہ لگایا پھر اس نے عبرانی میں ہی جواب دیا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ پودا میں نے اپنے لئے نہیں لگایا۔" ڈاکٹر لیوی نے ترجمانی کی۔ "یہ اس نے اپنے بیٹے کے لئے لگایا ہے۔" پھر وہ یوسف سے مخاطب ہوا۔ "جو قوم محنت کرتی ہے' اس کے لئے عمر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' وہاں صرف تسلسل ہوتا ہے......... زندگی کا تسلسل!"

ان کی گاڑی آگے بڑھی تو بین آئزک نے سیلوٹ کے انداز میں روسی کی طرف اٹھ بلند کیا۔ ان کی نظریں ملیں۔ دونوں کی آنکھوں میں شناسائی چمکی پھر روسی نے جواباً یلوٹ کیا۔

گاڑی ذرا آگے بڑھی تو ڈاکٹر لیوی نے یوسف سے کہا "مسٹر ڈیوڈسن' تم پاکستان ں پیدا ہوئے ہو نا؟"

"جی ہاں۔"

"تو تم نے اقبال کو یقیناً پڑھا ہوگا۔"

"کون اقبال؟"

"اقبال......... شاعر' مفکر اقبال۔"

یوسف گڑبڑا گیا مگر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "اقبال کو ہر پاکستانی پڑھتا ہے" اس نے جواب دیا۔

"لیکن عمل نہیں کرتے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ ایرانی' وہ تورانی' یہ ہندی' وہ خراسانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہوجا"

یہ اقبال ہی کا شعر ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"اور.......... ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔ نیل کے ساحل سے۔ تابہ خاک کاشغر.......... یہ بھی اقبال ہی نے کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"یعنی ملت کا یہ تصور پاکستان میں پیش کیا گیا لیکن پاکستانی مسلمان اب تک، پٹھان' سندھی' بلوچ اور مہاجر ہیں۔"

"ہوا کریں' مجھے کیا۔" یوسف نے بے پروائی سے کہا لیکن اندر سے وہ زخمی تھا۔ "میں تو کرسچن ہوں۔" اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ اتر آیا۔ اس کے اندر کوئی للکار رہی تھی.......... مصلحت کا غلام سہی لیکن میں مسلمان ہوں' پھر وہ بولا "لیک نظریہ تو اچھا ہی کہلائے گا خواہ کسی نے پیش کیا ہو۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔ یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا "ہم اقبال کے نظریۂ ملت پر عمل کیا ہے۔ اسرائیل میں اتنی قومیتوں کے یہودی آباد ہ ان کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہیں کہ پورے اسلام میں نہیں بولی جاتیں لیکن یہاں نہ کوئی روسی ہے' نہ امریکی' نہ سویڈش نہ نارو نہ ولندیزی۔ یہاں سب اسرائیلی ہیں۔ ان کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت تھی۔ ہم نے ایک مردہ زبان کو زندہ کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس زبان کی مد نے سب کو ایک ڈوری میں پرو دیا' اور یہ اسرائیل تک ہی محدود نہیں' دنیا میں کہیں کوئی یہودی ہے' سب سے پہلے وہ اسرائیلی ہے پھر کچھ اور۔ یہ ہے اقبال کے ملت پر عمل۔ ہماری تعداد کم سہی لیکن ہم شرمندۂ ساحل اچھل پڑے ہیں۔ بے بھی ہو جائیں گے۔"

ایک نامانوس دکھ کی لہر نے یوسف کو اندر سے بھگو دیا لیکن وہ کہہ کچھ بھی سکتا تھا۔

زندگی میں پہلی بار یوسف اس انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے.......... پاکستانی ہے۔ ورنہ پوری زندگی اس نے صرف ضرورت مند بن کر سوچا تھا اور ضرو مند کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ انسان میں دینی' قومی حمیت ہوتی ہے اور اس پر ضرب لگے تو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ تین دن کے فاقے سے

اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر آہستہ آہستہ ایک انقلاب طوفان کی طرح سر اٹھا رہا ہے۔

تمام راستے وہ یہی کچھ دیکھتے رہے۔ ایک مملکت تعمیر کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ وہاں کوئی شخص بیکار نہیں تھا۔ ہر شخص کام کر رہا تھا' ایسے جیسے برسوں کے کسی بے گھر کو کوئی جھونپڑی مل جائے تو وہ اسے پہلے کچا اور پھر پکا مکان بنانے کی کوششوں میں لگ جاتا ہے۔ پھول پودے اگانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بے گھری کے بعد یہ حال ہوتا ہے تو بے وطنی.......... اور وہ بھی صدیوں کی بے وطنی تو بہت بڑی محرومی ہوتی ہے۔ یہ اس بے وطنی کا ردعمل تھا اور ان محنت کرنے والوں کے چہرے فخر سے چمک رہے تھے۔ آدمی بے گھری کے بعد گھر بناتا ہے تو کتنا فخر محسوس کرتا ہے۔ تو ایک ملک تعمیر کرنے والوں کے فخر کی کوئی حد ہو سکتی ہے۔

جینا کو وہ سب کچھ دیکھ کر آزادی کے بعد کا پاکستان یاد آگیا۔ اس وقت لوگوں نے کس جذبے سے ملک کی معیشت کی تعمیر کا کام کیا تھا مگر نہ جانے کیوں' اب وہ جذبہ سرد ہو چکا تھا۔ جینا کو پہلی بار احساس ہوا کہ انگریز والدین کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ پاکستانی ہے.......... اور نہ جانے کب سے ہے۔ اب اسے احساس جرم ہو رہا تھا کہ دولت ھانے کی دھن میں وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ پاکستان اس کا ملک تھا.......... وہ پاکستانی قوم سے تھی.......... لیکن اس نے استطاعت کے باوجود اپنے لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

جینا میلکم بھی اس مقدس سرزمین پر ایک بہت بڑے باطنی انقلاب سے گزر رہی تھی۔ اس کے پتھر دل میں جونک لگ رہی تھی!

دھوپ میں نہائی ہوئی چیزریل کی وادی سے نکل کر وہ گیلی لی کی تپتی پہاڑیوں کے رمیان بل کھاتی سڑک پر بڑھے' جو نزارتھ کی طرف جا رہی تھی۔ چھ بجے کے بعد وہ زارتھ پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ قدیم شہر کے چاروں طرف پہاڑوں پر دھیرے نے بسیرا کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ گیلی لی ہوٹل پہنچے جو درحقیقت ایک قدیم کارواں سرائے تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تجسس عرب بچوں اور عرب گائیڈوں میں گھر گئے۔ وہ سب انہیں جوزف کی کارپینٹر لپ اور سینٹ جوزف چرچ دکھانے کے درپے تھے۔ ایک گائیڈ انہیں مقدس کنواری کا گھر دکھانا چاہتا تھا' جو اب بھی بہتا تھا۔ سڑک پر گرد اور گرمی کے بگولے اٹھ رہے تھے۔

بچے گندے تھے۔ وہاں مکھیوں کی بھرمار تھی۔ شور و غل ایسا تھا کہ سر میں درد ہو جا
پہلا عرب قصبہ تھا' جہاں وہ ٹھہر رہے تھے۔

وہ منہ ہاتھ دھونے اور کھانا کھانے کی غرض سے ہوٹل میں گئے۔ لابی میں
قسم کی مذہبی یادگاری اشیا کا اچھا خاصا بازار لگا تھا۔ چربی میں کچھ تلے جانے کی خو
طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی طعام گاہ سنسان تھی۔ میزوں کے م
گرد پوشوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد یوسف' راحیلہ اور بین آئزک یادگار مقامات دیکھنے ک
سے نکلے۔ جینا اور ڈاکٹر لیوی ہوٹل ہی میں رک گئے۔ جینا کو گرمی' تھکن اور اس
نے نڈھال کر دیا تھا' جو اسے یہ قدیم قصبہ دیکھ کر ہوئی تھی۔ یہ وہ قصبہ تھا' جس کا
کر ہمیشہ اس کے دل میں عجیب سی تڑپ اٹھتی تھی۔

جوزف کی مفروضہ کارپینٹر شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے یوسف کو ایک ع
احساس فتح ہو رہا تھا۔ اس کارپینٹر شاپ پر ہی سینٹ جوزف کا چرچ تعمیر کیا گیا تھا۔ و
سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ سڑکوں پر میلی عبائیں پہنے بڈھوں اور بیمار آنکھوں
بچوں کا ہجوم تھا۔ یوسف کن انکھیوں سے راحیلہ کو دیکھتا رہا۔ وہ اس نظارے پ
ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ وہ ایک ایسی مسابقت میں
ہو گیا ہے' جس کی نوعیت کم از کم فی الوقت اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ اسے بس اتن
تھا کہ اسے مقابلہ کرنا ہے۔ کس سے؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ مقابلہ اس انقلا
متعلق تھا' جو اس کے باطن میں کروٹیں لے رہا تھا۔ بیت الشمس میں وہ جینا کو شمال ک
سفر کرنے پر اکسانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر لیوی نے راحیلہ کی مدد سے ا
دل میں نزارتھ جانے کی آرزو کو بھڑکا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے ایسا ک
کے تحت کیا ہے کیونکہ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بڈھا یہودی کوئی کام بغیر کسی د
نہیں کرتا۔ وہ دھوپ میں بیٹھ کر کچھ دیر ستائے تو اس کا بھی کوئی سبب ہوتا ہے۔

اور اگر یہ درست تھا تو نزارتھ ڈاکٹر لیوی کی دوسری ناکامی تھی۔ پہلی اس
کے دوران شکست تسلیم کرنا تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ جینا کے لئے اس جبس ز
میں ایک رات گزارنا قیامت سے کم نہیں ہوگا۔ صبح سویرے ہی وہ روانگی کے
تاب ہوگی اور اس تجربے کے بعد آئندہ اس کی پیش کردہ کسی تجویز کو آسانی سے
نہیں کرے گی۔

عرب گائیڈ جدید طرز کا بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے انداز میں بدتمیزی
ں۔ یوسف کو یہ بات بہت بری لگی۔ اسے ایسا لگا' جیسے عرب گائیڈ کے رویے پر بین
ئزک اسے تضحیک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ یوسف کی ڈانٹ سن کر گائیڈ فوراً ہی
بدھا ہو گیا۔

چرچ کا اندرونی حصہ بے حد بدنما اور بھدا تھا۔ نہ اسے آرٹ کا نمونہ کہا جا سکتا
ا' نہ ہی وہ روح میں تموج کا باعث تھا۔ جوزف کی کارپینٹر شاپ چرچ کے تہ خانے میں
ی تنگ غار کی طرح تھی' جس کا فرش بہت گندا تھا۔

"حد ہو گئی بے وقوف بننے کی!" یوسف نے منہ بنا کر کہا۔ "میں اس چرچ پر ڈاکٹر
وی کا تبصرہ ضرور سننا چاہوں گا۔"

"شاید اسی لئے وہ آئے نہیں یہاں۔" بین آئزک نے برا مانے بغیر صفائی پیش کی۔
انہیں وہ چیزیں' وہ جگہیں اچھی نہیں لگتیں' جو اصلی نہ ہوں۔"

راحیلہ بھی بدمزہ اور اداس نظر آ رہی تھی۔ عرب گائیڈ چرچ اور کارپینٹر شاپ
کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

"یہ ہے نزارتھ!" یوسف نے اس سے کہا "تسلی ہو گئی؟"

وہ اتنی ناخوش تھی کہ کوئی کاٹ دار جواب بھی نہ دے سکی۔ وہ روہانسی ہو رہی
تھی "ممکن ہے' پرانے وقتوں میں یہ کوئی قابل دید جگہ ہو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی
"ذرا تصور کرو' یہاں چوب کاری کے اوزار ہوں گے' لکڑی ہو گی.........."

لیکن بات نہیں بنی۔ وہ ڈاکٹر لیوی تھا' جو ایک بے رنگ منظر میں بھی اپنی علمیت
اور زور بیان سے جان ڈال دیتا تھا۔

"اب نکلو یہاں سے۔" یوسف نے کہا "ممکن ہے دوسرا چرچ دیکھ کر جی خوش ہو
جائے۔" لیکن اسے ایسی کوئی امید تھی نہیں۔

وہ دس بجے سے ذرا پہلے ہوٹل واپس آئے۔ انہیں حیرت ہوئی کیونکہ جیپ اور
ٹرالر ہوٹل کے سامنے موجود نہیں تھے۔ یوسف' ڈاکٹر لیوی کو نزارتھ پر اپنا تبصرہ سنانے
کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔

ہوٹل کے کلرک نے وضاحت کی۔ "وہ دونوں پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں۔
اگر آپ لوگ بھی جانا چاہیں تو باہر کار بھی موجود ہے اور ڈرائیور بھی۔ خاتون نے کہا تھا'
آپ لوگ نہ آنا چاہیں تو یہیں قیام کریں۔ وہ صبح واپس آئیں گی۔"

"میں تو سونے جا رہا ہوں۔" بین آئزک نے کہا "مدت کے بعد سچ مچ کا بستر نصی ہوا ہے۔"

یوسف اس پر معترض ہوا۔ "نہیں۔ ہم ان کے پاس جائیں گے۔" وہ بولا۔ ا اچانک ہی بے چینی سی ہونے لگی۔

"ممکن ہے، مس میلکم تنہائی کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔" راحیلہ نے کہ "وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔"

"وہ کہیں بھی گئے ہوں، میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ تجویز ڈاکٹر لیوی کی ہوگی۔" یوسف بولا "اور مجھے یہ بات پسند نہیں۔ میں یہاں نہیں رکوں گا۔"

بین آئزک نے چڑ کر کہا "تم اپنی زندگی میں دلچسپیاں بھرنے کے ماہر ہو۔ ج ٹھیک ہے۔ اوپر اس حبس سے تو نجات ملے گی۔"

وہ کار میں بیٹھے تو یوسف نے سوچا، ممکن ہے بین آئزک کی بات درست ہو، م بلاوجہ شک کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی بے چینی دور نہ ہوئی۔

O-----O-----O

وہ بل کھاتی سڑک نزارتھ کے درمیان سے پہاڑیوں کی طرف اٹھتی چلی گئی تھی۔ نزارتھ پہاڑیوں کے درمیان پیالے کی طرح کا تھا۔ سڑک پیالے کی مغربی گگر کی طرف ج رہی تھی۔ چوٹی پر مسطح زمین پر صنوبر کے درخت نیم دائرے کی شکل میں قطار در قطار ایستادہ تھے۔ پہاڑ کے سینے پر جا بہ جا کیکٹس نظر آ رہے تھے۔

جینا کا ٹرالر مسطح زمین کے ایک سرے پر پارک کیا گیا تھا۔ مردوں والا ٹرالر دوسرے سرے پر تھا۔

ڈاکٹر لیوی کو جینا میلکم کو ہوٹل سے نکلنے اور پہاڑیوں کی طرف چلنے پر رضامند کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص پُراعتماد لہجے میں کہا تھا "شہر سے باہر خنکی میں آپ زیادہ خوش رہیں گی۔ اوپر چوٹی پر صنوبر کا ایک جھنڈ ہے۔ کم از کم وہاں سے آپ ستاروں کی روشنی میں نزارتھ کا نظارہ کر سکیں گی۔"

"اور اگر............؟"

"وہاں سے آپ نزارتھ کی دھڑکنیں سن سکیں گی............ محسوس کر سکیں گی۔" ڈاکٹر لیوی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جینا ٹرالر سے نکلی اور اس کے قدمچوں پر بیٹھ گئی۔ وہ چاندنی رات نہیں تھی لیکن ستارے بہت روشن نظر آ رہے تھے۔ آسمان نیچی چھت کے شامیانے کی طرح لگ رہا تھا۔ اتنا نیچا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ ادھر ادھر دھندلے سے سائے بن رہے تھے۔ کچھ چیزیں نیم واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ سفید عمارتیں، مینار، زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ اور اس کے درمیان بل کھاتی سڑک............ شہر چٹانی چھجوں کے قدمچے اترنا............ نیچے جاتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اسے اپنے قدموں میں نظر آ رہا تھا۔ بجری سڑک، پتھروں کے مکان، سلاخوں والی کھڑکیاں اور چھتوں پر رکھے گملوں میں موجود پودوں کی پھولوں سے لدی شاخیں۔

اس کی نگاہیں جیسے ہی اس نیم تاریکی سے ہم آہنگ ہوئیں، اسے ستارے اور روشن لگنے لگے۔ اس کا حیطہ نظر اور پھیل گیا۔ ہر چیز اور واضح نظر آنے لگی۔ ہر طرف سکوت تھا............ سکون میں لپٹا ہوا سکوت۔ اس سکوت میں بڑی آسودگی تھی۔

جینا کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر لیوی اس کے برابر آ کھڑا ہوا ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، ٹھوڑی سینے سے لگی تھی اور وہ اس پُرسکون منظر کو دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی لیکن وہ خاصی دیر خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا "یہ ہے نزارتھ" چند لمحے خاموشی رہی پھر ڈاکٹر لیوی نے کہا "جب انہوں نے یہاں سے دیکھا تھا، تب بھی یہ منظر ایسا ہی تھا۔ رات کو یہاں ایسی ہی آسودگی............ ایسا ہی سکون ہوتا ہے۔ انہیں نزارتھ سے محبت تھی۔"

جینا خاموش کھڑی وہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

پھر اس سکوت کو موسیقی کی آواز نے توڑا، جو کہیں قریب سے ہی آ رہی تھی۔ نیچے پتھر کے کسی مکان میں کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ وہ بڑی میٹھی اور مدھر دھن تھی۔ جیسے اس خوبصورت خاموشی نے کسی لطیف روح کو بولنے پر اکسا دیا ہو۔

"انہیں نزارتھ سے محبت تھی" اس کے کانوں میں ڈاکٹر لیوی کے الفاظ گونجے۔ اس نے گہری سانس لی اور طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو سینے میں اتار لی۔ سامنے آسمان پہاڑیوں کو چھو رہا تھا۔ صنوبر کے درختوں سے جھانکتے ستاروں کا منظر جڑاؤ زیورات کی یاد دلا رہا تھا۔ زیتون کے درختوں کے درمیان سفید سیال بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ دور سے کسی چرواہے کے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ جینا کی چشم تصور نے چرواہے کو دیکھا، جو اپنی بھیڑوں کو گھر کی طرف ہنکائے لئے جا رہے تھے۔

جینا کے دل کو کسی بے حد لطیف.......... بادلوں جیسے جذبے نے چھو لیا۔ اس تصور میں مسیحؑ مجسم ہو گئے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر لیوی نے ان کا نام نہیں لیا تھا۔ یہ م لڑکپن کا گھر تھا۔ یہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔

یہ درخت، یہ چٹانی چھجے، یہ صدیوں سے جوں کی توں موجود چٹانیں، یہ صدیو امیں پگڈنڈیاں، یہ زمین کو چومتا ہوا آسماں، ان ستاروں جڑی پہاڑیوں نے ان کی آنکھ کو بھر دیا ہوگا، ان کے دل میں خوشی کی چمک اتار دی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو میں بھیڑوں کی معصومیت میں انہوں نے خدا کی محبت.......... خدا کی قربت محسوس کی ہو وہ سوچ رہی تھی، شاید وہ کبھی یہاں کھڑے ہوئے ہوں.......... اسی جگہ، جہاں اس د میں کھڑی ہوں۔ انہوں نے بھی سانس لے کر اسی ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارا ہوگا۔ ا نے بھی یہی آوازیں سنی ہوں گی، یہی منظر دیکھا ہوگا۔ وہ جو زندگی بھر کتابوں میں لکھا نام تھے، لبوں سے ادا ہونے والا ایک لفظ تھے.......... اس وقت کتنا نزدیک محسو رہے تھے۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا بچہ، وہ نرم خو انسان، جس کا دل خدا کی محبت معمور تھا۔ جینا کا دل عجیب سی بھگو دینے والی، شرابور کر دینے والی خوشی سے بھر گیا۔ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ دھیرے دھیرے رونے لگی۔

اور اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے میں برسوں سے جو ایک سخت سی گرہ تھی وہ رونے سے کھل گئی تھی۔ اب وہ محض ایک بوڑھی، تنہا اور اداس عورت جسے زندگی بھر نرمی میں بھیگی محبت نہیں ملی تھی.......... جسے کسی نے سمجھنے کی کو نہیں کی تھی.......... جس نے خود بھی کسی سے سچی محبت نہیں کی تھی۔ اور اب وہ پر سے ستاروں کی روشنی میں نزارتھ کو دیکھ کر محبت کا سیال آنکھوں سے بہا رہی اسے لگ رہا تھا کہ مسیحؑ نے بڑی محبت سے اس کے دل پر اپنا شفا بخش ہاتھ رکھ دیا وہ پگھل رہی تھی.......... بدل رہی تھی!

وہ رو رہی تھی کہ پہلی بار اسے سکون کا احساس ہوا تھا.......... اسے ا موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت بڑی گ ہے۔ اس نے اپنی زندگی طاقت کے حصول کی کوشش میں گنوا دی تھی۔ وہ رو رہی کیونکہ آنسوؤں کا دل کے پتھر کو موم کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ آنسوؤں نے اس خ چٹخا دیا تھا، جو اس نے اپنی خوشی سے محروم، تنہا اور اداس دل پر چڑھا رکھا تھا۔ اس چلتا تو وہ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہا دیتی۔ مہربان چرواہے کے پاؤں دھلا

.... اس کے تلووں کے چھالوں کو آرام دینے کے لئے۔

وہ اتنی محو تھی کہ اس نے کار کی آواز بھی نہ سنی اور راحیلہ، بین آئزک اور ف کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سنی۔

"کیا ہوا، کیا بات ہے؟" یوسف نے پوچھا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ڈاکٹر ی کہاں ہیں؟ کیا کرتے پھر رہے ہیں وہ؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ بین آئزک، ا کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں جینا کی ردن میں حمائل کر دیں "ماں.......... آپ رو رہی ہیں۔"

"ارے نہیں۔" جینا نے جواب دیا "زندگی میں پہلی بار تو کچھ بہتری ہوئی .... بھلائی نظر آئی ہے۔"

اندھیرے میں سے ڈاکٹر لیوی نمودار ہوا۔ "تم لوگ واپس آ گئے؟"

"یہ آپ نے کیا کیا ہے؟" یوسف نے غصے سے کہا "مس میلکم بہت زیادہ اپ ٹ ہیں۔ کیا کہا ہے آپ نے ان سے؟"

"مجھے لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں، بس میرے لفظوں کا تعلق اس ہستی سے تھا، جس نے ا بچپن یہاں گزارا تھا؟"

ڈاکٹر لیوی کی یہ عادت تھی کہ وہ جارحانہ سوالوں کے جواب بہت مختصر دیتا تھا۔ ا وقت یوسف اس سے بری طرح چڑ گیا۔ "یہ تم کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہو؟ تم ں میلکم کو یہاں لائے ہی کیوں تھے؟"

"انہیں اصل نزارتھ دکھانے کے لئے۔ اور وہ انہوں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دیکھنا ہو تو تم بھی دیکھ سکتے ہو۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر لیوی پھر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

راحیلہ نے بلند آواز میں کہا۔ "جو.......... وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے، جہاں ہمیں شروع میں ہی آنا چاہئے تھا۔ ذرا دیکھو.......... محسوس کرو.......... اپنی کھیں، اپنے حواس استعمال کرو۔ تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا؟"

یوسف نے راحیلہ کے روشن چہرے کو دیکھا پھر ستاروں میں نہائے ہوئے نزارتھ ر سامنے والی پہاڑیوں کو دیکھا۔ گردوپیش کے اس حسن میں راحیلہ اسے آسمان سے ری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھی۔ اس لمحے وہ اس کے دل کی طرف غیر محسوس طور پر ھ رہی تھی۔ یوسف کو اس پر غصہ بھی آیا، اس سے خوف بھی محسوس ہوا۔ اس کا وجود یب سی تلخی سے بھر گیا۔ اس نے اپنے وجود کی تمام توانائی اس پیش قدمی کے خلاف

مزاحمت میں صرف کر دی۔ اس نے جان لیا کہ اگر اس نے مزاحمت نہ کی تو وہ زم جائے گا اور نرمی زندگی کے لئے کتنی نقصان دہ ہے' یہ وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد جینے کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

"نہیں بی بی! مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا "اور یہ ای تھکا دینے والا دن تھا۔ شب بخیر۔" وہ ٹرالر کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں اسے ڈاکٹرلیو کی ٹٹولتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہوا لیکن وہ اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

○-----○-----○

نزارتھ کے بعد قافلے کی رفتار اور کم ہوگئی۔ اس سلسلے میں کسی نے کسی سے نہیں کہا لیکن ایک بات واضح ہوگئی۔ جلد بازی اور بے تابی کا بخار خاصی حد تک اتر تھا۔ یہ تبدیلی یوسف کے لئے پریشان کن تھی کیونکہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آر تھی۔ اس مہم میں اپنا کھویا ہوا اختیار اب تک وہ دوبارہ حاصل نہیں کرسکا تھا۔

وہ نزارتھ سے نکل کر قدیم سڑک پر سفر کرتے رہے۔ وہ کیفرکینا سے گزرے۔ وہ گاؤں تھا جہاں حضرت عیسیٰؑ نے پہلا معجزہ دکھایا تھا۔ وہ مجدل سے گزرے جہا یوکلپٹس کے درختوں سے گھری نیچی پہاڑی تھی' جسے بیت السیدہ کہا جاتا ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت قافلے نے ایک ٹھنڈے اور سرسبز نخلستان میں پڑاؤ ڈالا اس کے سامنے ٹائی بیریس جھیل کا شمال مغربی کنارہ تھا جس کا جدید نام بحر گیلی لی ہے وہاں درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے اندر کی سمت خوشبودار پھولوں ک جھاڑیاں تھیں۔ قریب ہی ایک پرانا جرمن چرچ تھا۔ فادر' ڈاکٹرلیوی کے جاننے والوں م سے تھا۔ ڈاکٹرلیوی انہیں چرچ لے گیا۔

انہوں نے فادر سے جھیل کے کنارے جھنڈ میں ٹرالر پارک کرنے کی اجازت لی وہیں خیمے گاڑے گئے۔ ڈاکٹرلیوی نے بین آئزک کو شمال کی طرف روانہ کر دیا۔ یوسف نے وجہ پوچھی لیکن ڈاکٹرلیوی نے اسے ٹال دیا۔ بین آئزک جیپ لے کر گیا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی چلت پھرت میں ہیجان تھا۔ وہ رات کے کھانے کے فور بعد روانہ ہوگیا تھا۔

ڈاکٹرلیوی نے جینا سے کہا "ممکن ہے' ہمیں یہاں کئی روز قیام کرنا پڑے' جب تک مجھے یہ یقین نہیں ہوگا کہ آگے سفر کرنا محفوظ ہے' ہم یہاں سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس صورت میں آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟"

"نہیں۔" جینا نے جواب دیا۔ "یہ بہت سکون بخش مقام ہے۔"

یوسف کے لئے یہ تاخیر پریشانی کا باعث تھی۔ اسے خطرے کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹرلیوی سے معقولیت سے گفتگو کرنے کی کوشش کی "یہ کیا چکر چل رہا ہے؟" اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "بین آئزک کو تم نے کہاں بھیج دیا اور مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟"

ڈاکٹرلیوی اس وقت ٹرالر کے قدمچے پر بیٹھا پائپ سلگا رہا تھا۔ اس کی نظریں جھیل پر جمی تھیں۔ اس نے سر گھما کر یوسف کو دیکھا۔ "صبر و تحمل سے کام لو' تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔"

یوسف جھنجلا گیا۔ "مجھے تم پر اعتبار نہیں ڈاکٹرلیوی!"

"بات معقول ہے۔ لیکن تم بین آئزک پر تو اعتبار کرسکتے ہو کیونکہ تم جانتے ہو کہ وہ مس میلکم سے محبت کرتا ہے۔"

شکست خوردگی اور بے بسی اب یوسف کے لئے معمول کے مطابق تھی۔ اس نے سوچا' راحیلہ سے مل کر اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے لیکن اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ بھی بدل گئی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اب وہ راحیلہ پر بھی اپنا کنٹرول کھو بیٹھا ہے۔

گیلی لی نے بھی جینا کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ بلکہ وہ نزارتھ کی نسبت زیادہ گہرائی میں اس پر اثرانداز ہوا تھا۔ اس علاقے کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ انجیل مقدس کے سب سے زیادہ مصدقہ اقتباسات یہیں سے دریافت ہوئے تھے۔ یہاں کے مچھیرے اب بھی اپنی کشتیوں سے ہاتھوں سے جال پھینک کر مچھلیوں کا شکار کھیلتے تھے۔ دو ہزار سال پہلے کے پیٹر اور جان کی طرح' جن کی سادہ روحوں کو پہاڑوں سے اتر کے آنے والے پیغمبر نے مسخر کیا تھا۔

اب اگرچہ وہ معروف قصبے اور دیہات مٹ چکے تھے' جو کبھی جھیل کے کنارے زندگی سے دھڑکتے تھے لیکن ساحل ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی کنارے پر چمکتی سیپیاں' وہی جھاڑیاں' وہی آبی گھاس۔ جھیل کی ساخت بھی بہت تھوڑی سی بدلی تھی۔ اردگرد سر اٹھائے کھڑی پہاڑیاں تو ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔ وہ ویسی ہی تھیں' جیسا مسیحؑ نے انہیں دیکھا تھا۔ سمندر کی نم' حدت اٹھائے ہوا ویسی ہی تھی.......... گردوپیش کے خوب صورت [illegible] اور پھولوں کی خوشبوؤں سے بوجھل۔ نیلا پانی اور بھوری پہاڑیاں اور ٹیلے

بھی ویسے ہی تھے۔ ساحل کی ریت پر ان کے قدم پڑے ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ آدمی وہاں چلے اور اسے ان کا خیال نہ آئے۔

یہ تھے جینا میلکم کے محسوسات۔ وہ گھنٹوں وہاں چہل قدمی کرتی اور کم ہی کسی سے بات کرتی۔ صرف ڈاکٹر لیوی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ اسے اس مقام کے متعلق بتاتا اور تاریخی، مذہبی حوالے دیتا۔ اور جینا خود کو ان سے قریب تر محسوس کرنے لگتی۔

ساحل پر چلتے چلتے اچانک انہیں کسی مدفون قصبے کے آثار سر ابھارتے دکھائی دیتے۔ کوئی سیاہ دیوار......... کوئی ستون......... اور کوئی کہانی چھڑ جاتی۔

یوسف پریشان تھا۔ جینا ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ اس کے خیال میں ڈاکٹر لیوی بڑی خوبصورتی سے اسے جال میں الجھا رہا تھا۔ مذہبی معاملات میں ہر آدمی اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لیوی، جینا کی اس کمزوری کو ایکسپلائٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سی حقیقت میں بہت سارا افسانہ اسے گھول کر پلا رہا تھا، اور یوسف......... وہ بے بس تھا، کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی جینا اکیلی کھڑی گرد و پیش کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہتی اور کبھی ڈاکٹر لیوی اشارے سے اسے بتاتا کہ فلاں مقام پر ایک معروف تجارتی قصبہ تھا اور فلاں جگہ مچھیروں کا کوئی گاؤں۔ کبھی اس ساحل پر زندگی ہی زندگی تھی، پھول ہی پھول مہکتے تھے۔ لیموں، نارنگی، یوکلپٹس اور شامی انجیر کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس جھیل کے اطراف میں شہر ہی شہر تھے......... نوشہر! اب ان میں صرف ٹائبریس ہی بچا تھا اور وہ بھی اب نئی زندگی سے لبریز تھا۔ ایک نئی ساحلی تفریح گاہ کی صورت میں ابھر رہا تھا۔ اب انت غیبہ کے درختوں کے جھنڈ کے سوا وہاں درخت دیکھنے کو بھی نہیں تھا۔ جبکہ مسیحؑ کے عہد میں وہاں سایہ دار شاہ بلوط تھے، اخروٹ تھے، کھجور تھے، انجیر تھے، چنار تھے اور رنگ برنگے پھولوں کے پودے اور جھاڑیاں تھیں، لیکن اب یہ ساحل سنسان تھا۔ جھیل کا سینہ، جو کبھی سفید بادبانی کشتیوں سے سجا رہتا تھا، اب خالی پڑا تھا۔

وہاں جو زندگی تھی، اب ڈاکٹر لیوی کی آواز کے زیر و بم سے وجود پا رہی تھی۔ جینا وہ سحر انگیز آواز سنتی اور اس کی نگاہوں کے سامنے صدیاں پیچھے ہٹتی چلی جاتیں۔ منظر بدل جاتے۔ اسے پانی میں چپوؤں کے چلنے کی، جال پھینکے جانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں یونانی بھی تھے، رومی بھی اور یہودی بھی، اور ان کے درمیان مسیحؑ بھی چلتے پھرتے تھے۔

اپنا پیغام......... خدا کا پیغام ان تک پہنچاتے تھے۔

"کیا مسیحؑ یہاں تبلیغ فرماتے تھے؟" جینا نے پوچھا۔

ڈاکٹر لیوی نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا "کیا یہ جگہ آپ کو کچھ نہیں بتاتی؟"

جینا نے چاروں طرف دیکھا۔ انداز ایسا تھا، جیسے وہ بہت موہوم آوازیں سننے کے لئے سماعت پر زور دے رہی ہے۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آیئے، میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

وہ اسے جھیل سے دور ایک تنگ راستے پر لے گیا۔ وہ شمال مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے، جہاں زمین بہت آہستگی سے بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ وہ صنوبر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ وہ جھنڈ بے شکل تھا پھر بھی احساس دلا رہا تھا کہ اس کی کوئی شکل ہے......... جیسے وہ درخت وہاں صدیوں پہلے موجود درختوں کے بیجوں کا ثمر ہوں......... اور اس عمل میں جھنڈ اپنی اصل شکل کھو بیٹھا ہو۔

اندر......... جھنڈ میں جنگلی پھولوں کے پودوں کے سوا بادی النظر میں کچھ بھی نہیں تھا اور وہ پودے زمین سے یوں چپکے ہوئے تھے، جیسے قالین کی طرح بچھے ہوئے ہوں۔ زمین ناہموار تھی۔ موسم بہار کا خودرو سبزہ اور روئیدگی چھب دکھلا رہی تھی۔

لیکن جھنڈ کے آخری سرے پر ایک بے حد بلند و بالا صنوبر کے پس منظر میں ایک بہت پرانا ستون نظر آ رہا تھا۔ ستون پر تکونی شکل کا ایک شکستہ کارنس لٹکا ہوا تھا۔ وہ کسی عمارت کا کھنڈر نہیں تھا لیکن اہمیت کے اعتبار سے گمشدہ شہر کے کھنڈرات سے بڑھ کر متاثر کن تھا۔ وہ کوئی معبد معلوم ہوتا تھا، وہ کوئی بھولا بسرا مقام تھا لیکن وہاں ماضی چیخ چیخ کر پکارتا محسوس ہوتا تھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟" جینا نے پکار کر پوچھا۔ "کیا وہ یہاں آئے تھے کبھی؟"

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں" اس نے کہا، "ہمارے قدموں کے نیچے کیپرنوم کے کھنڈرات ہیں۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے........." اس نے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلاتے ہوئے گہری سانس لی۔ "یہ میں اپنے محسوسات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔ جیسے اپنی جذباتیت پر معذرت طلب کر رہا ہو۔ "اور اپنی تاریخی علمیت کی بنیاد پر بھی۔ یہ میری دریافت ہے......... اور کبھی نہ کبھی ہم یہاں کھدائی کریں گے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ

اس زمانے میں جھیل کا پانی شمال کی سمت اپنی موجودہ پوزیشن سے کم از کم ایک کلو آگے تھا اور کیپرنوم یہودیوں کا نہیں بلکہ گیلی لین قصبہ تھا..........”

جینا ایک بار پھر اسی سحر میں گرفتار ہوگئی تھی۔ یہ فلسطین کا جادو تھا' جہاں جھیل کا پانی یا مٹی کا کوئی ٹیلہ پکار کر کہتا معلوم ہوتا.......... مسیحؑ مجھے جانتے تھے۔ انہو نے ایک بار میرے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پانی کہتا تھا.......... مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں خوشی چمکی تھی۔ زمین کہتی تھی.......... میرے سینے کو ان کے قدموں کا دباؤ آج بھی ہے۔ یہاں.......... میری گلیوں میں لوگوں کو خدا کی تعلیمات سے آشنا کیا گیا تھا۔

“تم ٹھیک کہتے ہو۔” جینا بولی “وہ یہاں یقیناً آئے ہوں گے۔”

“میں نے جب اسے پہلی نظر دیکھا تھا' مجھے تبھی یقین ہوگیا تھا۔” ڈاکٹرلیوی نرم لہجے میں کہا۔

جینا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا “تم.......... تم بھی ان سے عقیدت ر ہو.......... محبت کرتے ہو؟”

“ایسے محبت کرنے والے پیغمبر سے عقیدت اور محبت نہ ہونا کیسے ممکن ہو ہے۔”

“اس کے باوجود تم یہودی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمام یہودی' مسیحؑ کے منکر ہیں۔

“یہ خیال غلط ہے۔” ڈاکٹرلیوی نے پرزور انداز میں کہا “اس سرزمین پر بہت پرانی نفرتیں مرگئیں.......... مردہ شہروں کے ساتھ دفن ہوگئیں۔ وہ شہر ہی نہ رہے' جہ وہ نفرتیں پروان چڑھی تھیں۔ یہاں واپسی کے بعد ہم یہودی بہت بدل گئے ہیں' آ خیال ہوگئے ہیں' تنگ نظری کا خول ٹوٹ گیا ہے ہمارا۔”

جینا کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی “تو پھر تم مسیحی کیوں نہیں ہوگئے؟”

“یہ بہت طویل بات ہے خاتون!” ڈاکٹرلیوی نے کہا “بات صرف اتنی ہی ہے آدمی اپنی بنیاد میں ایسا ہے کہ عام طور پر اسے محبت تنگ نظر بنا دیتی ہے۔ مجھے ایک با بتائیں۔ بائبل میں آخری پیغمبر کی آمد کی خوش خبری نہیں سنائی گئی؟ ان کی نشانیاں نہ بتائی گئیں؟”

جینا خاموش رہی۔ “یہ سب کچھ موجود تھا بائبل میں۔”

“تورات میں بھی تھا۔” ڈاکٹرلیوی نے کہا “اور یہودی ان پر ایمان لائے لیک اکثریت نے خدا کے واضح حکم کے باوجود ان کی نفی کی۔ یہ دراصل ضد کا معا

ہ.......... انسان کی میں کا.......... وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک چیز اپنائی' اب اسے چھوڑ ر دوسری کیوں اپناؤں۔ خدا کہتا ہے.......... تم کچھ نہیں جانتے۔ میں سب کچھ جانتا ں۔ تمہیں میرا حکم ماننا چاہئے۔ میں کہوں اسے اپنا لو' تو اپنا لو۔ میں کہوں اسے اس پر بت دو' تو دو' لیکن انسان کی سرشت میں نافرمانی ہے۔ وہ اسی کی سزا دنیا میں پاتا ہے اور ی کی سزا آخرت میں پائے گا۔ اب مجھے بتائیں کہ آپ آخری پیغمبر پر ایمان کیوں نہیں ں؟”

“میں نے اس سلسلے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔” جینا نے سادگی سے کہا۔

“دیکھیں.......... میں کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھتا ہوں.......... وہ شائع ہوتی ' فروخت ہوتی ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے تو میں اس میں ترمیم و اضافہ کرتا ۔ اسی طرح ہر ایڈیشن میں ترمیم اور اضافے ہوتے ہیں۔ اب بتائیں' اپنے مواد کے رے کتاب کا آخری ایڈیشن اہم ہوگا یا پہلا؟”

“ظاہر ہے' آخری ایڈیشن۔”

“لیکن لوگ کسی بھی کتاب کے پہلے ایڈیشن کو منہ مانگی قیمت دے کر خریدتے ”

“مگر ایسے بھی ہوتے ہیں' جو آخری ایڈیشن کو اہمیت دیتے ہیں۔”

“جی ہاں' درست ہے۔” ڈاکٹرلیوی نے گہری سانس لے کر کہا “اور وہ علمیت پسند ' ہیں۔ لیکن دنیا میں اکثریت جذباتی لوگوں کی ہے۔ آدمی سب سے زیادہ محبت اپنے ے کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بنیادی طور پر وہ ماضی پرست ہے۔ وہ باپ دادا کی چیز ترک نہیں کرتا۔ نہ نام' نہ زمین' نہ مذہب۔ ہندوؤں کو لیں۔ اس ترقی یافتہ عہد ی وہ اپنے اجداد کے نہایت احمقانہ عقیدے سے دستبردار نہیں ہوتے۔ یہی حال ہے۔ ہم کتنے ہی ترقی پسند بنتے رہیں' حال ہمارا یہ ہے کہ خدا کی کتاب کے آخری ن کو نہیں پڑھتے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے پہلے ایڈیشن سے دستبردار ہے تو میں دوسرا ایڈیشن کیوں لوں؟ آخری کیوں نہ لوں۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ ی لینا چاہئے۔”

“تم عجیب باتیں کر رہے ہو..........”

“میں یہاں بھی مختلف آدمی ہوں اسی لئے سب کچھ چھوڑ کر ترکاریوں اور سبزیوں ت میں مصروف ہوگیا ہوں۔” ڈاکٹرلیوی کے لہجے میں طمانیت تھی۔ “میں دنیا بھر

میں گھومتا پھرا ہوں۔ میں نے مذاہب کا' آسمانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے ک آخری پیغمبر پر ایمان وہ یہودی لائے' جو تورات پر مکمل ایمان رکھتے تھے اور باعمل تھے علمی معاملات میں میں دانستہ غلط تشریح و توضیح نہیں کر سکتا۔"

"لیکن عمل بھی نہیں کرتے!" جینا نے چوٹ کی۔

"ہاں' شاید اس لئے کہ میں نے عمر بھر یہودی ہونے کی سزا بھگتی ہے۔ میں سوچ ہوں' اب اس سے کیوں دستبردار ہوں۔ اور سب سے بڑی بات خدا کی توفیق وہدایت ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ خود مسلمان بھی تو روشنی کے ہوتے ہوئے اندھیرے م ہیں۔ میں بہر حال تمام پیغمبروں کو مانتا ہوں' ان کا احترام کرتا ہوں اور ان سے محبت ک ہوں۔"

جینا میلکم کو اپنے اندر دریچے کھلتے محسوس ہوئے۔ اس کا وجود روشنی اور تازہ ہ سے بھر سا گیا مگر ساتھ ہی گھٹن کا شدید احساس بھی ہونے لگا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ ا وہ ڈاکٹر لیوی کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "ڈاکٹر لیوی!" اس نے عجیب سے لہجے م پکارا۔

"جی فرمایئے!"

"ہیلو مس میلکم! ہیلو ڈاکٹر لیوی!" یوسف کی آواز نے جیسے طلسم کو توڑ دیا۔ ا نے جھنڈ میں داخل ہوتے ہی انہیں پکارا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے ان کی طر بڑھتا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ ٹیلی گرام تھے' جو اس نے جینا کی طرف بڑھا دیے "یہ ابھی ایک گھنٹا پہلے آئے ہیں.......... براستہ سان فرانسسکو۔ اور ڈاک بھی ہے لیکن مس ذیشان کا کہنا ہے کہ یہ ٹیلی گرام بہت اہم ہیں۔ سو میں انہیں لے کر آپ کی تلا میں نکل کھڑا ہوا۔"

جینا نے پیغامات پڑھے اور اس کے چہرے پر کاروباری لوگوں کی مخصوص خشو در آئی' آنکھوں سے سرد مہری اور سختی جھلکنے لگی۔ "انت غیبہ میں ٹیلی فون لائن ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مس ذیشان نے آپ کے سان فرانسسکو آفس کے لئے کال بک بھی دی ہے۔ ایک گھنٹے بعد رابطہ متوقع ہے۔" یوسف نے جواب دیا۔

جینا' ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ انداز ایسا تھا' جیسے وہ کسی اجنبی سے مخاطب ہ "یہ کاروباری معاملات ہیں ڈاکٹر لیوی۔ میں پہلی بار اتنے طویل عرصے کے لئے اپنی مملک

ے دور ہوئی ہوں۔ مجھے فوراً انت غیبہ پہنچ کر چند ضروری معاملات نمٹانے ہیں۔"

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں۔ یہ معاملات تو بہت ضروری ہیں۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

وہ جھنڈ سے نکل آئے۔ راستے میں یوسف نے ڈاکٹر لیوی سے کہا۔ "جیپ میں امریکی لڑکا آیا ہے۔ ایڈ ایوری نام ہے اس کا.......... وہ آپ کے لئے بین آئزک کا ایک پیغام لایا ہے۔"

"اوہ ہاں۔" ڈاکٹر لیوی نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تیاریاں مکمل ہیں۔ ہم کل شمال کی سمت اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

یوسف احساس فتح سے سرشار ہو گیا۔ پہلی بار اس نے ڈاکٹر لیوی کے چہرے پر مایوسی اور پژمردگی دیکھی تھی۔ جینا کے ٹیلی گرام لاتے وقت اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ایک فیصلہ کن لمحے میں مداخلت کرنے والا ہے اور اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ مداخلت ڈاکٹر لیوی کے لئے شکست کے مترادف تھی۔ اس نے جینا کے چہرے پر نرمی بھی دیکھی تھی اور ماضی کے' اپنی کاروباری مملکت کے پیغامات پڑھ کر اسے سختی میں بھی بدلتے دیکھا تھا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ جینا کے چہرے کی نرمی اس بات کی علامت تھی کہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ جینے کی ہوس سے دستبردار ہو رہی ہے' اور یہ یوسف کے مفاد میں نہیں تھا۔ یوں تو سودا ہی منسوخ ہو جاتا۔ جبکہ چہرے کی سختی اس بات کی علامت تھی کہ جینا پھر وہیں کی وہیں پہنچ گئی ہے۔ کاروباری مملکت کے بلاوے نے اس کی ہوس کو پھر ہمیز کر دیا تھا۔

○-----○-----○

یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ یوسف جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ راحیلہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ جس جیپ کے پیچھے چل رہے تھے' اسے امریکی لڑکا ایڈ ایوری ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس میں جینا اور ڈاکٹر لیوی بیٹھے تھے۔ صبح کا وقت تھا اور ابھی پوری طرح اجالا نہیں ہوا تھا۔ وہ میتلا کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور دکھاوے کے لئے پہاڑ کی جانب سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے کاروں' ٹرالر اور ملازمین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ کھدائی کے لئے کسی مناسب مقام کی تلاش میں نکلے ہیں۔ وہ ڈان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مضبوط بدن کا بھاری بھر کم ایڈ خاکی قمیض اور خاکی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ہیں

بال کیپ تھی۔ وہ یہودیوں کی قریبی بستی سے آیا تھا' جہاں امریکی زراعت کے جدید طریقے اور جدید مشینری روشناس کرا رہے تھے۔

وہ اچانک جیپ میں انت غیبہ میں نمودار ہوا تھا...... بین آئزک کا پیغام لے کر کہ مہم پر روانگی کی تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ وہ جینا سے واقف تھا۔ جینا سے ملتے ہوئے اس کے انداز میں دلچسپی تھی۔ جینا کو اس علاقے میں کسی امریکی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں استفسار بھی کیا "میں جنگ کے دوران یہیں تھا مادام۔" جواب میں اڈ نے بتایا۔ "میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہاں ضرور واپس آؤں گا۔ ہمارے خاندان میں زراعت کا بڑا رجحان ہے۔ میں نے اسٹان فورڈ کے زرعی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔"

"امریکا میں تم جیسے اور لوگ بھی موجود ہیں؟" جینا نے پوچھا۔

"جی ہاں مادام۔ اور ایسے لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں انہیں زراعت میں کامیابی کا زیادہ امکان نظر آتا ہے' وہ وہاں بس جاتے ہیں اور اپنی تعلیم سے استفادہ کرتے ہیں۔"

"لیکن تم یہودی تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"یہاں رہنے کے لئے یہ ضروری تو نہیں۔ یہ اچھی سرزمین ہے اور لوگ بھی اچھے ہیں۔" اڈ نے جواب دیا۔

وہ میتلا پہنچے۔ بین آئزک وہاں موجود نہیں تھا۔ یوسف کو یہ تشویش تھی کہ وہ مہم کے بارے میں پوری طرح اندھیرے میں ہے۔ اس نے اڈ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی تو جواب ملا۔ "مجھے خاموش رہنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ بس میں آپ کی رہنمائی کروں گا۔ آپ لوگ تیار ہو جائیں۔"

اور پھر وہ وقت آگیا۔ اب اڈ وقتی طور پر ان کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

یوسف' راحیلہ کی قربت میسر آنے پر بہت خوش تھا۔ تل ابیب سے بین آئزک کی تلاش میں ناکام واپس آنے کے بعد وہ حیفہ میں راحیلہ سے ملا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک انہیں تنہائی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن تنہائی میسر آتے ہی اس نے جو پہلی بات کی' وہ جارحانہ لب و لہجے میں کی تھی۔

میتلا سے وہ جنوب کی سمت پلٹے اور ہول بہہ جھیل کے علاقے سے گزرے۔ پھر

ٖرق کی طرف مڑے۔ اس طرف ڈان تھا۔ اب وہ قدرتی طور پر سرسبز و شاداب ے گزر رہے تھے۔ "تم ان دنوں بہت مطمئن اور خوش و خرم ہوگی۔ ہے نا؟" ن نے اسٹیئرنگ پر جھکتے ہوئے کہا۔

راحیلہ نے پہلو بدل کر کن انکھیوں سے اس شخص کو دیکھا' جس کے ساتھ بظاہر ے تعلقات تلخ تھے بلکہ اچھی خاصی دشمنی چل رہی تھی ان کے درمیان۔ خاکی پینٹ اکی ہیٹ میں وہ اتنا عیار اور چالاک نہیں لگ رہا تھا۔ عمر کے اعتبار سے بھی جیسے اس چھ برسوں کی گرد جھاڑ دی تھی۔ مگر اب اس کے انداز میں بے بسی تھی اور وہ تنہائی رالگ رہا تھا۔ اس لمحے اس نے عجیب سے انداز میں راحیلہ کے دل کو چھو لیا۔

راحیلہ جواب سوچنے کے دوران بھی اس تاثر کا تجزیہ کرتی رہی۔ اس کا سبب یہی لتا تھا کہ یوسف جو ایک ولن ہے' اس کا کھیل خراب ہوگیا ہے۔ ایسے میں وہ خوش تو نہیں آسکتا۔

"یہ درست ہے جو۔" بالآخر راحیلہ نے جواب دیا۔ "میں ان دنوں بہت خوش اور ئن ہوں۔ مجھے یہ سفر بہت اچھا لگا ہے۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ راحیلہ۔ میرا اشارہ یہاں کے قدرتی حسن کی طرف ا تھا۔" یوسف نے تلخ لہجے میں کہا "تمہارا اندازہ ہے کہ مجھے شکست ہو چکی ہے۔ را پیارا بین آئزک اور اس کے انکل فتح یاب ہو چکے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو کہ اب تم ہوئی نہیں ہو بلکہ دنیا کے سر پر چڑھ کر بیٹھ گئی ہو۔ لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ ن محتاط رہنا کیونکہ میں اتنی آسانی سے شکست کھانے والا نہیں۔"

راحیلہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی لیکن اس کا دل دکھ رہا تھا کیونکہ مضبوط جوزف ڈن کا لہجہ بھی کمزور تھا اور اس کے چہرے پر شکست خوردگی بھی تحریر تھی۔ "میں ن ضرور ہوں۔" اس نے کہا "لیکن اس وجہ سے نہیں کہ تم ہار گئے ہو۔" اس کے ٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ مچلی۔ وہ اسے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی کی...... تنہائی کا احساس دور کرنا چاہتی تھی۔ "عجیب بات یہ ہے کہ میری یہ خوشی ارِی دی ہوئی ہے...... تمہاری ہی وجہ سے ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"کیا؟" یوسف حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے معصوم لا نے اسے چونکا دیا۔ وہ خاصی بدل گئی تھی۔ فلسطین کی آب و ہوا نے اسے پھول کی ح کھلا دیا تھا۔ دھوپ نے اس کی رنگت کو سنولا دیا تھا۔ اب وہ پھیکی' گوری رنگت کی

نہیں تھی۔ اب اس کی خوبصورتی تسخیر کر لینے والی تھی۔ اس کے جسم سے اٹھ مہک، جو کسی فرانسیسی خوشبو کی مرہون منت ہرگز نہیں تھی، یوسف تک پہنچ رہی ت اس کے دل میں عجیب سی تڑپ.......... طلب جگا رہی تھی۔

"یہ سچ ہے جو۔" راحیلہ نے کہا "تم نہ ہوتے تو میں یہاں کیسے آتی۔ تم نہ تو میں وہیں پھوپھی میلکم کے ساتھ زندگی گزارتی رہتی۔ خوف کے سائے میں۔" ا پہلی بار مس میلکم کو پھوپھی میلکم کہا تھا۔ "تم نے مجھے سکھایا کہ بدترین صورت حال م خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"تب تو تم میری شکر گزار ہو گی؟"

"تمہارے انداز میں اتنی نفرتیں کیوں ہیں جو؟ تم نے یہاں مردہ زمین کے سے زندگی کی کونپلیں پھوٹتے نہیں دیکھیں؟ دیکھیں تو ان کا دیا ہوا پیغام محسوس نہیں کیا؟ کیا یہاں کسی چیز نے بھی ایک لمحے کے لئے بھی تمہارے دل کو نہیں چھوا؟"

"دیکھو.......... میں کوئی جذباتی آدمی نہیں ہوں۔" یوسف نے کہا۔ پھر ا پوچھا۔ "یہ جینا کو کیا ہو گیا؟ یہاں آئی تھی تو شجر حیات کے لئے مری جا رہی تھی ا ایسی بے نیاز ہو گئی۔ یہ ڈاکٹر لیوی کوئی چکر چلا رہا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ ا کھیل تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے؟"

"اور اگر وہ سرے سے کوئی کھیل ہی نہ ہو تو؟"

"بی بی..........! تم بہت معصوم ہو۔" یوسف نے ایک لمحے کو سڑک سے نظر اسے دیکھا "سوچو تو.......... ایک ارب پتی خاتون، جس کی صنعتیں امریکا اور یورپ ک ترقی یافتہ ملکوں میں موجود ہیں، اسرائیل آتی ہے.......... اور کہیں سے خوبصورت گ کرنے والا ایک یہودی نمودار ہوتا ہے، تو تمہارا خیال ہے کہ اس میں کوئی چکر وگا۔ ضرور ہوگا۔ کچھ نہیں تو اتنا بہرحال ہوگا کہ وہ اس سے اپنے ملک کے لئے مالی ا لے گا، ترقیاتی منصوبوں کے لئے، اور سب سے بڑھ کر اسلحہ خریدنے کے لئے۔ ہوش آؤ راحیلہ۔ یہ گمشدہ قبیلہ.......... یہ طویل العمری کا راز.......... شجر حیات، جس بارے میں کسی باہر کے آدمی کو نہیں بتایا جاتا.......... یہ تمہیں کسی کہانی کا پلاٹ لگتا؟"

"لیکن اگر یہ سب سچ ہو تو؟"

"تو یہ بڑی خوشی کی بات ہو گی۔" یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر لیوی جا

نا ہال گھسیٹ لے، خالی ہاتھ تو اس صورت میں، میں بھی نہیں رہوں گا۔"

"تمہارے پھوپھی میلکم کے ساتھ کیا معاملات طے ہوئے ہیں؟" راحیلہ نے متجسس ہجے میں پوچھا۔ "مداخلت تصور نہ کرو تو مجھے بھی بتا دو۔"

"ارے نہیں، مداخلت کیسی۔" یوسف نے بے پروائی سے کہا۔ "میرے لئے امیابی کی صورت میں معاوضہ، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ مہم کے دوران اخراجات اور اصل اوضہ جیون بوٹی ملنے کے بعد۔ ریسرچ کے سلسلے میں مجھے باقاعدہ لگی بندھی رقم ملتی ہے۔ اخراجات کی مد میں۔ وہ رقم بھی کم نہیں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔"

"لیکن مہم کامیاب ہو گئی تو؟"

یوسف کے چہرے پر تمسخر کا تاثر نمایاں ہو گیا۔ "تم خوابوں پر گفتگو کرنا چاہتی ہو تو ی سہی۔ اس صورت میں قانونی تحفظ صرف جینا کو ہی نہیں، مجھے بھی حاصل ہے۔ جیون ٹی مل جائے تو اسے دی جائے گی۔ لیکن پہلے ڈاکٹر اس کا مکمل چیک اپ کریں گے۔ پانچ ال تک مجھے بہت معقول تنخواہ ملے گی۔ پانچ سال بعد بھی وہ زندہ ہوئی تو پھر اس کا مکمل یک اپ ہوگا۔ اگر نتائج پچھلے چیک اپ کے مقابلے میں منفی نہ ہوئے تو مجھے دس لاکھ الر ملیں گے اور اس کے بعد ہر سال دس لاکھ ڈالر ملتے رہیں گے، جب تک جینا میلکم ندہ رہے گی، لیکن ہاں.......... میرا زندہ رہنا بھی ضروری ہوگا۔"

"زبردست۔" راحیلہ نے گہری سانس لے کر کہا "زبردست چالاکی کی ہے تم نے۔"

"چالاک تو میں ہوں۔"

"میں تمہاری نہیں، پھوپھی میلکم کی بات کر رہی ہوں۔"

یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اوہ.......... تو یہ سمجھتی ہو تم۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دولت آدمی کو چالاک بنا دیتی ہے لیکن پھر بھی، میں نے خیال رکھا ہے کہ کی بھی صورت میں خسارے میں نہ رہوں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" راحیلہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تم اس وقت تک دولت کے قائل رہو گے، جب تک تمہیں کسی ایسی چیز کی شدت سے طلب نہیں ہوگی، جسے دولت بھی نہیں خرید سکتی۔ جو.......... تم جینا کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ میں نے اس رات نزارتھ میں اسے روتے دیکھا تھا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ عورتیں تو بے بات بھی رو پڑتی ہیں۔"

"جینا میلکم ایسی عورت نہیں۔ اتنے طویل ساتھ میں مَیں نے ایک بار بھی ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے' کیا ہوا تھا انہیں؟"

راحیلہ نے اس سوال کا جواب ایک سوال سے ہی دیا۔ "جو' ایک بات بتاؤ۔ یہ آنے کے بعد تمہیں اب تک کچھ محسوس نہیں ہوا' کوئی تجربہ نہیں ہوا؟"

"مثلاً؟"

راحیلہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے بیا کیا جا سکتا ہے۔ کبھی عجیب سی اداسی ہوتی ہے۔ گلا خود بخود رندھ جاتا ہے۔ کبھی عجیب اضطراب' عجیب سی تڑپ روح میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ کبھی عجیب سی قربت کا احسا ہوتا ہے.........."

"قربت! مگر کس سے۔"

اس بار راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"نہیں۔ مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ مجھے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہی ہوئی۔" بالآخر یوسف نے جواب دیا۔

کافی دیر تک وہ خاموش رہے۔ ہول یہہ جھیل سے اوپر وہ زرخیز پہاڑوں کی طر بڑھتے رہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں۔ کوہ ہرمن کی سفید چوٹی اب صاف نظر رہی تھی۔ دائیں بائیں شام کے علاقے کی پہاڑیاں تھیں۔

بالآخر یوسف نے ہی خاموشی توڑی۔ "ہم جہاں جا رہے ہیں' جس انداز میں رہے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ جا رہے ہیں' یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ذرا بھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ مہم کی کامیابی یا ناکامی جائے جہنم میں۔" اس نے کہا۔

"تم کس بات سے فکرمند ہو جو؟" راحیلہ نے پوچھا۔

یوسف نے سر کی جنبش سے جیپ کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے دونوں بکسوں ک طرف اشارہ کیا۔ ایڈ ایوری نے میتلا سے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد ان دونوں بکسوں کو وہا لاد دیا تھا۔ "جانتی ہو' ان بکسوں میں کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ان میں دودھ کے یا خشک غذا کے ڈبے نہیں ہیں۔ ایک بکس میں چیکو سلواک کے ساختہ بم ہیں اور دوسرے میں ۲۰۳ کی رائفلیں۔ یہ سامان ایک اچھی خاصی جنگ کے

ۓ بہت ہے اور میں یہاں اسرائیل کی طرف سے عربوں سے جنگ لڑنے نہیں آیا

ں۔ لعنت ہو مجھ پر!"

"لیکن تمہیں کیا؟ تم مسلمان تو نہیں ہو۔"

یوسف کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن اس نے خود پر قابو رکھا "میں پاکستانی تو ں۔"

"میں نے تمہارے متعلق جو چھان بین کرائی تھی' اس سے یہ واضح نہیں ہو سکا تھا ہ تم جوزف ڈیوڈسن ہو یا یوسف عالم۔" راحیلہ نے پرخیال لہجے میں کہا "میں ذاتی طور بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن اب بات کچھ کھل رہی ہے۔"

"تم کچھ بھی سمجھتی رہو' ایک پاکستانی ہونے کے ناتے میری ہمدردیاں عربوں کے اتھ ہیں۔ میں یہودیوں سے نفرت نہیں کرتا لیکن ان سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔"

"محبت تو تم اپنے سوا کسی سے بھی نہیں کر سکتے۔" راحیلہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں.......... یہ قانون بقا کا پہلا اصول ہے۔" یوسف نے کہا "اور تم اپنی کہو' تم تو پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہو' تمہیں کچھ بھی نہیں ہوتا؟"

راحیلہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "تم میری فکر مت کرو۔ اپنی بات کرو۔ جنگ سے ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ڈر تو نہیں لگ رہا ہے۔" یوسف نے برا مانے بغیر کہا "لیکن مجھے پرائیویٹ قسم کی جنگیں اچھی نہیں لگتیں۔ جس قسم کا سامان ہم لے کر چلے ہیں' اس سے کسی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے.......... یا مس میلکم کو۔"

راحیلہ اسے بغور دیکھتی رہی پھر بولی "کیا تمہارے پاس بھی ضمیر ہے جو؟"

"شاید نہیں.......... اسے ایک طرح کا.......... کاروباری نوعیت کا احساس ذمے داری سمجھ لو.......... میں نے کسی سے طویل زندگی کا وعدہ کیا اور طویل زندگی کی طرف جانے والے راستے پر میرے سامنے وہ مارا جائے' یہ میرے شایان شان نہیں۔ آیا کچھ سمجھ میں؟"

* * *

ڈان کے گردوپیش کا علاقہ اور سرسبز تھا۔ انہوں نے اپنی جیپیں یہودیوں کی بستی کے باہر پارک کیں۔ مقامی لوگوں نے سیاہ روٹی' کھٹی کریم اور سلاد سے ان کی تواضع کی۔ کھانے کے بعد انہوں نے پیدل سفر شروع کر دیا۔

لباس کا انتخاب کرتے وقت سفر کی دشواریوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ انہوں نے بھاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ یوسف' ایڈاوری اور ڈاکٹر لیوی کے کندھوں پر کوہ پیماؤں والے تھیلے تھے' جن کے تسمے بغل سے گزار کر انہیں پیٹھ پر کندھوں کے قریب باندھ لیا جاتا ہے۔ ان تھیلوں میں ایک دن کا کھانے پینے کا سامان تھا۔ وہ نمایاں بھی نہیں تھے کیونکہ اس وضع قطع کے لوگ اسرائیل میں عام طور پر سفر کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

وہ کئی گھنٹے تک شمال مشرق کی سمت چلتے رہے۔ بالآخر وہ ایک تنگ کچے راستے پر پہنچ گئے' جو مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں ڈاکٹر لیوی رک گیا اور اس نے ان سے خطاب کیا لیکن درحقیقت وہ خاص طور پر جینا میلکم سے مخاطب تھا۔ "ہم یہاں کچھ توقف کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا "یہ آخری مرحلے کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ ایک دوراہا ہے۔ ابھی ہمارے پاس یہ سہولت موجود ہے کہ ہم اپنے لئے راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ ہم واپس بھی جا سکتے ہیں۔ وہ مضافاتی علاقے میں خوشگوار پیدل سفر ہو گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم آگے بڑھیں.......... اس احساس کے ساتھ کہ آگے جو کچھ بھی ہونا ہے' اس کے ذمے دار ہم خود ہوں گے۔"

جینا نے اپنے مخصوص انداز میں سر ایک طرف جھکایا اور پوچھا "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ڈاکٹر لیوی؟"

"صرف اتنا کہ اس دوراہے پر رک کر سوچ لیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم خواہشوں کے جال میں الجھ جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان خواہشوں کی تکمیل پر ہماری خوشیوں کا انحصار ہے۔ ہم اپنے دل کی آواز سننے کے لئے ذرا سا توقف بھی نہیں کرتے۔

ل سامنے ہوتی ہے تو ہم ان خواہشوں کا تجزیہ کرنے' ان کی حقیقی اہمیت کو سمجھنے کی ت نہیں کرتے۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ اس راستے پر آگے بڑھنے کے بعد آپ لئے خوشی ہے یا دکھ۔ میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے بعد فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ آگے جانا چاہتی ہیں یا نہیں۔"

یوسف نے جھٹ کہا۔ "ہم آگے جائیں گے۔ اور ہم یہاں کس لئے آئے ہیں۔"

"تم خاموش رہو۔" جینا نے تند لہجے میں اس سے کہا۔ وہ اس راستے کو غور سے ہ رہی تھی' جو داہنی سمت مڑ رہا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں ڈاکٹر لیوی کو مخاطب کیا زندگی کے کسی دوراہے پر مجھے رک کر سوچنا نہیں پڑا۔ یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے ٹرلیوی!" وہ اس راستے پر چند قدم آگے بڑھی' مڑی اور پھر پلٹ آئی۔ اس نے جنوب سمت جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے' میں تمہاری بات سمجھ گئی ں۔" اس نے ڈاکٹر لیوی سے کہا "اگر میں یہاں سے واپس چل دوں' تب بھی میں ہمیشہ طرح جینا میلکم ہی رہوں گی اور اگر اپنی مرضی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کروں تو اس ے نتائج و عواقب کی ذمے دار میں ہی ہوں گی۔ یہی بات ہے نا؟"

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سرہلایا۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا تھی۔ "جی ہاں۔ یہی ت ہے۔"

جینا نے سرہلایا۔ "تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟" اس نے پوچھا۔ اس بار وہ سب سے ناطب تھی۔

راحیلہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکی تھی۔ اس نے نزار تھ میں.......... رات کی اس تاریکی میں جینا کو ہچکیوں سے روتے سنا تھا۔ وہ بے اختیار بولی "آپ وہ کریں' جس میں آپ کے لئے خوشی کا سامان ہو۔"

جینا' ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی مگر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سرہلایا۔ "میں آپ کو مشورہ نہیں دے سکتا۔"

"آپ وہ کریں جو آپ کی جگہ آپ کے ڈیڈی ہوتے تو کرتے۔" یوسف نے مشورہ دیا۔

یوسف نے میلکم پیلس میں گزرے ہوئے عرصے میں جان لیا تھا کہ جینا کی یہ کزوری ہے۔ اس وقت یہ جملہ اس نے ایسے ادا کیا' جیسے بھرے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا ہو۔ پھر اس نے فوراً ہی جینا کے چہرے کے تاثر کو بدلتے' جسم میں تناؤ پیدا ہوتے' اسے

اضطراب سے ہاتھ ملتے دیکھا۔ اس کے وجود میں طمانیت سی تیر گئی۔ وہ پھر کامیاب ہ
تھا۔ میلکم پیلس میں جینا جب بھی ڈوبنے لگتی وہ یہی حربہ استعمال کرتا تھا۔ وہی حربہ پھ
آیا تھا۔

ڈاکٹر لیوی سے سامنا ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یوسف نے مدافعت چھوڑ
جوابی حملہ کیا تھا' اس نے ایک جملے سے اس کا سحر توڑ دیا تھا۔ اس نے جینا کے ذہن
اس شخص کی یاد کا الاؤ دہکا دیا تھا' جسے وہ آئیڈیل مانتی تھی.......... جو عمر بھر دولت ا
قوت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا۔

یوسف نے طمانیت سے دیکھا' جینا کے چہرے کا نچلا حصہ جیسے پتھرا گیا تھا' ہونز
بھنچ گئے تھے اور ضدی پن کی لکیریں نمایاں ہوگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک
نمودار ہوگئی تھی' جو اس کے تجربے اور مشاہدے کے مطابق حساب کتاب لگانے ۔
مشروط تھی۔ اس کا چہرہ ویسا ہی ہوگیا تھا' جیسا یوسف نے پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔

"انتظار کس بات کا ہے؟" جینا نے تیز لہجے میں کہا "میری خواہش ہے کہ ہم آگ
کی طرف سفر جاری رکھیں۔"

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور ایڈ ایوری کو اشارہ کیا کہ وہ آگے آگ
چلے۔ ایڈ کے پیچھے ڈاکٹر لیوی' پھر جینا میلکم اور راحیلہ تھیں۔ یوسف سب سے پیچھے تھا۔
کافی دن بعد اسے یہ خوشی ملی تھی کہ وہ اب بھی جادو جگا سکتا ہے۔ اور اس کی خود اعتماد
بڑھ گئی تھی۔ دوراہا جینا کا تھا لیکن فیصلہ اس نے کیا تھا۔

یہ احساس تو اسے بعد میں.......... بہت بعد میں ہوا کہ وہ دوراہا درحقیقت سبھی کا
دوراہا تھا۔ خود اس کا بھی!

ابتدا ہی میں چڑھائی کا سفر شروع ہوگیا۔ راستہ بہت آہستگی سے اور بتدریج اوپر کی
جانب جا رہا تھا۔ اطراف میں روئیدگی تھی۔ کبھی کبھی مرغزار آ جاتے جہاں ہوا ٹھنڈی اور
شفاف تھی۔ انہوں نے پانی گرنے کی آواز سنی.......... اور ذرا ہی دیر بعد ایک پہاڑی
جھرنا ان کے سامنے آگیا۔ گرنے کے بعد پانی چٹانی سطح پر بہہ رہا تھا۔ انہوں نے پیاس نہ
ہونے کے باوجود جی بھر کے پانی پیا۔ گردوپیش میں جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

کچھ آگے جا کر پگڈنڈی معدوم ہوگئی۔ اب انہیں ایک چٹان سے دوسری چٹان پ
چڑھ کر آگے بڑھنا تھا۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ بعض چٹانیں خطرناک حد تک چکنی اور
پھسلواں تھیں۔ وہاں یوسف' جینا کو اس کی پھرتی کی دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ

سکا۔ ڈاکٹر لیوی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یوسف کو اطمینان تھا کہ جینا دوبارہ اپنے جینے کی
ہوس کی اسیر ہوگئی ہے۔

آگے جا کر چڑھائی اتنی عمودی نہیں رہی۔ پھر وہ ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئے۔ وہاں
جنگلی پھولوں کے پودے بکثرت موجود تھے۔ وہ جگہ ایک ہری بھری راہداری کی طرح
تھی۔ یہاں پہاڑی چشمہ ہموار روانی کے ساتھ چل رہا تھا اور پانی بھی خاصا گہرا تھا۔ اس
کے بہنے کی آواز دھیمی گنگناہٹ سے مشابہ تھی۔

کچھ آگے جا کر راہداری چوڑی ہوگئی۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے۔
وہاں سبزہ ہی سبزہ تھا اور دبیز خاموشی تھی.......... تہ در تہ خاموشی۔ ایک جانب شاہ بلوط کا
ایک بہت بلند و بالا درخت تھا' جو یقینی طور پر سیکڑوں سال پرانا تھا۔ اس درخت کی شاخیں
جس گھیرے میں پھیلی ہوئی تھیں' اس کا نصف قطر کسی بھی طرح پچاس گز سے کم نہیں
تھا۔ وہاں چٹانوں اور گول پتھروں کا انبار لگا تھا۔ ان میں سے کچھ بے ترتیبی سے بکھرے
ہوئے تھے اور کچھ کو انسانی ہاتھوں نے ترتیب سے لگایا تھا۔ وہاں وہ اچھے خاصے چبوترے
کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چھوٹے پتھروں کے ایک ڈھیر کے پاس تازہ مٹی کا ایک ٹیلا تھا۔
ٹیلے کے ایک کنارے ایک چھڑی گڑی تھی' جس پر ایک آہنی خود رکھا تھا۔

اس جھنڈ میں ذہن پر چھا جانے والے شاہ بلوط کے پرانے درخت کے علاوہ ایک
اور غیر معمولی چیز بھی تھی۔ وہاں تازہ پانی کا ایک چشمہ تھا۔ چشمہ تھانولے کی شکل کے
ایک گڑھے میں تھا۔ تھانولا بھر جانے کے بعد پانی کناروں سے باہر آ کر زمین پر پھیل رہا تھا۔
آگے جا کر وہ چٹانی رخنوں میں گم ہو جاتا تھا۔ تب انہیں پتا چلا کہ جس چشمے کے ساتھ
ساتھ وہ سفر کرتے آئے تھے اس کا منبع یہی تھا۔ چشمہ یہیں سے شروع ہوتا تھا۔

زمین پر سبزے اور شاہ بلوط کی سوکھی پتیوں کے قالین کی وجہ سے قدموں کی
آہٹ بھی نہیں ابھر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس مقام کا سکوت آوازوں کے لئے
ناقابل تسخیر معلوم ہو رہا تھا۔

پھر اچانک خاموشی کا شیشہ جیسے چھناکے سے ٹوٹا۔ زمین پر گری سوکھی شاخوں کے
قدموں تلے چٹخنے کی اور لکڑی اور چمڑے سے دھات کے ٹکرانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔
جھنڈ کے جنوبی حصے کی جھاڑی کے عقب سے بین آئزک نمودار ہوا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔
اس کے ہم عمر دس نوجوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب خاکی قمیض' خاکی نیکر' لمبے
موزے اور بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھے اور رائفلوں' ریوالوروں اور اسٹین گنوں سے مسلح

تھے۔ ان میں سے کچھ کی بیلٹس میں دستی بم بھی اڑسے ہوئے تھے۔ ان کے پاس تہ کردہ خیمے تھے، سامان رسد اور فاضل ایمونیشن بھی تھا۔ ان کے سروں پر برطانوی ساخت کے خود تھے۔ ان کے انداز میں چوکنا پن تھا اور چہروں پر خود اعتمادی۔ وہ دیکھنے میں فوجی لگتے تھے۔

بین آئزک، جینا کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش قامت لڑکا تھا جس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ کم عمری کے باوجود وہ پختہ کار لگ رہا تھا۔ بین آئزک نے جینا کو مسکرا کر دیکھا۔ "یہ آپ کی فوج ہے مادام۔" اس نے کہا اور پھر اپنے ساتھی لڑکے کا تعارف کرایا "یہ کیپٹن شلوموین برگ ہے۔ اس وقت یہ غیر سرکاری طور پر ہمارے ساتھ ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ ہم سب چہل قدمی کے لئے نکلے ہیں۔" اس نے مسلح لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔

خود بین آئزک اپنا کھلنڈرا پن کہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ اس وقت ایک لڑاکا لگ رہا تھا۔ وہ بھی بھاری فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور کندھوں سے بیلٹ تک کارتوس کی کراس پیٹیاں تھیں۔ بیلٹ پر چھ چیکو سلو یکین ساخت کے بم لٹکے ہوئے تھے۔

جینا نے گروپ کو بغور دیکھا اور طمانیت سے سرہلا دیا۔

یوسف، راحیلہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بین آئزک کو دیکھتے ہی راحیلہ کے چہرے پر جو تاثر نمودار ہوا تھا، اس نے اسے خصوصیت سے نوٹ کیا "تو تم ان تیاریوں میں مصروف تھے بین آئزک!" اس نے طنزاً کہا "لیکن یہ تو بتاؤ جنگ کہاں ہو رہی ہے؟"

ایڈاپوری نے اپنی رائفل اور پشتی بیگ اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا جس میں گڑی ہوئی آہنی چھڑی پر آہنی خود جھول رہا تھا۔

"وہاں.......... کوئی سو گز دور۔" اس نے کہا۔

مسلح یہودی جوان ٹیلے کے گرد نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں اور سر جھکا لئے ایڈاپوری اور ڈاکٹرلیوی بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ شلوموین برگ عبرانی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" جینا میلکم نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں.......... یہ جس سپاہی کی قبر ہے، وہ ان کا دوست تھا۔ یہ لوگ جنگ میں ساتھ تھے۔ وہ یہاں چھ ہفتے پہلے مارا گیا تھا۔"

یہ انکشاف یوسف کو دہلا گیا۔ گویا وہ کسی جنگ سے، کسی عرب ملک سے اتنے زیب تھے۔ اسے احساس ہوگیا کہ یہ اس کے لئے بدترین وقت ہے۔ اگر عربوں سے ان کی پارٹی کی جھڑپ ہوتی تو اس کی پوزیشن عجیب ہوتی۔ وہ اس لڑائی میں اپنی پارٹی کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت کا تصور کرکے ابھی سے اس کے جسم میں چنگاریاں سی دہکنے لگی تھیں۔ دوسری طرف زبان سے تو کجا، وہ اپنے ردعمل سے بھی یہ ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ وہ پاکستانی مسلمان ہے۔ ایسی غلطی سرزد ہوتی تو آخری غلطی ہی کہلاتی۔ وہ لوگ یہیں اس کی تکا بوٹی کرڈالتے۔ دوسری طرف زندگی میں پہلی بار اس کا خون جوش مار رہا تھا، جذباتیت اس پر حاوی آرہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ انسان کے لئے سب سے مشکل کام اپنے آپ سے لڑنا ہوتا ہے۔

"یہاں.......... جنگ؟" راحیلہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "اس خوبصورت اور پرسکون مقام پر!"

اس دوران یہودی فوجی اپنے ساتھی کو خراج عقیدت پیش کرکے پیچھے ہٹ آئے تھے۔

جینا نے پوچھا۔ "یہ جگہ کونسی ہے؟ اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"یہ ان مقامات میں سے ایک ہے، جو دریائے اردن کی بنیاد ہیں۔" ڈاکٹرلیوی نے جواب دیا "اس جگہ کو تل القوادی کہا جاتا ہے۔ جہاں آپ کھڑی ہیں، یہ دریائے اردن کی ٹھان ہے۔ یہاں سے پچاس گز ادھر شام کی سرحد ہے۔"

جینا کو جیسے جھٹکا لگا۔ "دریائے اردن..........؟" اس نے دہرایا۔

ڈاکٹرلیوی نے گول پتھروں اور چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس بات کا قوی مکان ہے کہ زمانہ قدیم میں ڈان قبیلے کے لوگ فیصلوں کے لئے یہاں ملتے ہوں۔ یہ روایت بھی موجود ہے کہ فیصلے والے دن فرشتہ شاہ بلوط کے اسی درخت کے نیچے نمودار ہوگا" اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا "بہتر ہوگا کہ ہم چلتے رہیں۔ لڑکوں کا کہنا ہے کہ ہاں رکنا خطرناک ہوسکتا ہے۔"

"دریائے اردن..........؟" جینا نے کسی سحرزدہ کے سے انداز میں دہرایا۔ پھر چانک اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔ جیسے اندر کوئی تڑپ مچل اٹھی ہو۔ اس نے اکٹرلیوی سے کہا "نہیں.......... میں ابھی رکنا چاہتی ہوں یہاں۔" اور پانی سے بھرے چھلکتے ہوئے تھانولے کو نظریں جمائے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ "سنا

ہے' یہ پانی گناہ دھو ڈالتا ہے۔" وہ بولی "اور میں بہت گناہ گار ہوں۔"

یوسف کو یہ بات بہت بری لگی۔ گناہ دھلنے کا یہ تصور تو ہندوؤں کے پاس ہے.......... گنگا جل۔ دوسری طرف اسے تشویش بھی ہو رہی تھی۔ "مس میلکم' یہ جگہ رکنے کے لئے مناسب نہیں۔" اس نے کہا "ابھی چند ہفتے پہلے یہاں ایک لڑکا مرچکا ہے۔ ڈاکٹر لیوی کا مشورہ درست ہے۔ اگر میں.........."

"خاموش رہو۔" جینا میلکم نے اسے ڈانٹ دیا۔ "میں نے تم سے کچھ پوچھا نہیں ہے' میں نے حکم دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے پبتسمہ دیا جائے؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جینا میلکم کے چہرے پر پریشانی کا سایہ پھیلنے لگا۔ "ڈاکٹر لیوی.......... تم مجھے پبتسمہ نہیں دے سکتے؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔ اس کی رعونت' تحکمانہ لہجہ' شاہانہ انداز.......... سب ختم ہوچکا تھا۔ اب اس کے لہجے میں بچوں کی سی التجا تھی۔ "ڈاکٹر لیوی پلیز.......... میں التجا کرتی ہوں.........."

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے بہنے کی آواز کے سوا جھنڈ میں کوئی آواز نہیں تھی۔

ڈاکٹر لیوی نے تیز نظروں سے جینا کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تم حالت طہارت میں ہو بپتسمے کے لئے؟" اب اس کے لہجے میں جینا کے لئے احترام نہیں' ایک عجیب سا دبدبہ تھا۔ جیسے اسے اپنی پوزیشن میں تبدیلی کا احساس ہوگیا ہو۔

جینا کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور جسم لرزنے لگا۔ "مجھے ایک سلام یاد آ رہا ہے آسمانی کتاب کا۔ میں اسے سن رہی ہوں لیکن دہرا نہیں سکتی۔"

بین آئزک نے اچانک پڑھنا شروع کر دیا۔ "اردن کی سرزمین سے.......... ہرمن پہاڑ سے.........."

"ہاں.......... یہی ہے.......... یہی ہے.........." جینا نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ "ڈاکٹر.......... پلیز!"

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو پبتسمہ دوں گا۔ آپ تیار ہو جائیں۔" ڈاکٹر لیوی نے باوقار انداز میں کہا۔

جینا گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے جوتے اور پھر موزے اتارے۔

یوسف نے سرگوشی میں راحیلہ سے کہا "خدا کے لئے.......... اسے روکو۔"

"خاموش رہو۔ میں کیوں روکوں؟ ان کے چہرے کو دیکھو' تمہیں احساس نہیں

تا کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

جینا اٹھ کر اس طرف گئی' جہاں مغرب میں اترتے سورج کی پیلی دھوپ پتوں سے ن چھن کر پلکیں جھپکا رہی تھی۔ وہ بہتے پانی میں کھڑی ہو گئی' جو اس کے ٹخنوں تک آ رہا

ڈاکٹر لیوی' جینا میلکم کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے جھک کر ہاتھوں کے پیالے میں ۂ ہوئے پانی کو بھرا اور پھر اس پانی کو جینا کے سفید بالوں والے سر پر یوں چھڑکا کہ پانی کے رخساروں پر بہہ آیا۔ آنسوؤں کی سی لکیریں بن گئیں۔

"میں خدائے واحد کے نام پر تمہیں پبتسمہ دیتا ہوں جینا میلکم۔" ڈاکٹر لیوی نے

وہ دونوں پانی سے نکل آئے۔ ایڈ ایوری' جینا کی طرف بڑھا۔ اس نے جینا سے ہاتھ تے ہوئے کہا "مبارک ہو مس میلکم مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی روح کی طلب ی کی۔"

اس لمحے یوسف کو ایک عجیب سا احساس شکست ستا رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی جنگ ہارا ایسی جنگ جس میں اسے عملی طور پر حصہ لینے کا موقع ہی نہیں ملا ہو۔ ایک ایسی ' جس سے اس کا بہت گہرائی میں کوئی تعلق ہو' جس میں وہ دفاع تک نہ کرسکا ہو اور بہ ہار گیا ہو۔

○---------○---------○

وہ ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ کوہ ہرمن کی طرف جانے والے راستے پر' اس گھاٹی کے ے پر سخت زمین پر کمبل اوڑھ کر لیٹے ہوئے یوسف کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بٹ پینا چاہتا تھا لیکن کیپٹن شلومو نے روشنی پر سختی سے پابندی لگا دی تھی۔ اور وہ اس لاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے ڈسپلن بہت عزیز تھا۔ بلکہ اس کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عربوں سے ان کی پارٹی کا تصادم ہو۔ وہ اس بدترین وقت کو ے دور رکھنے کا خواہش مند تھا۔

ڈان سے ذرا دور قطیرہ روڈ پر انہوں نے سرحد پار کر لی تھی....... بغیر کسی لوار واقعے کے۔ پھر وہ جنگل کی اس پٹی پر سفر کرتے رہے تھے' جو شام اور لبنان کے ن واقع تھی۔ وہاں سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ پٹی لبنانی اور شامی ا کے گشتی دستوں سے محفوظ تھی اور ڈاکٹر لیوی اور کیپٹن شلومو دونوں ہی اس ٹکراؤ

سے بچنا چاہتے تھے۔ مگر اس صورت میں انہیں لبنانی قزاقوں سے خطرہ لاحق تھا۔ یہ وحشی قزاق عرب اسرائیل جنگ سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ مہم جو پارٹیوں کو موقع ملتے ہی لوٹ لیا کرتے تھے۔ تاہم ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ راستہ نسبتاً آسان تھا۔ خاص طور پر جینا میلکم کے نقطہ نظر سے۔ کوہ ہرمن تک پہنچنے کے لئے انہیں اتھلی وادیوں کے ایک سلسلے کو عبور کرنا تھا۔ راستہ بتدریج چڑھائی کا تھا۔

پڑاؤ آدھی رات سے پہلے ڈالا گیا تھا۔ گہرے اندھیرے کے باوجود لڑکوں نے جس تیزی' پھرتی اور مستعدی سے جینا اور راحیلہ کے لئے خیمے نصب کئے تھے' وہ قابل داد تھی۔ پھر انہوں نے ان دونوں کے گدوں میں ہوا بھر کر بستر لگا دیا۔ مرد زمین پر سو رہے تھے۔

اتنے عرصے کی آرام دہ اور پر تعیش زندگی نے یوسف کو نرم کر دیا تھا۔ سو اب سخت زمین پر اس کا جسم احتجاج کر رہا تھا۔ یوسف دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔ عمر بھر اس نے صعوبتیں اٹھائی تھیں لیکن تھوڑے دن کے آرام نے اس ریاضت' اس تپسیا کو غارت کر دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اس سلسلے میں احتیاط کرے گا۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ تکلیف کی عادت دیر میں اور آرام کی بہت جلدی اور بڑی آسانی سے پڑ جاتی ہے۔ یوسف نے سر گھما کر گھاٹی کے دہانے کی سمت دیکھا۔ غبار آلود افق کے پس منظر میں اسے بین آئزک کا ہیولا نظر آیا۔ وہ کھڑا دو گھنٹے کی پہرے داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یوسف اٹھ بیٹھا۔ اس کے برابر ہی ڈاکٹر لیوی زمین کی سختی سے بے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔ یوسف اٹھا اور اندھیرے میں قدموں سے راستے کو ٹٹولتا آگے بڑھا۔ وہ بین آئزک کے قریب پہنچا تو بین آئزک نے جھٹکے سے سر گھمایا' ساتھ ہی کلک کی آواز ہوئی۔ یعنی رائفل فائر کے لئے تیار تھی۔ "ایزی بوائے' ایزی۔" یوسف نے اسے چمکارا۔ "یہ میں ہوں.......... جوزف۔"

بین آئزک کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ تاہم اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔ "یوں اندھیرے میں آزادانہ گھومنا پھرنا مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ احکامات کے مطابق تمہیں اپنے بستر پر ہی رہنا تھا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" یوسف نے کہا۔ لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کا ٹلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر ایک چٹان تلاش کی اور اس پر جم کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر یوسف نے اچانک ہی پوچھا۔ "بہت خوش ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ صورت حال تو تمہیں بہت پسند ہو گی؟"

"ہاں۔ تمہیں پسند نہیں کیا؟"

یوسف تاریکی میں مسکرایا۔ "نہیں۔ تمہیں شاید یاد نہیں۔ میں ایک امن پسند آدمی ہوں۔ میں جنگیں بھی اور طرح کی لڑتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر پوچھا۔ "تمہیں کس قسم کے چیلنج کی توقع ہے؟"

"عرب قزاقوں کی طرف سے خطرہ ہے۔" بین آئزک نے جواب دیا۔

"عرب مسلمان؟" اندر کی کسی کسک.......... کسی خدشے نے یوسف کو پوچھنے پر مجبور کر دیا۔

بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا لیکن اتنی تاریکی میں اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھنا ناممکن تھا۔ بالآخر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "قزاقوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ عیسائی بھی ہوتے ہیں' مسلمان بھی اور یہودی بھی اور وہ مذہبی اختلافات بھلا کر ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔"

یوسف نے سکون کی گہری سانس لی۔ یہ ایک اچھی اطلاع تھی۔ اس کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ قزاقوں' اسمگلروں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ وطنیت۔

"تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟" بین آئزک نے اچانک سوال کیا۔

"یونہی.......... تجسس کے زیر اثر۔"

"کہیں یہ تو نہیں کہ مسلمان پر گولی چلانے سے بچنا چاہتے ہو؟"

یوسف چوکنا ہو گیا۔ گفتگو خطرناک حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ "میں تو سرے سے گولی ہی نہیں چلانا چاہتا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "اور تم یہ نہ بھولو کہ کراچی یں' میں نے تمہیں مسلمانوں کے ہاتھوں تکا بوٹی ہونے سے بچایا تھا۔"

"وہ اس لئے کہ تمہیں مجھ سے غرض تھی۔"

"اس بھول میں مت رہو۔ میں ہر ضروری چیز کا متبادل تلاش کرنے میں ماہر وں۔ اپنا کام کسی نہ کسی طرح نکالنے کا فن آتا ہے مجھے۔"

بین آئزک نے گہری سانس لی۔ "بہرحال' تمہارا وہ قرض میں نے چکا دیا ہے۔" س نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

”ایک تو اسرائیل لا کر۔ اس سرزمین پر کسی مسلمان کا گزر نہیں۔“

”لیکن یہ احسان تم نے مجھ پر نہیں، راحیلہ ذیشان پر کیا ہے۔ وہ خالص مسلمان ہے۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔“ یوسف کے لہجے میں چہکار تھی۔

”میں اس کی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“ بین آئزک نے تپ کر کہا۔ ”تم نے دو ناموں کے حوالے سے معنی خیز گفتگو کی تھی کراچی میں۔ اور میں کیا.......... راحیلہ بھی تفتیش کرانے کے باوجود وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ مجھے تو تمہارے عزائم پر بھی شک ہو چلا ہے۔“

”شک ہی ہے نا، یقین تو نہیں۔“ یوسف نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ”شک کی بنا پر تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”یہ عدالت نہیں، جو تمہیں شک کا فائدہ دے کر بری کر دے۔“ بین آئزک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ انکشاف کر دوں کہ تم مسلمان ہو تو ابھی تمہارے ٹکڑے ہو جائیں گے۔“

اب یوسف کو غصہ آنے لگا تھا۔ ”تو یہ انکشاف کر کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے چیلنج کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ جانتا ہوں، تمہارا مذہب صرف تمہاری غرض ہے۔ دنیا کے کسی مذہب سے تمہارا تعلق نہیں۔“

رات کے اس سناٹے کا اثر تھا یا اس اجنبی، مقدس سرزمین کا فسوں، یوسف کو لگا کہ بین آئزک نے اسے دنیا کی سب سے بڑی گالی دی ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا کہ اس وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کلمہ سنا کر کر دے۔ لیکن برسوں کی خود کردہ تربیت نے اسے بروقت روک دیا۔ پھر بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے شکست ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس نے ترپ کا سب سے بڑا پتا استعمال کر ڈالا۔ ”بین آئزک! میری بات بہت غور سے سنو۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی مجھے دھمکیاں دے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مقام کوئی بھی ہو، صورت حال کیسی بھی ہو، مجھے آئندہ کبھی دھمکی نہ دینا۔ ورنہ تم سے پہلے میں اپنے، مس میلکم کے اور راحیلہ کے پاکستانی ہونے کا انکشاف کروں گا۔ پھر تمہارے ساتھیوں کو یہ بھی بتاؤں گا کہ راحیلہ ذیشان مسلمان ہے۔ بچے گا ہم میں سے کوئی بھی نہیں۔ میں یہ انکشاف بھی کر دوں گا کہ تمہاری منہ بولی ماں مس میلکم ایک مسلمان کے عشق میں گرفتار تھی۔ بلکہ اب بھی ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا، یہ تم خود سوچ لو۔“

بین آئزک کا چہرہ ستا گیا، آنکھیں جھک گئیں۔ یوسف احساس فتح سے سرشار ہو اس نے ایک بار پھر یقینی طور پر ہاری ہوئی بازی جیت لی تھی۔ ”اچھا.......... اب دل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس گفتگو کو بھول جاؤ۔“ اس نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ہیں ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ بین آئزک نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”چھوڑو اس قصے کو۔ ی اور بات کرو۔“

”بہرحال خطرہ تو ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”اگر تم کسی عرب کی رائفل کی نال کے منے آگئے اور اس نے ٹریگر دبا دیا تو تمہارا مرنا یقینی ہے، اور یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت ی سرزمین پر ہو.......... بن بلائے مہمان کی حیثیت سے۔“

”کاش.......... ایسا موقع آجائے!“ بین آئزک نے تپ کر کہا۔

”میں بہرحال یہ دعا نہیں کر سکتا اور ڈاکٹر لیوی کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”وہ کس طرح کے آدمی ہیں؟“

”زبردست.......... شاندار۔“

یوسف مسکرایا۔ ”میرا مطلب ہے، وہ کس طرح کے آدمی ہیں؟“

”اب تو تم نے بھی انہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ تمہیں وہ عظیم آدمی نہیں ؟“

”ہاں۔ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔“ یوسف نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اسرائیل میں وہ رہے ہیں؟“

”سبزیاں اگا رہے ہیں۔“

”اتنا بڑا اسکالر اور آلو، چقندر اور کھیرے اگائے۔ یہ لائن مجھے مت دو۔“ یوسف قارت سے کہا۔ ”یہ تو کسی اور سرگرمی کے لئے کور ہو گا۔ بلیک مارکیٹنگ کا چکر ہے یا انٹیلی جینس کا؟“

”دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔“ بین آئزک نے بڑے تحمل سے کہا۔

”میرے خدا! کہاں پھنس گیا میں..........“

”تم کسی بات پر.......... کسی چیز پر بھی یقین نہیں کرتے۔ ہے نا؟“ بین آئزک نے لیکن میرا خیال تھا کہ تمہیں بصارت سے کام لینا آتا ہے۔ یہ سوچو کہ پانچ ہزار

سال کی تہذیبی، ثقافتی ترقی نے یہودیوں کو کیا دیا؟ کچھ بھی نہیں۔ آج ایک مضبوط نوجوا
جس کے پاس دو توانا بازو ہوں اور وہ محنت کی خواہش بھی رکھتا ہو، دینیات کے عالموا
دس ڈاکٹروں سے زیادہ کار آمد ہے۔"

"یہ تم ڈاکٹر لیوی کا فلسفہ بیان کر رہے ہو؟"

"ہاں۔" بین آئزک نے کہا۔ "لیکن یہ بھی سن لو کہ یہ جدید اسرائیل کی اجتا
سوچ بھی ہے۔"

"وہ یہاں واپس ہی کیوں آئے۔ میں نے سنا ہے کہ یورپ میں اور امریکا میں
بہت کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔"

بین آئزک چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا۔ "انہیں بڑھاپے کا احسا
ہونے لگا تھا۔ وہ یہاں واپس آئے تو خدا کی جستجو اور تلاش میں۔ تم جانتے ہی ہو کہ ا
زمانے میں وہ ربی بھی رہے ہیں۔"

"تو کیا لندن میں، نیویارک میں یا یورپ میں خدا موجود نہیں؟"

"ہاں ہے۔ وہ ہر جگہ ہے لیکن یہاں وہ سب سے قریب ہے۔ یہاں اس سے را
زیادہ آسان ہے۔ تم نے نہیں محسوس کی یہ بات؟"

اس پر یوسف کو خدا کا وہ گھر یاد آیا، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا
اسے مولوی نعمت یاد آئے۔ ان کی باتیں یاد آئیں.......... سماعت میں جیسے ان کی آوا
چشمہ سا ابل پڑا۔ اس نے سوچا۔ ہاں، یہ درست ہے۔ یہاں اس کی قربت کا احساس ز
ہوتا ہے۔ تو یہ احساس وہاں کیسا ہو گا، جہاں اس کا گھر ہے؟ خانہ خدا.......... بیت
جہاں انسان جاتے ہیں اور خاص اس کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کی مہمان داری
تواضع کی جاتی ہے۔ جہاں بادشاہ خود کو خادم الحرمین الشریفین کہلانا اعزاز تصور کرتا
اس لمحے اس کے دل میں وہاں جانے کی ایسی طاقت ور امنگ اٹھی کہ وہ حیران رہ گیا
میں ہوں.......... میں! میں نے تو کبھی ایسے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ او
پہلا لمحہ تھا جب اس نے بیت المقدس کی سرزمین پر خدا کی قربت کا پہلا شعوری اعترا
کیا تھا۔ ورنہ یہ اعتراف تو اس نے اب تک خود سے بھی نہیں کیا تھا۔ اس لمحے اس
فیصلہ کیا کہ زندہ رہا تو وطن جانے سے پہلے خدا کے گھر حاضری دیتا ہوا جائے گا۔ وہ
رہا تھا کہ آدمی اپنے اندر کیسے کیسے طوفان لئے.......... کیسی کیسی خوبصورت بستیاں
کئے بیٹھا ہوتا ہے اور اسے علم بھی نہیں ہوتا۔

"کہاں کھو گئے تم؟" بین آئزک نے اسے چونکا دیا۔ "میرے انکل چند برس پہلے
ب یہاں آئے تو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر گئے۔ وہاں انہوں نے خدا سے بات کی۔ پوچھا
ہ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ خدا نے حکم دیا کہ انہیں یہیں رہ کر غذائی اجناس اور سبزیاں
شت کرنی چاہئیں کیونکہ لوگوں کو انہی کی ضرورت ہے۔"

"مذاق کر رہے ہو؟" یوسف نے بے یقینی سے پوچھا۔

"مذاق کی کیا بات ہے؟ یہاں پرانے زمانے میں لوگ خدا سے باتیں کرتے رہے
ں۔ میرے انکل لیوی کیونکہ سائنس داں ہیں، عملی آدمی ہیں، اس لئے انہوں نے زیادہ
سان اور براہ راست تعلق قائم کیا ہو گا۔"

یوسف اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔ "لیکن خدا نے تو صرف حضرت موسیٰؑ سے
ت کی تھی اور وہ پیغمبر تھے۔ اسی لئے انہیں کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔" اس نے احتجاجاً کہا۔

"یہ باتیں تم نہیں سمجھو گے۔" بین آئزک نے مربیانہ شان سے کہا۔ "تم اس
رزمین کے جو نہیں ہو۔"

"تو پھر جینا میلکم کو ماؤنٹ ہرمن پر لے جانے کی ہدایت بھی شاید خدا نے کی ہو
ا۔"

"ممکن ہے، یہی بات ہو۔" بین آئزک نے سادگی سے کہا۔

یوسف کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ "بین آئزک، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا چچا کس چکر
ں ہے؟ کیا کھیل کھیل رہا ہے وہ؟ اس نے اپنے سینگ یہاں کیوں پھنسائے ہیں؟ وہ جینا
د معمول کیوں بنا رہا ہے؟ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے وہ؟"

بین آئزک نے پہلو بدلا۔ اب یوسف کی نگاہیں ستاروں کی دھیمی ضو سے ہم
ہنگ ہو گئی تھیں۔ وہ بین آئزک کے چہرے کا تاثر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر
شادہ مسکراہٹ پھوٹی تھی۔ "تم عجیب آدمی ہو جو!" اس نے کہا۔ "کراچی میں تو تم مجھے
نی تھیوری پر یقین دلانے کے لئے مرے جا رہے تھے۔ جب کہ اس کے درست ہونے کا
ر دور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن تم نے مجھے بھی قائل کر لیا اور جینا ماں کو
ی.......... صرف دلائل کے زور پر۔ میں نے تمہیں بتایا کہ میرے انکل لیوی سب کچھ
نتے ہیں تو تم ان تک پہنچنے، ان سے ملنے کے لئے تڑپنے لگے۔ اب جب کہ وہ مل گئے
ں اور ہماری مدد بھی کر رہے ہیں تو تمہیں اندیشے لاحق ہو رہے ہیں۔ تم آخر ہو کیا بلا؟"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ ہماری مدد کیوں کر رہے ہیں؟"

“تو یہ بات تم ان سے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟”

“کسی دن خود ہی کھل جائے گی یہ بات۔ ” یوسف نے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ “ادھر دیکھو بین آئزک! کیا تم سمجھتے ہو کہ بیت الجبل کا واقعی کوئی وجود ہے؟ اور کیا وہاں بہت عمر رسیدہ‘ برگزیدہ لوگ رہتے ہیں؟”

“ہاں۔ مجھے پورا یقین ہے۔”

“اور وہاں کے لوگوں نے جوہر حیات دریافت کر لیا ہے؟”

“ہاں۔”

“تمہیں اس بات پر یقین کیوں ہے؟”

“اس لئے کہ انکل نتھانیل نے یہ بات کہی ہے‘ وہ وہاں جا چکے ہیں۔” بین آئزک نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ “اور کچھ جاننا چاہتے ہو تم؟”

“ہاں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جینا میلکم کو کیا ہو گیا ہے؟”

“کس اعتبار سے؟”

“تم نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ وہ تبدیل ہو گئی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ کوئی مذہبی عورت نہیں تھی۔ وہ دریائے اردن کے منبع پر اس کی ضد! اور یہ سب کچھ جو گیلی لی میں ہوا۔ یہ چکر کیا ہے؟”

“بدل تو سبھی رہے ہیں۔” بین آئزک نے جواب دیا۔ “یہاں آنے کے بعد سے ہم سب میں تبدیلی آئی ہے۔ البتہ تم اس تبدیلی کے خلاف زبردست مزاحمت کر رہے ہو۔ ذرا یاد کرو..........”

یوسف اٹھ کھڑا ہوا۔ “نہیں۔ میں نہیں بدلا ہوں‘ میں وہی عیش پسند اور تن آسان آدمی ہوں‘ جو ہمیشہ سے تھا۔ جو بغیر ہاتھ پیر چلائے‘ مشقت کئے بغیر حصول دولت کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے انکل لیوی کے ملنے کے بعد کی صورت حال بالکل پسند نہیں۔ بہرحال بین‘ گڈ نائٹ اور سوالوں کے جواب دینے کا شکریہ۔”

لیکن اپنے کمبل کی طرف بڑھتے ہوئے یوسف گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمبل پر لیٹ کر اس نے ستاروں بھرے آسمان پر نگاہیں جما دیں۔ اس کے تصور میں اللہ لہرایا۔ ہاں.......... تبدیلی تو مجھ میں بھی آئی ہے۔ ایسی کہ میں اس سے لڑ بھی نہیں سکتا۔

○-----○-----○

دوسرے دن سہ پہر کے تین بجے بین آئزک کی خواہش پوری ہو ہی گئی۔

اب وہ دن کی روشنی میں بھی سفر کر سکتے تھے کیونکہ پہاڑی کے دامن میں اگی خودرو گھاس نے انہیں چھپا لیا تھا۔ آسمان صاف تھا اور سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا لیکن وہ لوگ سائے میں تھے۔ چڑھائی اب نسبتاً عمودی اور دشوار گزار ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ ایک تنگ گھاٹی کے نچلے حصے میں سفر کر رہے تھے۔ اطراف میں کہیں چٹانوں کی دیوار تھی تو کہیں شاہ بلوط اور صنوبر کے قطار در قطار درخت اور کہیں خودرو گھاس اور جھاڑیاں۔ راستے میں گرے ہوئے درخت اور بہت بڑے بڑے پتھر حائل تھے۔

اچانک دور سے ایک لرزتی چیخ سنائی دی‘ اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز اور ایک اور چیخ! اس کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اور بم کا ایک دھماکا۔ پھر عقب کی سمت باقاعدہ رائفلیں گرجنے لگیں۔ مشین گن کے برسٹ کی آواز بھی بے حد واضح تھی۔

یوسف‘ ڈاکٹر لیوی اور جینا کے عقب میں راحیلہ کو ساتھ لئے چل رہا تھا۔ آوازیں سنتے ہی اس نے راحیلہ کو اپنی طرف کھینچا اور ایک بڑے گول پتھر کے پیچھے گرا دیا۔ پھر وہ خود بھی سینے کے بل لیٹ گیا۔ انداز اس فوجی کا سا تھا جو پہلے عمل کرتا ہے اور تفتیش کا کام بعد پر اٹھا رکھتا ہے۔

“پھوپھی میلکم!” راحیلہ چلائی۔ “کہاں ہیں وہ؟” اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

“ہلنے کی ضرورت نہیں۔” یوسف نے چیخ کر کہا۔ “مجھے تم سے زیادہ فکر ہے ان کی۔”

عقب سے بھاگتے قدموں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ یوسف نے پتھر کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بین آئزک تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا‘ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرے کے نقوش جیسے چٹخے ہوئے آئینے میں عکس کا منظر پیش کر رہے تھے۔

جینا‘ ڈاکٹر لیوی سے کوئی دس گز پیچھے حیران و پریشان کھڑی تھی.......... بین آئزک اس کی طرف دوڑا۔ “ماں میلکم.......... زمین پر لیٹ جائیں.......... انکل آپ بھی.......... وہ اس چٹان کی اوٹ میں..........” اس نے جینا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر دور گرے ہوئے درختوں کے درمیان چھلانگ لگا دی۔ اس نے جینا کو ایک درخت کے تقریباً نیچے دھکیل دیا۔ اب اگر اوپر سے فائرنگ ہوتی‘ تب بھی وہ محفوظ تھی۔

پھر بین آئزک اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا‘ اسی وقت ایک گولی قریبی چٹان سے ٹکرائی۔ بین آئزک نے اپنی رائفل بلند کر کے نشانہ لیا اور گولی چلا دی

لیکن اس گولی کا نتیجہ نہیں معلوم ہو سکا۔ بین آئزک نے یوسف کو پکارا۔ ”زمین پر لیٹے رہو اور سب کا خیال رکھو۔ ایڈ نے مجھے واپس جا کر جائزہ لینے کی ہدایت کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیپٹن شلوموکس سے لڑ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور گول پتھروں کے درمیان عقب کی طرف بھاگنے لگا۔

اب تک کوئی حملہ آور دکھائی نہیں دیا تھا۔ کہیں کچھ بھی نہیں تھا.......... نہ کوئی شعلہ‘ نہ دھواں.......... بس فائرنگ کی آواز تھی۔

راحیلہ نے پھر چیخ کر جینا کو پکارا۔

”فی الوقت وہ خیریت سے ہیں۔“ یوسف نے کہا۔ ”تم ذرا سکون سے رہو۔“

”یہ ہو کیا رہا ہے؟“

”ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔“ یوسف نے جھنجلا کر کہا۔ ”وہ ہمارے آگے بھی ہیں اور عقب میں بھی‘ اور آواز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ یہ اسرائیلی لڑکے انہیں روکنے کی کوشش..........“

”تو تم ان کی مدد نہیں کرو گے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

یوسف نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”کیا پتھر مارنے شروع کر دوں؟“ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”اور بین آئزک کو ویسے بھی ہیرو بننے کا بہت شوق ہے۔ سو اسے شوق پورا کرنے دو۔ میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں ثابت و سالم بچ نکلوں۔ یہ بہت بدبودار معاملہ ہے بی بی۔ بس زندہ رہنے کی کوشش کرتی رہو۔“

فائرنگ کی آواز بڑھ بھی گئی تھی اور قریب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بین آئزک اور اس کے ساتھی پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ حملہ آوروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن شاید وہ زیادہ موثر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

○—————○—————○

چھوٹے پیمانے پر ہونے والی جدید جنگ معصومیت اور ہلاکت خیزی کا عجیب امتزاج ہوتی ہے۔ آرٹلری کا استعمال نہ کیا جائے تو نہ دھواں اٹھتا ہے نہ کہیں آگ لگتی ہے۔ مناظر فطرت بھی جوں کے توں رہتے ہیں.......... ذرا ڈسٹرب نہیں ہوتے۔

یوسف جنگ سے نابلد نہیں تھا۔ بس وہ ہاتھ پاؤں ہلانے والا آدمی نہ تھا۔ رائفل اور ریوالور کا استعمال کرنا جانتا تھا۔ نشانہ بھی اس کا بہت اچھا تھا۔ لیکن فوج میں جانے کی اسے کبھی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ صرف جنرل کے عہدے پر کام کر سکتا تھا اور فوج

براہ راست جنرل بھرتی نہیں کیے جاتے۔ جنگی حکمت عملی پر اس نے بے شمار کتابیں تھیں۔ چنانچہ اسے شعور بھی تھا۔

لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جنگ کے چکر میں پھنسا تھا۔ صورت حال پوری طرح کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس وقت دبکے رہنے اور خود کو اور راحیلہ کو زخمی ہونے بچانے کی کوشش کے سوا کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ کراس فائر کی زد تھے۔ بین آئزک کی طرف سے وہ بے فکر تھا۔ وہ ایک تجربے کار لڑاکا تھا اور اپنا خیال سکتا تھا۔ ڈاکٹر لیوی کا کیا بنے گا‘ اس کی یوسف کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہی انہیں یہاں پھنسانے کا ذمے دار تھا۔ اس کا جو حشر بھی ہوتا‘ مناسب تھا اور وہ خود ہرگز مرنا نہیں تا تھا‘ وہ جینا کو ابدی زندگی کی تلاش میں یہاں تک لایا تھا۔ یہاں.......... اس تنگ گھاٹی ایک ایسے شخص کا مرجانا مضحکہ خیز ہوتا۔

پھر یوسف کو یہ احساس بھی تھا کہ حملہ آور جو کوئی بھی ہوں‘ حملہ کرنے کا حق کتے تھے۔ انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر لیوی اور اس کی پارٹی نے سرحدی ف ورزی کر کے انہیں حملے کی دعوت خود دی ہے۔

جس بڑے گول پتھر کے پیچھے وہ اور راحیلہ دبکے بیٹھے تھے وہ شمال کی طرف سے یں تحفظ فراہم کرنے کے لئے بہت کافی تھا لیکن جنوب کی طرف سے آنے والی بھولی لی گولیوں کے لئے وہ کھلا ہدف تھے۔ وہ سینے کے بل گھسٹتا چھوٹے پتھروں کی طرف بڑھا ران پتھروں کو جمع کر کے ایک چھوٹی سی دیوار بنا لی۔ اب وہ جنوب کی سمت سے بھی فوظ تھے۔

”اپنا سر نیچے ہی رکھو۔“ اس نے راحیلہ کے سر پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ خود و صحیح سلامت دیکھنا ہے تو ہلنے سے بھی بچو۔“

ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھا کر آگے کی سمت دیکھا۔ ڈاکٹر لیوی چند پتھروں کی اوٹ ں لیٹا تھا‘ جو اسے بہت مناسب کور فراہم کر رہے تھے۔ ڈاکٹر لیوی بخیر و عافیت بھی تھا اور لگتا تھا کہ صورت حال سے خائف بھی نہیں ہے۔ کچھ فاصلے پر گرے ہوئے درختوں کے رمیان جینا میلکم دبکی ہوئی تھی۔ ”مس میلکم۔ آپ خیریت سے تو ہیں نا؟“ اس نے چیخ کر کارا۔

”ہاں.......... میں خیریت سے ہوں۔“ جینا کی لرزتی آواز سنائی دی۔ ”بین آئزک کہاں گیا؟ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں برہمی تھی۔

"بین لڑ رہا ہے اور یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جھڑپ کس سے ہوئی ہے آپ بہرحال اپنا سر جھکائے رکھیں۔"

"تم مجھے تحفظ کی تعلیم دینے کی کوشش نہ کرو۔" جینا نے اس عالم میں بھی ا ڈپٹ دیا۔ "اور ہاں.......... راحیلہ کہاں ہے؟"

"یہاں ہے.......... میرے ساتھ۔"

"اس کا خیال رکھنا.........." جینا نے پکارا۔ "ڈاکٹر لیوی؟"

"میں یہاں ہوں مس میلکم۔"

"ہمارے آدمی صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ مجھے پورا یقین ہے ان پر۔"

"ٹھیک ہے۔ شکریہ۔ اور ہاں' تم بھی سر جھکائے رکھنا۔"

یوسف نے سوچا' بڑی بی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہی نہیں کہ موت کتنی قریب کھڑی ہے۔ وہ تو اب بھی طویل ترین زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو گی۔

اوپر کی سمت سے اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بارش سی ہوئی' پھر ایک ہیولا گرتا دکھائی دیا۔ اس کے سر پر کوئی سفید چیز تھی۔

یوسف نے دل ہی دل میں خود کو اپنی حماقت پر کوسا۔ اسے کم از کم اپنی اور راحیلہ کی حفاظت کے لئے ایک پستول تو رکھنا ہی چاہئے تھا۔ سوچنے کی بات تھی۔ دونوں طرف سے تو وہ لوگ گھرے ہوئے تھے ہی لیکن حملہ آور تعداد میں خاصے تھے۔ وہ دونوں پہلوؤں سے گھاٹی میں اتر کر انہیں زیر کر سکتے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک ہاتھ میں ایک بھاری پتھر اٹھایا اور دوسرا جیب میں ڈال کر سفید رومال نکال لیا۔ بچت کا ایک امکان ہتھیار ڈال کر صلح کا جھنڈا لہرانے میں بھی تھا۔

لیکن اس کا خدشہ پورا نہیں ہوا۔ گرنے والا تنہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ گہرے رنگ کی بنیان اور بدوضع پینٹ پہنے تھا۔ اس کے سر پر سفید رومال بندھا تھا۔ وہ گھاٹی کی دیوار سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ گھاٹی سے بیس گز اوپر شاہ بلوط کے ایک درخت نے اسے روک لیا۔

چند منٹ خاموشی رہی' پھر وہ نیچے آ گرا۔ وہ ایک نوعمر عرب تھا۔ ہاتھوں سے پیٹ دبائے' زمین پر چت پڑا وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ اس کی کراہیں بے حد دلدوز تھیں۔ وہ یقینی طور پر بڑی اذیت میں تھا۔

"میرے خدا.......... اسے کیا ہوا ہے؟" راحیلہ نے بے ساختہ کہا۔

"یہ ان ہی کا آدمی ہے۔" یوسف نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا دکھ تھا۔ برا خیال ہے' بین آئزک نے جو گولی چلائی تھی' وہ اس کے لگی تھی۔ شاید یہ کوئی چٹان ڑے لٹک گیا ہو گا۔ طاقت جواب دے گئی تو نیچے آ گرا۔"

خاموشی میں زخمی نوجوان کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔" راحیلہ نے کہا۔ "یہ بے چارہ بڑی اذیت میں ہ اور دیکھو تو.......... یہ تو بالکل لڑکا ہے۔"

"سر جھکائے بیٹھی رہو۔" یوسف نے اسے ڈانٹا۔ "اور ریوالور ہاتھ میں ہو تو لڑکے ر مرد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کو گولی ختم کر دیتی ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ ہم تور کراس فائر کی زد میں ہیں۔" لیکن اس نے بھی دیکھ لیا کہ زخمی لڑکے کی عمر سولہ ں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ سیاہ آنکھیں بہت خوبصورت تھیں اور بد چمکیلے دانت بے حد ہموار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبوچا ہوا تھا۔ وں کی انگلیوں کے درمیان سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ یوسف کو اندازہ ہو گیا کہ لی نے لڑکے کے معدے کو چھیل ڈالا ہے اور اس کا بچنا مشکل ہے۔

وہ متاسف ہو گیا۔ لڑکا شاید مسلمان عرب تھا۔ وہ زندگی کی جستجو میں نکلنے کے بعد ت کا پہلا شکار تھا.......... پہلی بھینٹ!

فائرنگ گھاٹی کے دونوں کناروں سے اب بھی ہو رہی تھی اور تواتر کے ساتھ ہو ا تھی۔ ایک گولی یوسف کے سر سے ذرا اوپر پتھر سے ٹکرائی' ایک اور گولی قریبی ت میں دھنس گئی۔ ہر طرف گولیاں سنسنا رہی تھیں۔

زخمی عرب لڑکے کی کراہیں لمحہ بہ لمحہ اور دلدوز ہوتی جا رہی تھیں۔ اب انہیں ثت کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا لیکن یوسف جانتا تھا کہ اس وقت اس کی مدد کے لئے ا اس کے لئے بے سود بھی ہو گا اور خود اپنے لئے مہلک بھی۔ وہ بری طرح گھرے ئے تھے۔

"کوئی اس بچے کی خبر لے گا بڑھ کر یا یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا!" اچانک جینا میلکم بار آواز میں چلائی۔

یوسف کا دھیان اس کی طرف ہوا۔ اسی لمحے اسے اپنے بہت قریب حرکت کا ں ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ راحیلہ جھکی جھکی بھاگتے ہوئے زخمی عرب کی طرف

بڑھ رہی تھی۔ اس نے دہاڑ کر کہا۔ "راحیلہ........ واپس آ جاؤ........ وقوف........ یہ کوئی مذاق نہیں، جنگ ہو رہی ہے۔ تم فائرنگ کی زد میں ہو۔" پھ رکاوٹیں پھلانگتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ گولیاں سر کے اوپر سے، دائیں بائیں سے سنسنا گزر رہی تھیں۔ یہ صرف خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ اور راحیلہ ابھی تک محفوظ تھے لیا آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یوسف کو راحیلہ کی حماقت پر غصہ آ رہا تھ ہر پل اسے لگ رہا تھا کہ راحیلہ اب گرے گی اور اس کے کپڑوں میں کہیں چھوٹا سا سر دھبا پھیلتا نظر آئے گا۔ "نہیں راحیلہ، نہیں۔" وہ پکارتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر راحیلہ تک پہنچ گیا۔ اس نے راحیلہ کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ اس نے اسے گھسیٹنے کوشش کی لیکن راحیلہ نے اپنا دوسرا ہاتھ ایک درخت کے تنے سے لپیٹ دیا۔ "نہی جو........ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ چلا رہی تھی........ "میں اسے لئے بغ نہیں جاؤں گی۔ اسے ساتھ لے چلنے میں میری مدد کرو۔"

یہ بڑی بات تھی کہ اس عالم میں بھی یوسف کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اس نے حسا لگا لیا کہ اب فرق کچھ بھی نہیں پڑے گا۔ زخمی عرب قریب ہی پڑا تھا۔ وہ اس تک چکے تھے۔ اب وہ صرف راحیلہ کو ساتھ لے کر جاتا یا اس زخمی لڑکے کو بھی ساتھ لی دونوں صورتوں میں زندہ واپسی کے امکانات ایک جیسے تھے۔ سو وہ آگے بڑھا اور جھک زخمی لڑکے کو کندھے پر اٹھایا۔ "اب واپس جاتے ہوئے تم میری پیٹھ سے لگ کر چلنا۔ وہ راحیلہ پر غرایا۔ اس نے سوچا، اس طرح وہ کم از کم ایک سمت سے محفوظ رہے گی۔

وہ واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس نے زخمی لڑکے کے جسم میں تھرتھراہٹ محسوس کی اور لڑکے کا پاؤں مڑ سا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکے کو ایک اور گولی لگی ہے ا اس کا مطلب یہ تھا کہ راحیلہ بال بال بچی ہو گی۔

وہ دوبارہ اپنے محفوظ مورچے میں پہنچے تو وہاں جینا میلکم اور ڈاکٹر لیوی بھی موج تھے۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے لڑکے کو زمین پر لٹا دیا۔ اچانک اسے احساس ہوا فائرنگ سست پڑ گئی ہے۔ اب اکا دکا فائر اور برسٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر لیوی، زخمی عرب پر جھک گیا۔ اس نے اس کی قمیض کے بٹن کھولے۔ ا کرتے ہوئے وہ زخمی اور جینا کے درمیان آ گیا تھا۔ یہ اس نے دانستہ طور پر کیا تھا۔ ز کے پیٹ کا زخم بہت خراب حالت میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جینا اسے دیکھے، دوسر گولی عرب لڑکے کے گھٹنے پر لگی تھی۔ یہ تازہ زخم تھا۔

لیکن لڑکے کی آنکھیں، جن میں اذیت مچل رہی تھی، جینا سے نہ چھپ سکیں۔ کا چہرہ جینا کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اذیت نے اس کے چہرے کے خوبصورت کو مسخ کر دیا تھا۔ اس کا جسم رہ رہ کر جھٹکے لے رہا تھا۔

یوسف نے سخت لہجے میں راحیلہ سے کہا۔ "اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ زیادہ دیر نہیں رہے گا۔"

جینا بولی۔ "انتظار کس بات کا ہے۔ فرسٹ ایڈ کا سامان لاؤ نا۔"

"کچھ نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر لیوی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بچنے کی امید نہیں۔"

ڈاکٹر لیوی کے الفاظ جینا کو کوڑے کی طرح لگے۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔ اس نے جھٹکے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی سی چمک رہی تھی، وہ اس وقت خود موت کا روپ نظر آ رہی تھی۔ "کیا........! کیا کہا تم نے؟ یہ نہیں بچے گا؟" وہ دیوانہ وار

"خاموش رہئے۔ یہ مر رہا ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں کہا۔

لیکن جینا تو جیسے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ "نہیں........ نہیں........ میں یہ ت نہیں کروں گی........ ہرگز نہیں۔" وہ چلائی "میں یہاں موت کی جستجو میں نہیں وں، اسے روکو........ اسے بچاؤ۔ سن رہے ہو؟"

اس کی دیوانگی نے فضا کو ڈراؤنا کر دیا تھا۔ راحیلہ بے ساختہ یوسف کے قریب ہو یوسف نے اس کے لرزتے جسم کو سہارا دیا۔

ڈاکٹر لیوی اٹھا اور اس نے جینا کا ہاتھ تھام لیا۔ "ذرا دیکھیں تو، کیا ہو رہا ہے۔" نے نرم لہجے میں کہا۔ "خوفزدہ نہ ہوں........ دیکھیں۔"

زخمی لڑکے نے رونا اور کراہنا موقوف کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ........ یہ کیا کہہ رہا ہے؟" جینا نے پوچھا۔

"کلمہ پڑھ رہا ہے۔ خدا کو یاد کر رہا ہے۔ اپنی روح کو پاک کر رہا ہے۔ خدا کی یت اور اس کے آخری پیغمبرؐ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے۔"

جینا سحر زدہ سی مرتے ہوئے لڑکے کو دیکھتی رہی، جس کے چہرے پر دنیا جہاں کا نظر آ رہا تھا۔ اذیت کے آثار مٹ گئے تھے۔ خوبصورت نقوش پھر اجاگر ہو گئے

تھے۔

"دیکھا آپ نے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ "موت مہربان اور سکون بخش بھی ہ ہے...... کسی بہت اچھے دوست کی طرح۔"

جینا نے ہاتھ ڈاکٹر لیوی کی گرفت سے چھڑایا اور اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ ا طرف پیٹھ کر کے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اگر وہ رو رہی تھی تو بے آواز رو رہی تھی؛ ا جائے بغیر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

"بے چارہ بچہ......" راحیلہ بڑبڑائی۔

"یہ اب خدا کی امان میں ہے۔" یوسف نے کہا اور اس کے کندھے سے اپ ہٹالیا۔

عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا بین آئزک اور اس کے ساتھی تھے۔ اسی لمحے سامنے کی طرف سے ایڈایوری اور ا گروپ نمودار ہوا۔ "معاملہ نمٹ گیا؟" یوسف نے پوچھا۔ "تم نے انہیں پسپا کر دیا؟

"وقتی طور پر۔" بین آئزک نے جواب دیا۔ "فی الوقت وہ پسپا ہو گئے ہیں ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کس چکر میں ہیں۔ معاملے کو پوری طرح ختم نہ سمجھو۔" نے کہا اور بڑی بے پروائی سے مردہ عرب کی طرف دیکھا۔ "ہمارے بھی دو ساتھی گئے ہیں۔"

ان لوگوں پر عجیب سا سکوت طاری ہو گیا۔ زندگی کی تلاش میں نکلنے والوں نے ہی قدم پر موت کو تین زندگیوں کی بھینٹ دے دی تھی۔

O-----O-----O

جنگ ختم ہو جائے تو جاتے جاتے ایک عجیب سا شفا بخش سکون چھوڑ جاتی ہے وقتی طور پر رکنے والی جنگ، جس میں آدمی بدستور حالت جنگ میں ہوتا ہے، ب اذیت ناک ہوتی ہے۔ اس میں مرگ آسا سپنس ہوتا ہے۔ اعصاب کھنچتے ہیں کیونکہ ا پاؤں ہلانے کا بھی موقع نہیں ہوتا۔

دونوں گروپس کے لیڈر شلومو اور ایڈایوری بے حد فکرمند تھے۔ یہاں تک ایکشن کا خواہش مند لڑاکا بین آئزک بھی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

ایڈ نے کہا۔ "ہم نے انہیں پسپا تو کر دیا لیکن بھاری نقصان نہیں پہنچا سکے ہیں بھاری نقصان کے بغیر وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ ان کا اگلا قدم کیا ہو گا؟" شلومو بولا۔

"وہ ہیں کون؟ اور چاہتے کیا ہیں؟" یوسف نے پوچھا۔

"قزاق ہیں۔" شلومو نے کہا۔ "وہ اسلحہ ملنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے ر ہمارے پاس اسلحہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے شکاروں میں سے کسی چھوڑنے کے قائل بھی نہیں۔"

"ہیں کون وہ لوگ؟ قومیت کیا ہے ان کی؟"

ایڈایوری ہنس دیا۔ "ان کی کوئی قومیت نہیں، کوئی مذہب نہیں۔ ان کے گروہوں ت بھانت کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اب اس لڑکے ہی کو لو......" اس نے طرف اشارہ کیا۔ "یہ عرب مسلمان ہے۔"

یوسف کو اپنے اعصاب پر ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ "اب کیا ہو وہ پھر حملہ کریں گے؟"

بین آئزک کے ساتھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے اور اس حفاظتی دیوار کو بلند کر ے، جو یوسف نے بنائی تھی۔ دیوار کے پیچھے سہارے کے لئے انہوں نے دو بڑے ئے تھے۔ اب وہ اچھا خاصا چھوٹا سا قلعہ بن گیا تھا۔

بین آئزک کھڑا گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا...... کسی جنرل کی طرح، جو اپنی اور پوزیشن سمجھنے کے بعد جنگ کا نقشہ ترتیب دے رہا ہو۔

یڈایوری نے یوسف کے سوال کا جواب دیا۔ "یہ عین ممکن ہے۔"

"اسی طرف سے؟ اسی طرح؟" یوسف نے پوچھا۔

مرکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ اگر پہلی بار کوئی طریقہ کارگر ثابت نہ ہو تو وہ راز میں کوشش کرتے ہیں۔ ہاں...... اگر ہم انہیں زیادہ جانی نقصان پہنچا دیتے زدہ ہو کر ہمارا پیچھا چھوڑ دیتے۔"

وسف کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکلی۔ "راحیلہ ہوشیار۔" لیکن راحیلہ تھی کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تاہم اس نے جینا میلکم کو دھکیل کر نیچے خود بھی اس پر گر گیا۔ اب کم از کم جینا بالکل محفوظ تھی۔

ی لمحے گھاٹی میں خوفناک دھماکا گونجا۔ فضا سیاہ مٹی کے بادلوں، دھوئیں اور کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے بھر گئی۔ دھماکا اس جگہ سے تیس گز پیچھے ہوا تھا، دگ موجود تھے۔

دھماکے کے ساتھ ہی دو انسانی چیخیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے بل گرا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی اور اس نے اپنی گرد دبوچ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔

"مارٹر۔" یوسف نے چیخ کر کہا۔ "ان کے پاس مارٹر ہے۔" عین وقت پر اس کم رفتار کے مارٹر شیل کو گھاٹی کی طرف گرتے دیکھ لیا تھا اور تیزی سے حرکت میں تھا.......... شیل کے زمین پر گر کر پھٹنے سے صرف ایک لمحہ پہلے۔ اور اب وہ اتنا خوفزد کہ ذہن میں موت کے سوا کوئی خیال نہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موت اب ان سب محض چند فٹ کے فاصلے پر ہے۔ رائفلوں اور اسٹین گنوں نے پھر گولیاں برسانی شروع دی تھیں۔ اس بار اوپر سے.......... گھاٹی کے دونوں پہلوؤں سے فائرنگ ہو رہی تھی قزاق مارٹر بھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ بلندی پر تھے' لہٰذا بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ایوری اور شلومو نے چیخ کر کہا۔ "کور" دونوں نے اپنے اپنے آدمیوں کو فائرنگ سمت میں پھیلا دیا تھا۔

یوسف نے سر اٹھا کر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ حفاظتی دیوار کے اس طرف کھ تھی۔ دونوں زخمی لڑکے بھی وہیں موجود تھے۔ دونوں کو پتھر کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں زخمی کیا تھا۔ ایک کا گھٹنا ہدف بنا تھا اور دوسرے کی گردن۔

چیخ کر ہدایات دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور اٹھ کر جانا اور راحیلہ کو لانے کوشش کرنا بھی بے سود تھا۔ کیونکہ موت صرف چند لمحوں کی مسافت پر تھی۔ گھاٹی دوسری طرف مارٹر کا ایک اور گولہ پھٹا۔ اس بار گولہ کافی آگے پھٹا تھا۔ اس سے اس سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا کہ گھرے ہوئے لوگوں کے اعصاب لرز کر رہ گئے.......... ایک گولہ پیچھے اور ایک آگے! یہ طے تھا کہ اب وہ مارٹر کا رخ درست کریں گے اور اگلا گو خطرناک حد تک قریب ہو گا اور چوتھے گولے کے بعد صفائی ہو چکی ہو گی۔

یوسف اٹھا اور راحیلہ کی طرف لپکا' جو دونوں زخمی لڑکوں کو سہارا دے رہی تھی وہ اور راحیلہ انہیں مورچے میں لے آئے۔ راحیلہ کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز تھا۔ پہلی بار اسے جنگ کی ہولناکی اور سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے خود کو سنبھا ہوا تھا اور زخمی لڑکوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

یوسف دل میں سوچ رہا تھا.......... کون کہہ سکتا تھا کہ عیش و آسائش کی دلدا عدم تحفظ کے احساس سے خوفزدہ یہ حسین اور نازک لڑکی اتنی جرات مند بھی ہو سکتی ہے؟

ن افسوس! کسی بھی لمحے ہم سب ختم ہو جائیں گے اور میں اسے کبھی نہیں بتا سکوں گا میں نے اس لمحے میں کیا محسوس کیا ہے۔

جینا ایک بڑے گول پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ ' جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس دوسرے فائر نے ڈاکٹر لیوی کو دہلا دیا تھا۔ وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ زخمی لڑکے کے گھٹنے پر دوا لگا کر پٹی باندھ رہا دوسرے کی گردن سے بھی اس نے ٹکڑا نکال کر ڈریسنگ کر دی تھی۔

اسی لمحے تیسرا گولہ پہلے دونوں گولوں کے درمیان کسی مقام پر گر کر پھٹا۔ کمی رف اتنی رہ گئی کہ وہ ان کے مورچے سے خاصا بائیں جانب پھٹا تھا ورنہ اس کہانی کا نام وہیں ہو جاتا۔ موت دبے قدموں قریب تر آتی جا رہی تھی۔

"بہت خراب صورت حال ہے' ہے نا؟" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

یوسف نے اثبات میں سرہلایا۔ "بدترین کہئے۔" اس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا' اب د کو بہلانے سے کیا حاصل۔ "اب ہمارے پاس زندگی' تین چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ٹ کی مہمان ہے۔"

جینا میلکم کی آنکھوں میں جیسے خلا اتر آئے تھے۔ "میں مرنا نہیں چاہتی۔ میری اری دولت.........."

اچانک بین آئزک حفاظتی دیوار کے پاس نمودار ہوا۔ وہ یوسف کی طرف چلا آیا۔ ں کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور بیلٹ میں لگے ہکس پر چھ بم جھول رہے تھے۔ تمہیں ان کی پوزیشن کا کچھ اندازہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

یوسف چند لمحے یاد تازہ کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "وہ جو پہاڑی کی چوٹی پر V کا ثان ہے' اس کے بائیں جانب صنوبر کے دو درخت ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ وہیں ں۔"

بین آئزک نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "شکریہ۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا۔"

"کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"مارٹر کو تباہ کرنا ضروری ہے۔"

"تم مارے جاؤ گے۔"

"ممکن ہے لیکن کم از کم کچھ کرتے ہوئے مارا جاؤں گا۔ ورنہ مارٹر کی موجودگی میں ویوں بھی مارا جانا ہے۔"

ڈاکٹر لیوی نے جینا سے کہا۔ "ذرا مجھے اپنی بائبل دیجئے۔"

بین آئزک نے شلومو کو پکارا۔ "تمہیں مجھے کور دینا ہو گا۔"

"بے وقوفی مت کرو بین!" شلومو نے چیخ کر کہا۔ "یہ تو خودکشی ہے، ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

"میں جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنا ہے۔ میں آواز دوں تو اوپر کی طرف بڑھنا۔" یہ کہہ کر بین آئزک تیزی سے حرکت میں آیا۔ وہ سینے کے بل رینگتا ہوا پہاڑی کے پہلو کی جانب بڑھنے لگا۔

راحیلہ نے یوسف سے پوچھا۔ "جو......... یہ بین آئزک کہاں جا رہا ہے؟؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "یہ اس مارٹر کو تباہ کرنے جا رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ مارا جائے گا۔"

"ہاں، زیادہ امکان اسی بات کا ہے۔"

ڈاکٹر لیوی بائبل پڑھ کر سنا رہا تھا۔ یوسف نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑھے ڈاکٹر لیوی کے برابر جینا میلکم بڑے گول پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر لیوی جینا کی چھوٹی بائبل کھولے اسے پڑھ رہا تھا۔

اوپر سے ہونے والی فائرنگ کی آواز ڈاکٹر لیوی کی آواز پر حاوی آ گئی۔ قزاق، بین آئزک پر فائرنگ کر رہے تھے۔ بین اتنی مخالف سمت میں بڑھ رہا تھا کہ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھ سکے تھے۔ ان کی دانست میں وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا......... اور یہ ان کے لئے خطرناک تھا۔ اس کے ساتھ ہی نیچے سے بین آئزک کے ساتھیوں نے زبردست فائرنگ شروع کر دی تاکہ بین کو کور فراہم کر سکیں۔

بین آئزک چیتے کی سی تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر وہ خاصا محفوظ ہو گیا کیونکہ قزاقوں کے لئے اسے دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اب اس نے داہنی جانب بڑھنا شروع کیا۔ وی کی شکل کے نشان کے عین نیچے پہنچ کر وہ رکا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ درست مقام تک آ پہنچا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی آسان چڑھائی نہیں تھی، پھر بھی وہ بہت مہارت سے چڑھ رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ تیز رفتاری دکھائے۔ فائرنگ سے اب وہ بہرحال محفوظ تھا۔

"اس نے میری روح کو پاکیزگی عطا کی ہے۔" ڈاکٹر لیوی بائبل سے الوہی گیت پڑھ کر سنا رہا تھا۔ "اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ ہدایت دی کہ میں اس کے نام کا چرچا

رون......... اس کے نام کی سربلندی کے لئے کام کروں........."

ایک گولی ان کے عقب میں بڑے گول پتھر سے ٹکرائی۔ پتھر کے ٹکڑے اور ذرے ے۔ اسی لمحے اس کے ساتھ بیٹھی راحیلہ چلائی۔ بین آئزک چوٹی سے آدھے فاصلے پر لیکن اب وہ لڑھکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

یوسف بے ساختہ چیخا۔ "میرے خدا......... اسے شاید گولی لگی ہے۔"

راحیلہ تیزی سے اٹھی۔ اگر یوسف نے اس کی کلائی نہ تھام لی ہوتی تو وہ مورچے ے نکل ہی گئی تھی......... وہ چیخ رہی تھی۔ "بین......... بین آئزک!" یوسف کو دکھ نے لگا......... بین آئزک کا زیاں راحیلہ کا ہی نہیں، اسے اپنا نقصان بھی محسوس ہو رہا

جینا نے تیز لہجے میں کہا "راحیلہ......... خاموش رہو اور بائبل سنو۔" وہ پوری ح اپنے کنٹرول میں تھی۔ اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا تھا۔

ڈاکٹر لیوی پڑھ رہا تھا "اگرچہ میں موت کی وادی میں سفر کر رہا ہوں لیکن میں برائی ے......... شیطنت سے نہیں ڈروں گا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس کی رحمتیں اور شتے میرے پاسباں ہیں........."

بین آئزک نیچے گرنے کے بعد چند لمحے ساکت رہا پھر اس نے دوبارہ اوپر چڑھنا روع کر دیا۔ اس بار اس کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی اور وہ بہت محتاط دکھائی دے رہا ۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ تیز رفتاری میں وقت ضائع ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے۔

یوسف نے راحیلہ کو بازوؤں سے تھام کر جھنجوڑ ڈالا۔ "خود کو سنبھالو۔ بین آئزک بت سے ہے۔ وہ محض پھسلا تھا۔ وہ دیکھو......... وہ پھر چڑھ رہا ہے۔"

راحیلہ نے جو سر جھکائے بیٹھی تھی، سر اٹھا کر پہاڑی کی سمت دیکھا اور بے جان از میں مسکرا دی۔

دوسری طرف شلومو اور اس کے ساتھی بدستور زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ اق جوابی فائرنگ میں اتنے مصروف تھے کہ شاید انہیں بین آئزک یاد بھی نہیں رہا تھا۔ مارٹر سے ایک اور گولہ فائر کیا گیا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی ان لوگوں سے کافی فاصلے پر ا اور کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس بار یوسف اس نتیجے پر پہنچا کہ مارٹر اور اس کا ونیشن قزاقوں کے ہاتھ کہیں سے لگ گیا ہو گا لیکن وہ اسے ٹھیک طرح سے چلانے پر ر نہیں تھے۔ ورنہ اب تک تو ان سب کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔

کچھ دیر بعد بین آئزک پہاڑی کی چوٹی پر وی شکل کے شگاف تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ رکا اور سینے کی بیلٹ پر ہک سے اٹکا ہوا ایک بم نکالا' دانتوں میں دبا کر اس کی پن کھینچی اور اسے اوپر کی طرف اچھال دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اوپر کی طرف لپکا بھی۔ گھاٹی میں' مورچے میں چھپے ہوئے اپنی پارٹی کے لوگوں کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ مزید بم ذرا ذرا سے فاصلے پر اچھالے پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسٹین گن سے فائرنگ کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایوری' شلومو اور دوسرے لڑکے پہاڑی کی سمت لپکے۔

اوپر سے ہونے والی فائرنگ رک گئی۔ شاید کھیل ختم ہو چکا تھا۔ وہ سناٹا مارٹر کے گولوں کے دھماکوں سے زیادہ خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر لیوی نے بائبل سے تیسویں الوہی گیت کا آخری بند سنایا۔ "خدا کا رحم اور مہربانی تمام عمر میرے ساتھ رہے گی اور میں خدا کے گھر میں تاابد خوش و خرم رہوں گا۔" پھر اس نے بائبل بند کر دی۔ اب بین آئزک اوپر سے بھاگتا ہوا گھاٹی میں اتر رہا تھا۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا۔

نیچے آکر اس نے راحیلہ کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا گیا۔ "راحیلہ.......... تم خیریت سے تو ہو نا؟ سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟" پھر اس نے خود ہی دیکھ لیا کہ سب خیریت سے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر راحیلہ کا کندھا تھپتھپایا۔ راحیلہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ یہ طویل اعصابی کشیدگی کے بعد پرسکون ہونے کا ردعمل تھا۔ اس کے ہاتھوں کی سفید پوروں کو دیکھ کر یوسف کو احساس ہوا کہ وہ اسے کتنی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

"بس چپ ہو جاؤ۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" بین آئزک نے اسے دلاسا دیا لیکن خود اس کی آنکھوں میں جنگ کی آگ اب بھی لہرا رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا' جیسے خدشہ ہو کہ کوئی اور کم نہ ہو گیا ہو۔

یوسف نے جیب سے پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگا لی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیسا افسانوی اختتام ہو رہا ہے اس کہانی کا۔ ہیرو کو ہیروئن مل گئی۔ اور کیوں نہ ملتی' ایسے بہادرانہ کارنامے کے بعد کون ایسی عورت ہو گی' جو اس کی محبت سے بچ سکے گی' اور شاید......... ہاں راحیلہ تو شاید ابتدا ہی سے بین آئزک کی اسیر محبت ہے۔ جس وقت وہ بین آئزک کے پھسل کر گرنے پر روئی تھی' اس نے اس کی سات پردوں میں چھپی ہوئی محبت کو عیاں کر دیا تھا۔ بہرحال یہ تو ہونا تھا۔ ایسا تو ہوتا ہے۔ سائیڈ ہیرو بھی کبھی زیادہ غم نہیں کرتے۔

یے راحیلہ وقت پڑنے پر.......... بحران کے دوران اس سے بہت مختلف ثابت ہوئی ی' جیسی نظر آتی تھی۔ مشکل وقت میں اسے اپنا نہیں.......... دوسروں کا خیال رہا تھا۔

بین آئزک اپنے انکل کے پاس گیا اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' نتھانیل نے بڑی محبت سے انگلیوں سے اس کے رخسار کو تھپتھپایا۔ جیسے اس کے بخیر و عافیت ہونے یقین چاہتا ہو۔ "انکل نتھانیل' میں نے کیسا کام دکھایا؟" اس نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔ رجواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "اس کی تربیت مجھے ایک برطانوی میجر نے دی تھی۔"

ڈاکٹر لیوی نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہری اداسی تھی۔ "ہاں بین آئزک! تمہاری کارکردگی شاندار تھی۔ تم ایک بہادر اور باع جوان ہو اور میں بے وقوف بھی ہوں اور گناہگار بھی۔ مجھے ہدایت کے مطابق اپنے مرک کر اپنی سبزیوں' ترکاریوں کی دیکھ بھال کرنی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ میری وجہ ے تین افراد ہلاک ہو گئے۔"

"دو کہئے' ایک تو دشمن تھا۔" بین آئزک نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ وہ بھی خدا کا بندہ تھا۔ بھٹکا ہوا سہی لیکن تھا اسی کا بندہ۔ میرے ضمیر پر شہ بوجھ رہے گا۔ میں.........."

بین آئزک نے تیز نگاہوں سے اپنے انکل کو دیکھا۔ "انکل' اسے میں نے شوٹ یا تھا۔ بوجھ تو میرے ضمیر پر ہونا چاہئے۔"

"میں تمہارا گناہ اپنے سر لیتا ہوں۔"

بین آئزک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اپنے سینے میں ایک مہیب خلا کا ساس ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہو گئی اور انداز بھی فاتحانہ نہ رہا۔ وہ چھ فاصلے پر ایک چٹان پر جا بیٹھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

یوسف کو ڈاکٹر لیوی کا فلسفہ بہت مضحکہ خیز اور احمقانہ لگا۔ جنگ ان پر تھوپی گئی ں اور اگر وہ لڑکا نہ مارا جاتا تو خود ان میں سے کوئی نہ کوئی ختم ہو جاتا۔ وہ بین آئزک کی رف بڑھا۔ "کیوں افسردہ بیٹھے ہو؟ سر اٹھاؤ' تم نے بہت شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے۔" اس نے کہا "اور تم الٹا مجرم بن کر بیٹھ گئے۔"

بین آئزک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "جو.......... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ل نتھانیل نے غلط نہیں کہا.........."

یوسف وہاں سے ہٹ آیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرانے سے

کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اسی وقت راحیلہ اس کے پاس چلی آئی۔ ”شکریہ جو۔ تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی' مجھے بچایا۔“ اس نے شکر گزاری سے کہا اور یوسف کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تمہارے شکریے کا مستحق نہیں۔“ یوسف نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ”مجھ پر تو اتنا اعتماد بھی نہیں کیا گیا کہ مجھے ایک رائفل ہی دے دی جاتی۔ میں اس جنگ میں شریک ہونا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اپنے دفاع کے لئے کچھ تو ہوتا میرے پاس۔ بین آئزک نے تنہا یہ جنگ جیتی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو۔ وہ نہ ہوتا تو ہم سب ختم ہو جاتے۔ اس کے حوصلے کی کوئی حد نہیں۔ وہ بہت جرات مند ہے۔“

راحیلہ چند لمحے اسے بغور دیکھتی رہی۔ پھر تند لہجے میں بولی۔ ”لیکن تمہارے پاس جتنی جرات' جتنا حوصلہ ہے وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور واپس چل دی۔

یوسف اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے ذہن میں راحیلہ کے سوا کوئی خیال نہیں تھا۔ کدال کے زمین سے ٹکرانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ شلومو اور اس کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اٹھا لائے تھے اور اب ان کو اور عرب لڑکے کو دفن کر رہے تھے۔ جینا میلکم' زخمی لڑکے کے گھٹنے پر دوا لگا رہی تھی۔ اس نے خود کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی نرمی' بڑی مہربانی تھی۔

یوسف کو وہ وقت یاد آیا' جب وہ ڈاکٹر لیوی سے بائبل کے الوہی گیت سن رہی تھی۔ وہ انہماک.......... اور اس نے کیسے راحیلہ کو چپ کرایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ جینا میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کے انداز سے نہیں لگتا کہ وہ اب مرنے سے خوفزدہ ہے۔ وہ خود کو بہت اکیلا اور بے حد تھکا ماندہ محسوس کرنے لگا۔

○-----○-----○

انہیں برگزیدہ لوگوں کے گاؤں' بیت الجبل پہنچے وہ تیسرا دن تھا۔ وہ کوہ ہرمن کے مغربی پہلو کی جانب' چوٹی اور وادی کے درمیان ایک تنگ ترین پگڈنڈی کے کنارے واقع تھا۔ یوسف کا ٹھکانا گاؤں کے بیرونی کنارے کی طرف تھا۔

راحیلہ' یوسف کے پاس آئی۔ ”مس میلکم نے تمہیں بلایا ہے۔“ اس نے کہا ”وہ فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ بین آئزک اور ڈاکٹر لیوی کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں یہاں کے پوشیدہ غاروں کی تلاش میں نکلے ہیں۔“

راحیلہ نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ ”لگتا ہے پھوپھی میلکم ان کے علم میں لائے ہر تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

یوسف کے اندر احساس فتح اور تجسس جیسے گھل مل گئے۔ ڈاکٹر لیوی اب تک اپنی ام تر کوشش کے باوجود بستی کے بڑوں کو ثمر حیات دینے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ ان کا کہنا ا کہ جو ہر حیات خود بستی کے بھی صرف منتخب لوگوں کو دیا جاتا ہے۔

”میں سوچ رہا تھا کہ مس میلکم کا تحمل آخر کب جواب دے گا۔“ اس نے کہا۔

راحیلہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے کہا ”معاملات ٹھیک نہیں چل رہے ں۔“

”کیوں.......... کیا گڑبڑ ہے؟“

”وہ بہت موڈی اور اعصاب زدہ سی ہو رہی ہیں۔“ راحیلہ نے بتایا۔ ”باہر نہیں لتیں' ہر وقت اپنے غیر آرام دہ کمرے میں بیٹھی باہر دیکھتی رہتی ہیں' چہرے پر ویسا ہی اثر ہوتا ہے' جیسا کراچی میں اس وقت ہوتا تھا جب وہ کسی کی فیکٹری' کوئی مل یا کمپنی ریدنے پر اڑ جاتی تھیں۔ مجھے ان کے ہاتھوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ انہیں ایک دوسرے ں پھنسا لیتی ہیں اور وہ اتنی سختی سے پھنس جاتے ہیں کہ کبھی کبھی تو وہ کوشش کے باوجود نہیں دیر تک الگ نہیں کر پاتیں۔“

”پر سکون اعصاب کی عورت تو وہ کبھی بھی نہیں رہیں۔“ یوسف نے تبصرہ کیا۔ 'انہیں کشیدگی ہی راس آتی ہے اس لئے تو وہ اب تک زندہ ہیں۔“

”مگر ابھی ایک ہفتہ پہلے وہ بہت خوش اور پر سکون تھیں۔ وہ بہت مختلف ہو گئی تھیں۔“

یوسف خاموش رہا۔ وہ مختلف جینا ہی تو اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس جینا کو وہ ینڈل نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ پرانی والی جینا اس کے اختیار میں تھی اور اب جینا کی طرف ے اس بلاوے کا مطلب یہ تھا کہ اسے ڈاکٹر لیوی پر مکمل اعتبار نہیں رہا ہے۔ یہ یوسف کے لئے خوش آئند بات تھی۔

اس مکان کی طرف جاتے ہوئے جہاں وہ جینا کی ساتھ مقیم تھی' راحیلہ نے کہا۔ ”ان کی مدد کرو جو۔“

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی.......... کسی جذبے کی حدت کہ یوسف نے چونک کر اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ راحیلہ کی نگاہوں میں ایک تند التجا تھی' جس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے اسے حیران بھی کیا اور جسے وہ سمجھ بھی نہ سکا۔ “تم فکر نہ کرو۔ یہ معاملہ مجھ پر چھو دو۔” اس نے اسے دلاسا دیا۔ “میرا خیال ہے‘ وہ سمجھ گئی ہیں کہ انجام کار ان کا یہ خا ہی ان کی خواہش پوری کرنے کا سامان کر سکے گا۔”

راحیلہ نے اداس نظروں سے‘ جن میں مایوسی بھی گھل مل رہی تھی‘ اسے جی میلکم کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ وہ افسردہ تھی کہ یوسف اس کی بات بالکل نہیں سمجھ ر ہے۔ وہ اپنے نزدیک کائنات کا مرکز خود ہی تھا۔ وہ غیر حساس تھا۔ اسے اپنی سخت مزاجی احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کی کلبیت کے خول کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اس معاملے میں یوسف بے بس ہے۔ و ہے ہی ایسا لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ خود کو سرنگوں محسوس کرتی رہی۔ وہ بے حد ناخوش تھی۔

○-----○-----○

جینا میلکم کھڑکی میں کھڑی گاؤں کے سفید مکانوں کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یوسف کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ تیزی سے مڑی۔ اس کے انداز میں بلا کی وحشت تھی۔ “ڈاکٹر لیوی کہاں ہے؟” اس نے پوچھا۔

یوسف نے اسے بتا دیا۔

“وہ میرے سلسلے میں کچھ نہیں کر رہا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو چکے ہیں۔”

“ڈاکٹر لیوی کا کہنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ تیز رفتاری مضر ثابت ہو گی۔”

“ان لوگوں کو معلوم ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں؟”

“میرا خیال ہے‘ وہ جانتے ہیں۔”

“تمہارا کیا خیال ہے‘ لیوی میرے مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کر رہا ہے؟”

یوسف نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی کے لئے جینا کی بے اعتمادی اس حد تک بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنے پتوں کو بہت محفوظ طریقے سے کھیلنا چاہتا تھا۔ “میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔” اس نے بہت محتاط انداز میں کہا۔ “ڈاکٹر لیوی نے اس سلسلے میں مجھے بھی اعتماد میں نہیں لیا ہے۔”

“جب تم کراچی میں پہلی بار مجھ سے ملے تھے اور مجھے قائل کیا تھا تو کیا تمہارے ذہن میں یہی مقام تھا؟ یہیں لانا چاہتے تھے تم مجھے؟ کیا یہی وہ مقام ہے‘ جو طوفان نوح کے دوران ڈوبنے سے رہ گیا تھا اور اسی لئے جوہر حیات محفوظ رہ گیا تھا؟” جینا نے پوچھا۔

“مجھے اس بارے میں ریسرچ کرنا تھی۔” یوسف نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

“لیکن یہاں ہم ڈاکٹر لیوی کی ذمے داری پر آئے ہیں۔”

جینا نے اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ “یہاں بہت بوڑھے لوگ موجود ہیں‘ جن کی عمریں بہت.......... بہت.......... بہت زیادہ ہیں۔ تم نے نوٹ کی یہ بات؟”

“جی ہاں۔”

“اور یہ اس حیات بخش مادے کو کیا کہتے ہیں؟”

“ڈاکٹر لیوی کے بیان کے مطابق اس نام کا ترجمہ “شجر حیات کا پھل” کیا جا سکتا ہے۔”

“وہ ہے کیا چیز؟ کہاں اگائی جاتی ہے؟ کیسی ہوتی ہے؟”

“مجھے نہیں معلوم اور میرا خیال ہے‘ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سوائے اس طویل القامت بزرگ کے‘ جو سب سے معمر بھی ہے اور اس قبیلے کا سربراہ بھی ہے۔ یا پھر وہ ذہین بزرگ‘ جو وعظ دیتا ہے‘ وہ جانتا ہو گا۔”

“ڈاکٹر لیوی نے تمہیں اس سلسلے میں کیا بتایا ہے؟”

“ڈاکٹر لیوی نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ جو چیز بھی ہے‘ اس کی پیداواری مقدار بہت کم ہے اور موسم کی وجہ سے یا نامعلوم وجوہات کے تحت اس کی فصل تیار ہونے میں دو سے تین سال تک کا عرصہ لگتا ہے اور جو فصل تیار ہوتی ہے‘ اس سے صرف ایک آدمی مستفید ہو سکتا ہے۔ بستی کے بڑے مل بیٹھتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ خوش نصیب کون ہے‘ جسے طویل عمر جینے کا موقع دیا جائے اور یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی جاتی کہ پھل کسے دیا گیا ہے۔”

جینا نے کہا۔ “یہی کچھ اس نے مجھے بتایا ہے۔” پھر وہ تند لہجے میں بولی۔ “اور مجھے یقین ہے اس پر۔” وہ آگے بڑھی اور اس نے یوسف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند لمحے وہ اسے تحکمانہ انداز میں دیکھتی رہی۔ “میں جانتی ہوں کہ جوہر حیات اس وقت بھی گاؤں میں موجود ہے۔ اسے میرے لئے حاصل کرو۔” اس کا لہجہ بھی تحکمانہ تھا۔

یوسف بری طرح چونکا۔ اس فرمائش کی تو اسے توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے احتجاج کیا۔ “یہ آپ ڈاکٹر لیوی سے..........”

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لیکن جینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ڈاکٹر لیوی زمانہ ما قبل تاریخ کے غاروں کی تلاش میں مصروف ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اس معاملے میں تمہیں اپنا بااختیار ایجنٹ مقرر کر رہی ہوں۔ جاؤ اور ان سے مذاکرات کرو۔ مجھے جوہر حیات چاہئے.......... فوراً.......... بغیر کسی تاخیر کے..........“

یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں کوشش کروں گا۔ بہرحال یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ میں تو ان کی زبان بھی نہیں بول سکتا۔ ضروری نہیں کہ انہیں اپنا مدعا سمجھا بھی سکوں۔“

”ایک زبان ایسی بھی ہے‘ جو پوری کائنات میں سمجھی جاتی ہے۔“ جینا نے منہ بنا کر کہا۔ ”اور وہ ہے دولت کی زبان۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں یہاں کیوں مقیم ہوں۔ تم صرف اتنا کرو کہ قیمت معلوم کرو اور مطلوبہ چیز خرید لو۔ منہ مانگی قیمت ادا کرو۔ میں تمہیں مکمل اختیار دے رہی ہوں۔“

”جی بہت بہتر۔“ یوسف جانے کے لئے مڑا۔

”ایک بات اور۔ ڈاکٹر لیوی کو اس معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں اتنا انعام ملے گا‘ جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“

O-----O-----O

بیت الجبل سفید پتھروں سے بنے ہوئے مکانات پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مرد‘ عورتیں اور بچے.......... سب ملا کر آبادی تین سو نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ مردوں میں کئی ایسے تھے‘ جو بہت.......... بہت زیادہ معمر لگتے تھے‘ ایسا لگتا تھا کہ اس بستی کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق‘ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ وہاں نہ ٹیلی فون کی سہولت تھی‘ نہ ٹیلی گراف کی‘ وہاں کے لوگ خود انحصاری کی زندگی گزار رہے تھے اور اس پر نہ صرف قانع بلکہ خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں بے حد صاف ستھرا تھا۔

گاؤں تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں کو مسلسل چڑھائی کا سفر کرنا پڑا تھا۔ کوہ ہرمن کے دامن سے پہاڑ کے مغربی رخ وہ برف کی حد تک چڑھتے چلے گئے تھے۔ وہاں انہیں قدرتی کھائی نظر آئی تھی۔ کھائی کی جڑ میں ایک چٹان تھی اور اس چٹان میں ہی ایک تنگ راستہ تھا‘ بظاہر وہ راستہ محض ایک قدرتی دراڑ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر لیوی انہیں اس دراڑ میں لے گیا تھا۔ دراڑ آگے جا کر نسبتاً چوڑی ہو جاتی تھی۔ وہ درحقیقت ایک تنگ راہداری تھی۔ ٹھوس گریفائٹ کی اس چٹان میں آتش فشانی شگاف تھا۔ دراڑ سے نکلتے ہی انہیں ایک چھوٹی‘ بے حد سرسبز وادی نظر آئی۔ وہاں زراعت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس معلق گاؤں کی بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ جابجا انہیں پراسرار تاریک غار نظر آئے۔ گاؤں کے لوگوں نے ان کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ وہ بہت شیریں گفتار اور مہربان لوگ تھے۔ ایک بہت معمر دراز قد شخص اس قبیلے کا سربراہ تھا۔ اس کا نام بارزی لئی تھا۔ ایک واعظ بزرگ تھا‘ جس کا نام املکے تھا۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ مسلمان تھے۔ کچھ عیسائی اور کچھ یہودی بھی تھے لیکن ان لوگوں کے انداز سے ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں۔ سب اپنے اپنے انداز میں خدا کی عبادت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ فطرت نے وقت کو اس چٹانی دراڑ کے پار لا کر سرسبز وادی میں قید کر دیا ہے۔ وہاں وہ غار تھے‘ جن کی عمریں نوع انسان کی عمر سے زیادہ تھیں۔ ان غاروں نے پارٹی کے سبھی لوگوں کو مسحور کر لیا تھا۔ خاص طور پر یوسف کو‘ وہ سوچتا‘ کون جانے وہ غار کیسے کیسے رازوں کے امین ہوں گے۔ ان میں کیسے کیسے فنون کی ترویج ہوئی ہو گی۔ کیسے کیسے عقیدوں کے تحت قربانی کے منظر انہوں نے دیکھے ہوں گے۔ یہ بات طے تھی کہ انبیائے کرام کا ہمیشہ غاروں سے گہرا تعلق رہا تھا۔ اور بیت الجبل کے لوگ! وہ عمر سے بے نیاز تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ اور عمر ظاہر کرتی تھیں اور چہرے کچھ اور کہتے تھے۔ لگتا تھا‘ وقت ان پر کم ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ پہلی بار یوسف یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اس کی دمپل میں پیش کی گئی تھیوری حقیقی تو نہیں۔ وہ ذہین تھا‘ تعلیم یافتہ تھا‘ ضعیف الاعتقاد نہیں تھا لیکن اس میں ایک کمی تھی‘ اس کے پاس مذہب کی بنیاد نہیں تھی‘ جس پر مثبت سوچوں کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہاں آ کر اسے عاجزی کا احساس ہونے لگا تھا۔ پہلی بار وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوا تھا۔ پارٹی کے تمام لوگ اپنے اپنے مذہب سے پوری طرح وابستہ تھے‘ اس کے متعلق جانتے تھے۔ ان کا مذہب ان میں جذباتی ابال پیدا کرتا تھا‘ ان کی سوچوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ سوائے اس کے.......... یا پھر راحیلہ کے اور اتفاق سے دونوں مسلمان تھے۔ یہی نہیں‘ دونوں کے درمیان کئی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں موت سے ڈرتے تھے۔ دونوں کا مسئلہ عدم تحفظ تھا‘ اسی کی وجہ سے عقیدے کے اعتبار سے دونوں چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گئے تھے۔ یوسف کا جب جی چاہتا‘ وہ جوزف بن جاتا بلکہ اب تو وہ مستقل طور پر جوزف ڈیوڈسن بنے رہنے پر مجبور تھا اور اب اسے ایسا لگتا تھا کہ وطن اور مذہب کی موجودگی کے باوجود ایک بے شناخت آدمی ہے‘ اس کی شخصیت کی

کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی۔ وہ جیسے گوشت پوست کا زندہ آدمی ہونے کے باوجود ایک وہم تھا۔ دوسری طرف راحیلہ تھی، جس نے اپنی انہی کمزوریوں کی وجہ سے اپنی شخصیت کا ہر پہلو ترک کر کے جینا میلکم کی بھتیجی بننا قبول کر لیا تھا.......... اور جینا میلکم کرچن تھی۔

یوسف ایسا بے یقین آدمی تھا، جو معجزوں کا قائل نہیں تھا لیکن کوئی بھی معجزہ نما واقعہ اندر سے اس کی بنیادیں ہلا دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس عقیدہ نہیں تھا۔ وہ دین کی رسی کو تھامے ہوئے نہیں تھا اور اب یہ کمزوری اس پر عیاں ہو گئی تھی۔ اس سے اگر کسی آسیب زدہ مکان میں رات گزارنے کو کہا جاتا اور بھاری انعام مقرر کیا جاتا تو وہ بلا جھجک اس مکان میں رات گزار لیتا لیکن کوئی واقعہ پیش نہ آنے کے باوجود وہ صبح پورے یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مذہبی کتابیں پراسرار تھیں لیکن انہوں نے جدید سائنس کی رہنمائی کی تھی مثلاً حضرت موسیٰؑ نے زمین پر عصا مارا تھا اور پانی کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ یہ ایک سائنٹیفک بات تھی۔ اس کی پیروی کر کے جدید دور کے انسان نے بھی چٹانوں سے پانی نکال لیا تھا۔ اس کا ذہن سائنٹیفک توجیہات سمجھتا تھا.......... بہتر طور پر سمجھتا تھا لیکن معجزوں کا امکان پھر بھی باقی رہتا تھا۔ اس کے مزاج میں شک بہت تھا.......... یا یوں کہئے کہ بے یقینی تھی۔

اب وہ جینا کے حکم کی تعمیل کے لئے نکلا تھا۔ اس لمحے سے پہلے تک اسے جوہر حیات کی موجودگی پر سرے سے یقین ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے قبیلے کے سربراہ بارزی لئی سے گھنٹوں تنہائی میں گفتگو کی ہے مگر اسے پھر بھی جوہر حیات کی موجودگی پر یقین نہیں آیا تھا، وہ یہی سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی کوئی پیچیدہ کھیل کھیل رہا ہے۔ اسے یقین تھا.......... یا بے یقینی تھی کہ اس دوڑ بھاگ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

لیکن جب جینا نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے لئے جوہر حیات حاصل کرے تو ایک لمحے میں اس کا رویہ بدل گیا۔ اب تک وہ یہ سوچتا تھا کہ اس مہم کے دوران اخراجات کی شق کے زور پر عیش سے زندگی گزارتا رہے گا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لاٹری کھلنے والی ہے۔

اس خیال نے اسے چکرا دیا کہ وہ بے اندازہ دولت کا مالک بننے والا ہے۔ بس اسے ڈاکٹر لیوی کی ناکامی کو کامیابی میں بدلنا تھا۔

○-----○-----○

بڑوں کے مکان کی طرف جانے والے راستے پر چلتے ہوئے یوسف ایک چمڑے لے کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گزرا۔ کچھ آگے جانے کے بعد اسے کسی چیز نے بری ح چونکایا، جو اس نے وہاں دیکھی تھی اور جیسے اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھی۔ وہ ں چل دیا۔

دکان کا رخ گلی کی طرف تھا۔ وہ چھوٹی سی دکان تھی۔ چمڑے والا دکان کے بیچوں یٹھا بکری کی کھال کے اندرونی حصے پر رہ جانے والے گوشت کے ریزوں کو صاف کر رہا اس کے ہاتھ پاؤں کمزور تھے لیکن کام کرتے ہوئے کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہو رہا وہ بڈھا تھا۔ کتنا بڈھا؟ اس کا اندازہ لگانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کے سر پر بالکل نہیں تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ منہ پوپلا تھا لیکن آنکھیں.......... ان سے وہ ہ سے زیادہ ادھیڑ عمر لگتا تھا۔ وہ صاف چمکیلی آنکھیں تھیں.......... زندگی کی چمک سے ر۔ اس کی عمر ۹۰ سال بھی ہو سکتی تھی اور ۱۰۰ سال سے زائد بھی۔

لیکن یوسف کی دلچسپی کا سبب کھرچنے والا وہ اوزار تھا جسے وہ استعمال کر رہا تھا۔

یوسف اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ جفت ساز نے ہاتھ روک دیا اور اپنی چمکیلی ں سے اسے تکنے لگا۔ یوسف نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کے اوزار کی طرف ہ کیا۔ جفت ساز اس کی بات سمجھ گیا، اس نے اپنا اوزار اسے دے دیا۔ یوسف نے ر کا جائزہ لیا۔ وہ چقماق پتھر سے بنایا گیا تھا۔ جہاں پتھر کو چھیل کر دھار دار بنایا گیا تھا، ے وہ اوزار چکنا ہو رہا تھا۔

یوسف نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو بلیڈ والا چاقو نکالا۔ بڑا بلیڈ کھول کر اس ہاتو جفت ساز کو دکھایا۔ جفت ساز مسکرایا اور اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ پھر اس نفی میں سر ہلایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے انداز میں احساس برتری عیاں تھا۔ تاہم نے یوسف کے ہاتھ سے چاقو لے کر اسے کھال پر آزمایا۔ پھر اس نے یوسف کو کھال ا۔ جہاں چاقو استعمال کیا تھا، وہاں کھال میں کئی چھوٹے چھوٹے کٹ لگ گئے تھے۔ کہ پتھر کے اوزار سے کھال بڑی صفائی سے کھرچی جا رہی تھی۔ جفت ساز نے یوسف ں کا چاقو واپس کر دیا اور پتھر کا سوا اٹھا کر کھال میں نفاست سے ایک سوراخ کیا اور ا کو لٹکا دیا، پھر اس نے دوسری کھال اٹھالی۔

یوسف وہاں سے چل دیا۔ وہ جفت ساز کی عمر کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کیا ہو ں کی عمر؟ نوے سال؟ سو سال؟ سو.......... یا ہزار؟ لگتی تو یہ دیوانگی ہی ہے لیکن

کون جانے کہ وہ کبھی ثمر حیات کا مستحق قرار پایا ہو۔ یہ بات تو کھولی ہی نہیں جاتی تھی ثمر حیات کسے دیا گیا ہے۔

یوسف نے سر جھٹکا اور خود کو دیوانگی سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ بڈھا جفت زیادہ سے زیادہ سو سال کا رہا ہو گا۔ اب وہ دوسرے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ بڈھے نزدیک چاقو کھال صاف کرنے کے لئے مناسب اوزار ہوتا تو جفت ساز اس کی افاد تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا لیکن ایسا اوزار یوسف کے پاس موجود نہیں تھا۔

یہاں کے لوگ بہت پرانی نسل کے تھے۔ انسانی نسل کے زمین پر آغاز کے وقت کے۔ اگر وہ اس جدید دور میں قدیم اور متروک اوزار استعمال کر رہے تھے تو یقینی طور وہاں قدیم نسخے بھی اب تک موجود ہوں گے۔ یہ بات بعید از فہم نہیں تھی کہ طویل زند کے حصول کا قدیم ترین راز بھی ان کے پاس موجود ہے۔

یوسف گاؤں کے وسط میں پہنچا۔ یہاں گلی اچھی خاصی سڑک جتنی چوڑی ہو تھی۔ وہ ایک مربع شکل کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کے بڑو اجلاس یہیں ہوتا ہے۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں لیکن دروازے اور واحد کھڑکی بھاری پردے پڑے تھے۔

یوسف کو اپنی بے بسی اور لاعلمی پر غصہ آنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس موقع اسے کیا کرنا چاہئے۔ آواز دے۔ اندر چلا جائے۔ جوتے اتارے یا نہیں۔ اسے ڈر تھا نادانستگی میں بستی کے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کر کے ابتدا ہی میں انہیں نارا نہ کر دے۔ گاؤں میں داخلے کے وقت ڈاکٹر لیوی نے اس سے کہا تھا کہ ”تم کچھ بھی کر ان لوگوں سے ہمیشہ مہربانی سے پیش آنا۔ یہ عزت کا خیال رکھنے والے، خود پر فخر کر والے لوگ ہیں۔ تمہارے رویے میں ان کے لئے بدتمیزی کبھی نہ ہو۔“ لیکن اس نے نہیں بتایا تھا کہ کون سی حرکتیں بدتمیزی کے زمرے میں آتی ہیں۔

انہیں اس کی آمد کا علم ہو گیا تھا کیونکہ دروازے کا پردہ ہٹا اور بارزی لئی نمود ہوا۔ وہ قد میں یوسف سے بڑا تھا۔ اس کے بال کندھوں تک آتے تھے۔ بڑی بار شخصیت تھی اس کی۔ اس کے سر کے بیشتر بال سیاہ تھے۔ کہیں کہیں سفیدی جھلک دکھا تھی۔ خوبرو چہرے پر جلد پوری طرح تنی ہوئی تھی۔ صرف آنکھوں کے نیچے چند لکیر نظر آ رہی تھیں۔ دیکھنے میں وہ ساٹھ سال سے زیادہ کا ہرگز نہیں لگتا تھا۔

یوسف نے فیصلہ کیا کہ طور طریقے ہر جگہ ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اس نے ہا

یشانی تک لے جا کر اسے سلام کیا، پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بارزی لئی نے اس کا ھ تھام لیا۔ اس کی گرفت میں دوستانہ گرمجوشی تھی۔ یوسف کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے شارے سے بتایا کہ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ بارزی لئی نے فوراً سر کو ہلکا سا خم لیا، پردے کو ایک طرف ہٹایا اور یوسف کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ایک بہت بڑا کمرا تھا۔ ایک نیچی اور لمبی میز کے سوا وہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ لکے کے علاوہ وہاں پانچ افراد اور تھے۔ کچھ آلتی پالتی مارے اور کچھ دوزانو بیٹھے تھے۔ ان ں سے کچھ تو بہت ہی بوڑھے تھے۔ بہت ہی زیادہ بوڑھے، ان کے چہروں پر جھریاں یں۔ ہڈیوں پر جیسے کھال منڈھی ہوئی تھی لیکن سب کی آنکھیں بے حد صاف اور چمک ر تھیں۔ ان میں کوئی دھندلاہٹ نہیں تھی۔

یوسف کے اندر داخل ہونے پر وہ سب اٹھے اور انہوں نے تعظیماً سر خم کئے۔ سف نے بھی جواباً سر خم کیا اور مسکرایا۔ اس نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ املکے نے تالی بجائی۔ ایک جوان لڑکا ہاتھوں میں ایک ٹرے لیے ودار ہوا۔ ٹرے پر چاندی کی عجیب شکل کی پیالیاں تھیں، جن میں تلخ کافی تھی۔ وہ لیاں بھی صدیوں پرانی معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ سب بیٹھ کر کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ فضا بے حد دوستانہ ں اور وہ خاموشی یوسف کو بے حد خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ یوں اسے سوچنے اور صلہ مجتمع کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔ اس دوران وہ اس امر پر غور کرتا رہا کہ زبان کی کاوٹ کو کس طرح دور کیا جائے اور اپنی بات ان لوگوں تک کیسے پہنچائی جائے۔ خر اسے ایک طریقہ سوجھ گیا۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سب کو سگریٹ کی آفر کی۔ سب نے ریٹ قبول کی۔ سگریٹیں سلگائی گئیں۔ وہ سگریٹ کو عجیب انداز میں پکڑے ہوئے تھے۔ نا انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ سرور وس کر رہے ہیں۔ یوسف نے فیصلہ کیا کہ تجربے کا وقت آ پہنچا ہے۔

وہ نوٹ پیڈ اور پنسل اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈرائنگ اس کی اچھی خاصی تھی۔ اس نے نوٹ پیڈ نکالا اور پنسل سنبھال لی۔ ساتوں بزرگ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ رے میں خاموشی تھی۔ یوسف کو یہ تشویش ہوئی کہ وہ لوگ ہندسوں کو سمجھ سکیں گے یا ں۔ وہ جانتا تھا کہ مغربی ہندسوں کی شکل عربی سسٹم ہی کی مرہون منت ہے لیکن یہاں کا

سسٹم......... اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا......... بہرحال کوشش تو کی جا سکتی تھی۔

اس نے اپنی انگلی سینے پر رکھی......... انہیں جتا کر اور پھر پیڈ پر عدد ۳۶ لکھا بارزی لئی کی طرف بڑھا دیا۔ بارزی لئی نے وہ املکے کو دکھایا' دونوں نے سروں کو تفہ جنبش دی اور مسکرائے۔

یوسف نے چہرے پر سوالیہ تاثر ابھارتے ہوئے اس بار بارزی لئی کی طرف اشا کیا اور پیڈ اور پنسل اس کی طرف بڑھا دی۔ بارزی لئی نے بغیر ہچکچائے پیڈ لے لیا اس پر کچھ لکھ کر پیڈ یوسف کو واپس کر دیا۔

یوسف نے کاغذ کو دیکھا' وہاں ۲۳۹ لکھا تھا۔ یوسف کو شدید مایوسی ہوئی' یہ طے کہ وہ اپنی بات انہیں نہیں سمجھا سکا تھا۔ یا پھر ان کے ہاں ہندسوں اور اعداد کا سسٹم مختل ہو گا۔ کیونکہ بارزی لئی کا لکھا ہوا عدد مہمل معلوم ہو رہا تھا۔

پھر اچانک اسے شاک لگا......... ایسا کہ وہ اندر سے ہل کر رہ گیا۔ اسے یہ خیا آیا کہ وہ کس سرزمین پر ہے۔ یہ کون سا گاؤں ہے اور وہ لوگ یہاں کس امید پر آ ہیں۔ اس پر اس بری طرح ہیجان طاری ہوا کہ اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ یہ ناممکن نہیں کہ بارزی لئی نے اس کی بات سمجھ لی ہو......... بلکہ یہ عدد اس کے سوال کا جوا ہو۔ اس کی تصدیق بہت ضروری تھی لیکن پڑتال کیسے کی جائے.........

اس نے کافی لانے والے لڑکے کی طرف اشارہ کیا' جو پیالیوں میں دوسری بار کا انڈیل رہا تھا۔ بارزی لئی نے مسکراتے ہوئے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے یوسف ہاتھ سے پیڈ لے کر اس پر ۱۴ لکھ دیا۔

یوسف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

لیکن بارزی لئی نے پنسل اور پیڈ ابھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے املکے کی طرف اشارہ کیا' جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور پیڈ پر ۳۳۰ لکھا۔ پھر وہ اپنے بائیں ہا پر بیٹھے ہوئے بڈھے کی طرف متوجہ ہوا' جو ان سب سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بارزی لئی نے پیڈ پر ۴۱۰ لکھا۔

یوسف کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا لیکن یہ کیفیت شاک کی وجہ سے نہیں تھی اس کے دماغ میں اس لمحے بے شمار مساوات چکرا رہی تھیں۔ یہ شبہ کرنے کا کوئی جوا نہیں تھا کہ بارزی لئی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو ذہن میں جینا سے اپنے معاہدے کے مطابق اعداد و شمار کا حساب لگا رہا تھا۔ اگر ان لوگوں نے کسی اور طریقے سے قد

ہر حیات کو محفوظ کر لیا تھا اور وہ جوہر حیات اگر جینا میلکم کو مل جائے تو......... جب جینا سال کی ہو گی تو وہ پچاس سال کا ہو گا اور لکھ پتی بن چکا ہو گا اور مزید دس سال

....

اس کا سر چکراتا رہا' وہ حساب کتاب اس کے بس سے باہر تھا۔

اس نے دوبارہ سب کو سگریٹ پیش کی اور اپنے منتشر اعصاب کو سکون دینے کے خود بھی ایک سگریٹ سلگائی' پھر اس نے پیڈ اور پنسل واپس لی۔ پیڈ کا اوپر والا ورق ڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ اب اس نے نئی شیٹ پر اسکیچ ڈرائنگ شروع کی۔ قابل شناخت ٹون بنانے میں اسے خاصی مہارت تھی۔

وہ اسکیچ کی سیریز کے ذریعے اپنی کہانی بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا!

اس نے ایک درخت بنایا' جس کے تنے کے بیچوں بیچ ایک دل دھڑک رہا تھا۔ شاخ تھی' جس کے گرد ہالہ تھا' اس سے پھل لٹک رہے تھے۔ اس شاخ کے نیچے زی لئی کھڑا تھا۔ اس کے سامنے جینا میلکم دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی' اس کے ے پر التجا کا تاثر تھا' آنکھوں میں اپیل تھی۔

وہ جینا میلکم کی جوہر حیات کے حصول کی خواہش کی عکاسی تھی!

جینا کی دولت' اس کی قوت اور اہمیت کا احساس دلانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اگلے چ میں اس نے جینا میلکم کو گلوب کے اوپر بادلوں کے تخت پر بیٹھے دکھایا۔ اردگرد بحری ز تھے' ریلیں تھیں۔ طیارے تھے' فیکٹریاں تھیں۔ لہلہاتے کھیت' کانیں' جنگل اور نہ نے کیا کیا تھا۔ وہ سب کچھ ڈوریوں سے بندھا ہوا تھا......... اور ہر ڈوری کا سرا جینا کے میں تھا۔ اس کے سر سے منحنی ریڈیائی لکیریں نکل کر پورے گلوب کا احاطہ کر رہی ں۔

اگلے اسکیچ میں یوسف نے خود کو پیش کیا......... وہ کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر جینا م تھی' جس کا داہنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تھا' جو ناقابل شکست اعتبار و اعتماد کی ست تھا۔ یہ انداز منہ سے بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا......... یہ شخص میرا نمائندہ ہے اور ر نہایت قابل اعتماد دوست بھی ہے۔

پھر اس نے جینا کو بیت الجبل کی اپنی قیام گاہ میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا پیش کیا۔ اس چہرے پر تشویش کا تاثر تھا۔ وہ طویل انتظار سے تھک چکی تھی اور اپنی تشنہ تکمیل ہش کے ہاتھوں اذیت اٹھا رہی تھی۔ اس کے سر میں کئی چھوٹے چھوٹے تیر پیوست

دکھائے گئے تھے، جو اس کی ذہنی اذیت کی عکاسی کر رہے تھے۔

یوسف اپنی اس گونگی کارکردگی پر بہت خوش تھا اور اسے لطف بھی آ رہا تھا۔

اسکیچ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ تک پہنچ رہے تھے۔ یہ طے تھا کہ اس کی ترکیب کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ لوگ ان پر گفتگو اور تبصرے بھی کر رہے تھے۔ یوسف خود کو ایسا جادوگر محسوس کر رہا تھا جس نے پہلے ہی ایکٹ میں ناظرین کو مسحور کر دیا ہو۔ وہ کہنا چاہتا تھا "ہم سب دوست ہیں.......... اور اب جب کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ بھی رہے ہیں تو میں کام کی بات کی طرف.........."

لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اس نے بارزی لئی کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ آخری اسکیچ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس آخری اسکیچ میں، جو اس کے ہاتھ میں تھا، یوسف نے بارزی لئی کو دکھایا تھا۔ ثمرحیات اس نے داہنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے مقابل اس نے جینا کو بنایا۔ جینا کے داہنے ہاتھ میں رقم کی تھیلی تھی۔ تھیلی پر اس نے سکوں کا اسکیچ بنایا جو کہ دولت کی علامت تھے۔

"کچھ سمجھے؟" یوسف نے پوچھا۔

کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس ملاقات میں وہ پہلے لفظ تھے، جنہیں آواز کا پیراہن ملا تھا۔ ورنہ اب تک تو جیسے کوئی خاموش فلم چل رہی تھی۔

وہ سب اسے گھور رہے تھے۔ اس نے آخری اسکیچ سب کے ملاحظے کے لئے فرش پر پھیلا دیا۔ پھر اس نے آہستگی سے، ڈرامائی انداز میں دولت کی تھیلی پر ایک ایک کر کے ہندسے بنائے اور ان کے ساتھ ڈالر کا نشان بنا دیا.......... ۵۰۰۰۰ ڈالر!

اس نے سوچا، حماقت اور جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ جینا کا مزاج جانتا تھا۔ مطلوبہ چیز جتنی سستی ملے گی، جینا کو اتنی ہی زیادہ خوشی ہو گی۔ اتنا ہی وہ اس سے خوش ہو گی.......... اس پر مہربان ہو گی۔ ممکن ہے، خوش ہو کر وہ اسے پانچ سال کے آزمائشی عرصے کے بیعانے کے طور پر بھی کوئی بھاری رقم دے دے۔ جب نیلام کی بولی کی کوئی حد نہ ہو تو بولی نیچے سے شروع کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

کوئی ردعمل نظر نہ آیا تو اس نے سوچا، شاید بولی بہت نیچے سے شروع کر دی ہے میں نے۔ وہ سب سر جھکائے اسکیچ کو دیکھتے رہے۔ دو کے درمیان نظروں کا تبادلہ بھی ہوا لیکن کہا کسی نے کچھ نہیں۔ بہرحال یہ بھی کم نہیں تھا کہ اس نے ان کی توجہ گنوائی نہیں تھی۔

اس نے جیب سے ربر نکالا اور پچاس ہزار ڈالر مٹا کر اس کی جگہ ایک لاکھ لکھ دیا۔

"دگنا۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اس کی بات سمجھ لیں گے۔

ان کی نظروں میں اب بھی خالی پن تھا۔ خاموشی بہت گمبھیر ہو گئی تھی۔

"بہت خوب! یہ بھی کم ہے۔" یوسف نے کہا۔ "چلو اسے بھی دگنا کر دو۔"

اس بار بھی کوئی ردعمل نہیں تھا۔ اب یوسف کو غصہ آنے لگا۔ "ٹھیک ہے، نہ سہی، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے تھیلی کے خاکے پر پانچ لاکھ کی رقم لکھ دی۔ "اب تو خوش ہو؟"

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں، بت بنے بیٹھے ہیں۔ کچھ تو کریں۔ چلو.......... اپنا کیا جاتا ہے۔

ویسے اسے اندازہ تو تھا کہ بولی بہت اونچی جائے گی۔ شاید جینا کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے ربر سے تھیلی پر ڈالر کا نشان مٹا دیا.......... تاکہ زیادہ ہندسوں کی گنجائش بن جائے۔ پھر اس نے بارزی لئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "چلو.......... اب مسخرہ پن ختم۔ بزنس ہو جائے اب۔ جہاں چاہو، مجھے روک دینا۔ بڑی بی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے رقم کو دس لاکھ کر دیا۔

پہلی بار موہوم سا ردعمل سامنے آیا۔ بارزی لئی کے ہونٹوں پر خفیف سی سکراہٹ نظر آئی۔ اس کے اور املکے کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ یوسف نے ایک کو ٹا کر دو لکھ دیا.......... "دیکھو یہ بہت زیادہ معقول قیمت ہے۔" ساتھ ہی اس نے لیکچر ینے والے انداز میں کہا۔ "بیس لاکھ کم نہیں ہوتے۔ اتنے میں تو پوری بستی کی تقدیر بل سکتی ہے۔"

وہ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے لیکن یوسف اندازہ نہیں لگا سکا کہ گفتگو کس نہج پر ہو رہی ہے۔

اچانک اسے اس احساس نے ڈنک چبھویا کہ اس خرید و فروخت میں اس کا کیا کچھ اؤ پر لگا ہے۔ اس کے اعصاب ہل کر رہ گئے۔ ساتھ ہی اسے غصہ بھی آیا۔ جینا نے کہا تھا.......... ہر قیمت پر۔ اور وہ دولت جینا کی تھی۔ وہ بچانے کی فکر کیوں کر رہا ہے۔

اس نے کاغذ پر دو مٹا کر اس کی جگہ پانچ لکھ دیا۔ پچاس لاکھ۔

اب ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ بارزی لئی نے اسے بے حد خوبصورت مسکراہٹ ے نوازا۔ وہ مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے۔ اس نے یوسف کا

سیدھا.......... پنسل والا ہاتھ تھام لیا' جیسے کہہ رہا ہو کہ اب مزید کچھ لکھنے کی ضرور نہیں پھر اس نے آہستہ سے نفی میں سرہلایا۔

یوسف نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور پھنکار کر بولا۔ "مجھے تمہاری ہمدردی ضرورت نہیں۔ میں رقم لکھ رہا ہوں۔ تم صرف یہ بتا دو کہ تمہیں رقم کب چاہیئے اور ثمرحیات کب دو گے؟" وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس کی بات نہیں سمجھ رہے ہیں۔

لیکن ایک کروڑ پر پہنچ کر اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ پہلے تو اس کے اند ایک عجیب سا سناٹا تیر گیا۔ سارے لفظ جیسے مر گئے۔ دیر تک وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ پھر وہ اچھل کر اٹھا اور ان پر برس پڑا۔ اسے خود پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا "احمقو.......... کیا تم دولت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے؟ پتا بھی ہے ایک کروڑ کتنا ہوتا ہے اور تم چاہتے کیا ہو.......... دو کروڑ.......... ڈھائی کروڑ.......... دس کروڑ؟ تم جو بھی ما گے' وہ دے گی' اور کیش دے گی اور تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں پاگ نہیں ہوں۔ تمہارے گاؤں کا نقشہ بدل سکتا ہے اس دولت سے۔ تمہاری کایا پلٹ جائے گی۔ اس جفت ساز کو پتھر کے اوزاروں کی جگہ پلاٹینم کے اوزار بھی مل سکتے ہیں۔ سب کو ٹیلی وژن مل جائیں گے.......... ریفریجریٹر مل جائیں گے۔ گھر گھر آسائشیں ہوں اور ہر گھر کی جگہ ایک محل ہو گا۔ تم ڈھنگ کے کپڑے پہنو گے۔ پوری دنیا دیکھ سکو گے بے وقوفو.......... میں تمہیں سچ مچ کی دولت کی پیشکش کر رہا ہوں۔ ارے احمقو.......... تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔ سن رہے ہو میر بات..........؟"

اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ حلق کے بل چیخ رہا ہے.......... پاگلوں کی طرح اس کی آنکھوں سے فرسٹریشن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ا کے منہ سے کف اڑ رہا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔

پھر اس نے دیکھا' وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بارزی لئی نے اس کا ہاتھ پکڑا وہ جان گیا کہ کھیل ختم ہوا اور وہ ہار چکا ہے۔ عین اس وقت جب وہ کروڑ پتی بننے صرف ایک لفظ کے فاصلے پر تھا.......... یس!

اس نے بارزی لئی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی نیم کامیاب کوشش کی "ٹھیک ہے باس۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہار گیا ہوں۔ مجھے دھکے دے کر نکالنے ضرورت نہیں' میں خود چلا جاؤں گا۔"

بارزی لئی اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے آیا۔ یوسف نے بارزی لئی کو غور سے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ بارزی لئی کے چہرے پر برہمی کا تاثر نہیں تھا' اس کے برعکس اس کے چہرے پر ہمدردی تھی اور وہ اسے مہربان نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

بارزی لئی نے یوسف سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے کئی بار اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپایا' اس کے بعد آخری تھپکی دے کر نرمی سے اس کا رخ گلی کی طرف کر دیا' جیسے واپس جانے کا مشورہ دے رہا ہو۔

یوسف نے خود سے کہا' "واہ بھئی یوسف! تم بھی ہو بڑی شے.......... اس بڈھے کو بھی احساس ہے کہ تم ایک ناکام آدمی ہو اور اسے بھی تم پر ترس آ رہا ہے۔ یہ بتاؤ میاں' اب جینا میلکم کو کیا جواب دو گے؟"

وہ اس لٹے ہوئے جواری کی طرح واپس چل دیا جسے یقین ہو کہ وہ کروڑوں کا جیتا ہوا داؤ محض اس لئے ہار گیا ہے کہ اس کے پاس داؤ کھیلنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ جب کہ اس کے پاس اکوں کی ٹریل تھی۔

○-----○-----○

اس روز آدھی رات کے بعد بستی کے بڑوں کا ایک پیغامبر وہاں آیا' جہاں مہمان مرد مقیم تھے۔ بین آئزک سو چکا تھا۔ ڈاکٹر لیوی غار سے لائے ہوئے پتھروں کا باریک بینی سے معائنہ کر رہا تھا۔ یوسف بظاہر مطالعہ کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں تک کتاب پر نہیں تھیں۔ وہ اپنی شام کی ناکامی پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جینا کو کیا جواب دیا جائے۔

ڈاکٹر لیوی نے اسے چونکا دیا۔ "ضرور کچھ ہوا ہے۔" اس نے پیغامبر کو رخصت کرنے کے بعد کہا۔ "بڑوں کی ایک میٹنگ ہوئی ہے' جس میں ایک اہم فیصلہ کیا گیا ہے۔ بڑوں کی کونسل نے مس میلکم سمیت ہم سب کو فوری طور پر طلب کیا ہے۔"

یوسف اچھل پڑا۔ "کیا.......... کیا مطلب؟"

"تم جا کر مس میلکم کو جگاؤ۔ ویسے روشنی تو نظر آ رہی ہے' ممکن ہے وہ جاگ رہی ہو۔"

"چکر کیا ہے؟ کیا وہ مان گئے ہیں؟ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے؟"

"معلوم نہیں۔" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا اور اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "مجھے لگتا ہے' آج جو تم ان سے ملنے گئے تھے تو تم نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہوا۔ لہٰذا میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہو گا۔ بہرحال

جو کچھ بھی ہوا' اس کے ذمے دار تم ہو گے۔ ممکن ہے' اس بلادے کا مقصد ہمیں گاؤں سے نکل جانے کا حکم دینا ہو۔ بہرصورت ہمیں فوری طور پر ملاقات کے لئے جانا ہے..........."

یوسف نے جیکٹ پہنی' سر پر ٹوپی رکھی کیونکہ سردی اچھی خاصی ہو رہی تھی' پھر وہ جینا کی اقامت گاہ کی طرف گیا۔ "مس میلکم!" اس نے پکارا۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

"میں جوزف ہوں۔ آپ جاگ رہی ہیں؟"

"ہاں۔ کیا بات ہے؟"

"بڑوں کی کونسل نے فوری طور پر ہم سب کو طلب کیا ہے۔"

"اوہ.......... میں ابھی تیار ہوتی ہوں۔" جینا کے لہجے میں بے تابی تھی۔

یوسف کو ایک لمحے کو خیال آیا کہ جینا کو ڈاکٹر لیوی کے خدشوں سے آگاہ کر دے۔ یہ کہ ممکن ہے' انہیں گاؤں سے نکلنے کا حکم دیا جائے اور وہ شام کو اپنی کوشش میں ناکامی کا احوال بھی سنا ڈالے لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ ویسے بھی وہ آخری لمحے تک لڑنے کا قائل تھا۔ حقیقت اگر جینا کو چند منٹ بعد معلوم ہو جائے گی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن چند منٹ پہلے معلوم ہو جانا تباہ کن بھی ہو سکتا تھا اور پھر کون جانے' حقیقت کیا ہو۔ بعض اوقات صورت حال بہت خراب نظر آتی ہے لیکن نتائج برعکس ہوتے ہیں۔

چند منٹ بعد جینا میلکم' راحیلہ کے ساتھ باہر آئی۔ جینا نے گرم' سیاہ شال بدن پر لپیٹی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بین آئزک اور ڈاکٹر لیوی بھی تیار ہو کر آ گئے۔ بین آئزک سو کر اٹھا تھا اور لگتا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ہے۔

گاؤں کی گلیاں آدھے چاند کی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ کوہ ہرمن کی برف پوش چوٹی سے منعکس ہونے والی چاندنی بے حد روشن تھی.......... اتنی کہ منہ کھولے ہوئے تاریک غار بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ کونسل ہاؤس کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ پردہ ہٹا کر پیغامبر باہر آیا اور اس نے انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پانچوں اندر چلے گئے۔

یوسف نے ایک نظر میں دیکھ لیا' اندر وہی لوگ تھے جنہیں اس نے شام کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی وہ سب

پیشوائی کو اٹھ کھڑے ہوئے.......... بارزی لئی نے اپنی زبان میں جینا میلکم سے خطاب کیا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے فوراً بتاؤ۔" جینا میلکم نے ڈاکٹر لیوی سے کہا۔

یوسف نے بین آئزک سے کہا۔ "تمہارے کچھ پلے پڑ رہا ہے؟"

"نہیں' لیکن میرا خیال ہے' تم نے کھیل تباہ کر دیا ہے۔" بین آئزک نے جواب دیا۔

بارزی لئی بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر ڈاکٹر لیوی نے جینا کے سوال کا جواب دیا۔ "یہ لوگ آپ کے لئے دعاگو ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی یہاں آمد ان کے لئے سرفرازی کا باعث ہے۔" وہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "میں آپ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ لیکن مس میلکم' کچھ بھی ہو' میری التجا ہے کہ آپ صبروتحمل سے کام لیں۔"

راحیلہ نے یوسف کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"یہ ڈر کہ یہ لوگ مس میلکم کو ثمرحیات نہیں دیں گے؟"

"نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مس میلکم کو ثمرحیات دینے والے ہیں۔" راحیلہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

مردوں نے بستی کے بڑوں سے ہاتھ ملائے اور بیٹھ گئے۔ کافی کا دور خاموشی کا دور تھا۔ یوسف کو جینا کے اعصاب چٹختے محسوس ہو رہے تھے۔ یوسف نے خود کو دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی جواز نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تواضع اور خوش اخلاقی تو مشرق کی اور خصوصاً عربوں کی مہمان نوازی کا حصہ ہے۔ وہ اس کے بعد بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے انہیں گاؤں سے نکل جانے کا حکم سنا سکتے تھے۔

اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لئے کوئی مصروفیت تلاش کرنا ضروری تھا۔ یوسف نے بارزی لئی اور املکے کے چہروں پر نظریں جما دیں۔ آخر ان لوگوں کا اپنی عمر سے اتنا.......... اتنا زیادہ چھوٹا نظر آنے کا راز کیا ہے؟ وہاں روشنی کے لئے جو چراغ استعمال ہو رہے تھے وہ تیل سے بھری بڑی طشتریوں میں روئی کی بتیاں جلائی گئی تھیں' اس روشنی میں ان کے چہروں کو دیکھ کر یوسف کو احساس ہوا کہ کسی مقام پر ان کی عمریں ٹھہر گئی ہوں گی۔ اس کے بعد وقت ان پر اب تک اثرانداز نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات پر یقین ہو گیا اور یہ کیسے ہوا.......... وہ سوچتا رہا۔

کافی کا دور ختم ہوا تو بارزی لئی اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بہت سے بیٹھے ہوئے لوگوں

میں اس کا قد اور بڑا لگ رہا تھا۔ اس لمحے ایسی خاموشی تھی کہ یوسف کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

بارزی لئی نے کسی جادوگر کے انداز میں اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک نیلگوں برتن برآمد کیا۔ برتن گول تھا۔ اس کا قطر کوئی چار پانچ انچ ہو گا۔ اس پر ڈھکنا بھی تھا۔ کمرے میں جینا کی گہری سانس کی آواز گونجی اور وہ آگے کی طرف جھکی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ بے اختیار ہونے والی ہے۔ لگتا تھا' وہ برتن پر جھپٹے گی' اس کا ڈھکنا ہٹائے گی اور اندر موجود شے کو مٹھی بھر کر پھانک جائے گی۔ یوسف نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا........ یہ جتانے کے لئے کہ خود پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جینا کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے ڈاکٹر لیوی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

راحیلہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر جا جما تھا۔ بین آئزک آگے جھکا اور اس نے سرگوشی میں راحیلہ سے کچھ کہا۔

بارزی لئی نے ڈاکٹر لیوی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر لیوی اٹھا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ بارزی لئی نے اپنی زبان میں بہت آہستگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ خطاب کا آغاز کیا۔ اس کا لہجہ بہت جاندار تھا۔ خطاب کافی طویل تھا۔ یوسف اس دوران اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات' لہجے کے زیروبم اور اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

خطاب کے دوران بارزی لئی نے کئی بار نظریں جھکا کر جینا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا........ ہمدردی' ترحم! اور ہر ایسے موقع پر اس نے جینا کے چہرے سے نظر ہٹا کر یوسف کو دیکھا تھا۔

ڈاکٹر لیوی' جو بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا' اس کے چہرے پر عجیب ترین تاثرات نظر آ رہے تھے۔ وہ حیران تھا........ ششدر تھا لیکن انداز ایسا تھا' جیسے وہ محظوظ ہو رہا ہو۔ وقتاً فوقتاً وہ بارزی لئی کے چہرے سے نظر ہٹا کر یوسف کو دیکھتا' ایسے میں اس کی نگاہوں میں واضح بے یقینی ہوتی۔

بالآخر بارزی لئی کی تقریر ختم ہوئی۔ اس نے احتراماً ڈاکٹر لیوی کے سامنے سر خم کیا' اس کے اس انداز میں بلا کا وقار تھا۔

جینا کو چند لمحے بعد احساس ہوا کہ بارزی لئی خاموش ہو چکا ہے۔ وہ ڈاکٹر لیوی کی

رف مڑی۔ "جلدی کرو........ مجھے بتاؤ........ کیا کہا ہے اس نے؟" ہیجان کی شدت ے اس کی آواز بدل کر رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر لیوی نے پہلے اسے اور پھر یوسف کو دیکھا' جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو ہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اس نے بارزی لئی کے سامنے سر خم کیا اور بولا۔ بارزی لئی نے کہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں موجود برتن میں ثمر حیات موجود ہے۔ یہ وہ ہل ہے' جو خدا کے حکم سے موت کو دور سے دور تر کر دیتا ہے۔ یہ وہ پھل ہے........"

جینا کی گہری سانس پھنکار سے مشابہ تھی........

"یہ پھل خدا کا تحفہ ہے........" ڈاکٹر لیوی کہہ رہا تھا۔ "یہ جنت سے بھیجا گیا۔ ان کے لئے ہے' جو نیک اور معصوم ہیں' جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ ہر تین سال بعد ں کی فصل بہت تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو نئے چاند کی اتویں رات بستی کے بڑے جمع ہو کر غوروخوض کرتے اور فیصلہ کرتے ہیں کہ اس بار دا کے اس تحفے کا حقدار کون ہے؟ آج یہ لوگ اسی لئے اکٹھے ہوئے ہیں اور........ در یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔"

یوسف سوچ رہا تھا کہ........ بس ایک لفظ کا فاصلہ ہے پھر مجھے پتا چل جائے گا کہ ں اب کروڑ پتی ہوں یا پہلے جیسا قلاش۔

خاموشی میں جینا کی بھاری سرگوشی ابھری۔ "کون ہے وہ خوش نصیب' جس کے ق میں فیصلہ ہوا ہے؟"

ڈاکٹر لیوی چند لمحے گنگ رہا' جیسے لفظوں سے محروم ہو گیا ہو۔ اس نے پہلی بار ارزی لئی کو' بستی کے بڑوں کو' جینا کو اور سب سے آخر میں یوسف کو دیکھا۔ پھر اس نے حتاط انداز میں کہا۔ "یہ لوگ فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ اتنا فاصلہ طے کر کے ان کے گاؤں آئی ہیں۔ یہ بہت قابل قدر بات ہے........ اعزاز ہے ان کے لئے اور یہ کہ آپ اپنے ملک کی بہت اہم اور بزرگ ہستی ہیں۔ آپ کا وہاں بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس آپ کی مدارات کے لئے کچھ بھی نہیں۔ شاید اس نیلے مرتبان میں بند عمر عزیز کے اضافی برس آپ کے اور آپ کے لوگوں کے کسی کام آ سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس بار اس خدائی تحفے کے لئے آپ کو منتخب کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس بار ثمر حیات کی فصل آپ کی ہے۔"

یوسف نے بڑی کوشش سے خود کو نعرہ فتح لگانے سے باز رکھا۔ تاہم دل میں اس نے بڑے زور کا نعرہ لگایا.......... کروڑ پتی یوسف عالم زندہ باد۔ پھر اسے ایک خیال نے چونکا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ ڈاکٹرلیوی نے سب کچھ نہیں بتایا ہے، وہ کچھ چھپا گیا ہے۔

"ماں کو ثمر حیات مل گیا۔ ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔" بین آئزک نے کہا، جیسے سینے پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

جینا لڑکھڑاتے ہوئے اٹھی۔ اس کے اٹھتے ہی بارزی لئی نے بڑے ڈرامائی انداز میں برتن پر سے ڈھکنا ہٹا دیا۔ اوپر چند پتے تھے، نیچے سبزی مائل سیاہ کوئی چیز تھی۔ اس کی تیز مہک سے کمرا بھر گیا۔ وہ رات میں کھلنے والے پھولوں اور صندل کی سی ملی جلی خوشبو تھی۔ بارزی لئی نے پھر کچھ کہا۔ ڈاکٹرلیوی نے اس کی ترجمانی کی۔ "یہ کہہ رہے ہیں کہ بستی کی طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائیں۔ خدا اس ثمر میں چھپے اضافی برسوں کو آپ کے لئے محفوظ رکھے۔"

"میں.......... میں کیا کروں؟" جینا نے پوچھا۔ اس کے لئے بولنا دوبھر ہو رہا تھا۔ "مجھے کیا کہنا چاہئے؟ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ یہ لوگ اس کے عوض مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگ رہے ہیں! میں کیا کروں جواب میں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بس ان کا شکریہ ادا کریں۔ انہوں نے آپ کے لئے بہت بڑا ایثار کیا ہے۔ اس کی قیمت لگانے کی کوشش نہ کیجئے۔ اس سے انہیں تکلیف ہو گی۔ توہین کا احساس ہو گا۔ ان سے کہیں کہ ان کی مہربانی ہے، جو آپ کبھی فراموش نہیں کریں گی اور آپ کو امید ہے کہ وہ اضافی زندگی، جو خدا آپ کو عطا فرمائے گا، نیکی اور دانائی لائے گی اور خدا کے احکامات کے مطابق بسر ہو گی۔ یہ سب کچھ آپ خود کہیں۔ پھر میں آپ کی بات دیانت داری سے ان لوگوں تک پہنچا دوں گا۔"

یوسف دیکھ رہا تھا کہ جینا بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے وہی کچھ لفظ بہ لفظ دہرا دیا، جو ڈاکٹرلیوی نے کہا تھا۔ انداز کسی ہپناٹائز کئے گئے معمول کا سا تھا، جسے علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یوسف کو یہ احساس بھی تھا کہ احساس فتح کے جھٹکے جینا کے ناتواں وجود کو اندر سے جھنجوڑے دے رہے ہیں۔

وہ خاموش ہوئی تو ڈاکٹرلیوی نے وہ سب کچھ بارزی لئی اور بستی کے بڑوں کو منتقل کر دیا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بارزی لئی نے سر خم کیا اور بڑے احترام سے ثمر حیات کا مرتبان جینا میلکم کی طرف بڑھا دیا۔

جینا میلکم نے مرتبان کو مضبوطی سے تھاما اور سینے سے بھینچ لیا۔ پھر اس نے نگاہیں ٹھا کر بارزی لئی کو دیکھا اور بولی۔ "شکریہ.......... بے حد شکریہ۔" پھر وہ ڈاکٹرلیوی کی لرف پلٹی۔ "شکریہ.......... تمہارا بھی شکریہ.......... بس، اب میں جا سکتی ہوں؟"

ڈاکٹرلیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ جینا نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ مرتبان کو ینے سے بھینچے، کمرے سے نکل گئی۔

چند منٹ بعد یوسف، راحیلہ، بین آئزک اور ڈاکٹرلیوی باہر نکلے تو گلی سنسان ی۔ کونسل ہاؤس اور ان کی اقامت گاہ تک کے درمیانی راستے پر جینا کا نام و نشان تک یں تھا۔ حالانکہ وہ تین فرلانگ سے کم ہی فاصلہ ہو گا۔ ہاں اوپر، گاؤں سے باہر جانے والی ھائی کی طرف سے بھاگتے ہوئے قدموں کی دور ہوتی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز ھبراہٹ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ چند لمحے بعد برف پوش چوٹی کے پیش منظر میں جینا کا ولا نظر آیا۔

"بے چاری.......... مضطرب ہستی!" ڈاکٹرلیوی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"انہیں کیا ہو گیا؟" راحیلہ چلائی۔ "کہاں جا رہی ہیں یہ؟"

"انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔" بین آئزک بولا۔ "وہ بھٹک نہ ئیں۔ میں جا کر انہیں واپس لاتا ہوں۔"

بین آئزک نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یوسف غرایا۔ "انہیں ان کے حال پر چھوڑ ۔"

بین آئزک نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ رکنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا لیکن ڈاکٹر ی نے اسے روک لیا۔ "نہیں بین آئزک! انہیں جانے دو۔ مداخلت نقصان دہ ہو گی۔ تم سے اس وقت تک بھاگتی رہیں گی، جب تک مر نہ جائیں۔ وہ ڈر رہی ہیں کہ ہم رحیات میں حصہ نہ مانگ بیٹھیں۔"

یوسف کو پھر احساس فتح نے آدبوچا۔ "میں کامیاب ہو گیا۔" اس نے چیخ کر کہا۔ س میلکم کو ان کا گوہر مقصود مل گیا لیکن ڈاکٹر، تم نے اندر پوری بات سچ نہیں بتائی ا۔ سچ سچ بتاؤ، بارزی لئی کیا کہہ رہا تھا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں مس میلکم کے سامنے حقیقت نہیں بتا سکتا ۔ تم بہت چالاک آدمی ہو دوست۔ نہ جانے کیسے تم نے انہیں یقین دلا دیا کہ جینا میلکم

خود کو ساری دنیا کی ملکہ سمجھتی ہے۔ سمجھتی ہے کہ ہر قوت کی عنان اس کے ہاتھ میں ہے اور طوفان برق باد اس کے دماغ سے اٹھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تم مس میلکم کے بیٹے ہو اور جینا میلکم کو لے کر ابدی زندگی کی تلاش میں نکلے ہو تاکہ تمھاری ماں ہمیشہ دنیا پر حکمرانی کر سکے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جینا میلکم پاگل ہے اور ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ پاگل خدا سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا احترام کیا جانا چاہئے۔ اسی احترام کے تحت انہوں نے اس کی خواہش پوری کر دی ہے۔ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا وہ۔"

ایک لمحے کو یوسف' ڈاکٹر لیوی کو بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظروں میں شام کا منظر گھوم گیا' جب اس نے کونسل ہاؤس میں بستی کے بڑوں سے ملاقات کی تھی۔ اسے اپنے بنائے ہوئے اسکیچ یاد آئے۔ اپنا ان لوگوں پر چیخنا چلانا یاد آیا۔ اس وقت وہ انہیں یقیناً پاگل ماں کا پاگل بیٹا لگا ہو گا۔ انہوں نے اس کی ہر بات کا غلط مطلب لیا لیکن بہرحال کام بن گیا اور ڈاکٹر لیوی جیسے آدمی نے بھی اس کی ہوشیاری کو تسلیم کر لیا تھا۔ کام جیسے بھی ہوا ہو' اس نے بھرپور کوشش کی تھی اور وہاں گیا' ان سے ملا' انہیں قائل کرنے کی کوشش کی.......... اور بہرحال کامیاب ہوا۔

پھر اچانک اس پر پوری صورت حال منکشف ہوئی۔ وہ جیت گیا تھا۔ اب وہ ایک امیر و کبیر شخص تھا۔ پانچ سال بعد وہ لکھ پتی ہو گا اور پھر سال بہ سال اس کی دولت بڑھتی جائے گی۔

وہ بری طرح اچھلا۔ "اے ڈاکٹر.......... اے راحیلہ.......... بین آئزک.......... میں جیت گیا۔" اس نے چیخ کر کہا اور بین آئزک کو جھنجوڑ ڈالا۔ "اے لڑکے.......... لکھ پتی یو.........."

وہ کہتے کہتے رکا۔ "جوزف ڈیوڈسن سے ہاتھ ملاؤ۔ میں نے کام کر دکھایا۔ ہم سب جیت گئے۔" شام کی مایوسی کے بعد اچانک کامیابی کے خیال سے وہ آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ "اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ میری کامیابی ہے۔" وہ پھر چلایا۔ "ڈاکٹر.......... کام میں نے دکھایا لیکن ہمیں لانے والے تو تم ہو۔ کامیابی ہم سب کی ہے۔ انعام چھوٹا نہیں ہے کہ کوئی محروم رہ جائے۔ کوئی محروم نہیں رہے گا۔ میں.......... میں تم سب کا خیال رکھوں گا۔ ہر ایک کا خیال رکھوں گا میں۔ تم سب بے فکر رہو۔ لکھ پتی جوزف ڈیوڈسن کم ظرف نہیں۔ اسے دوستوں کا خیال رکھنا آتا ہے۔" اس نے ڈاکٹر لیوی کو بانہوں سے پکڑ کر گھما دیا۔ ڈاکٹر نے نہ اس پر احتجاج کیا اور نہ ہی ایسا لگا کہ اس کی دانست

ہ حرکت اس کے وقار کے منافی ہے۔

یوسف نے اسے چھوڑ دیا لیکن ابھی اس کا غبار پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ اس نے ی راستے پر لڑکھڑاتی جینا کے ہیولے کو دیکھا اور نعرہ لگایا۔ "وہ ہے ہمارا بینک' وہ پہاڑ رہی ہے۔ تنہائی کی تلاش میں۔ وہ پورا ثمر تنہا کھائے گی.......... اکیلی.......... اور مجھے ...... جوزف ڈیوڈسن کو لکھ پتی بنا دے گی۔"

"ممکن ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

اس 'ممکن ہے' نے یوسف کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ڈاکٹر لیوی کو گھورتا رہا۔ "کیا ب ہے اس بات کا؟"

"بس یونہی ایک خیال آیا تھا۔ تمہیں بھی بتا دیتا ہوں۔ روایت ہے کہ پہاڑوں پر کسی کو مکمل تنہائی نہیں ملتی۔ اچھا.......... شب بخیر۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر لیوی آگے بڑھ

یوسف' راحیلہ اور بین آئزک کے ساتھ کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کے لئے کے ذہن میں ایک لفظ مچل رہا تھا.......... 'جل ککڑا' لیکن اس نے اسے زبان تک لانا ب نہ سمجھا۔ برا ماننے کا کیا فائدہ' اس نے سوچا.......... میں جیت تو گیا ہی ہوں۔ آدمی لت مند ہونے کے ساتھ عالی ظرف بھی ہونا چاہئے۔

○-----○-----○

جینا میلکم کونسل ہاؤس سے نکلی۔ ثمر حیات کا مرتبان اس نے سینے سے بھینچا ہوا تھا۔ رتبان کے اولیں لمس نے ہی اس کے اندر عجیب سی دیوانگی جگا دی تھی۔ وہ اس اسے لڑنے کی اسی لمحے سے سرتوڑ کوشش کرتی رہی مگر باہر آتے ہی جیسے وہ اس سے ۔ دیوانگی اس کے پورے وجود پر حاوی ہو گئی۔

وہ بے اختیار بھاگنے لگی۔ وہ شمال کی سمت دوڑ رہی تھی.......... گاؤں سے ...... وہ بھاگتی رہی.......... یہاں تک کہ سانسیں سسکیاں بن کر اس کے حلق کو ا کی طرح جلانے لگیں۔ لیکن رکنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس ا زندگی اس سے چھن جائے گا۔

وہ غاروں کے سامنے سے گزرنے والے پتھریلے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ اب اس ار کم ہو گئی تھی۔ راستہ بھی بے حد تنگ ہو گیا تھا لیکن چاندنی میں بالکل صاف دے رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے یوں بھاگ رہی تھی جیسے وہ اس کے دوست

نہیں ' دشمن ہوں۔ یوسف ' ڈاکٹرلیوی ' راحیلہ.......... حتیٰ کہ بین آئزک بھی....... اب جب کہ اسے طویل عرصے زندہ رہنے کی کلید مل گئی تھی تو وہ کسی پر اعتبار نہیں کرسک تھی۔

نیچے اسے گاؤں کی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ اسے گھات لگائے بیٹھے کسی درند کی آنکھیں معلوم ہوئیں۔

وہ اب نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ کوشش کر کے چڑھائی پر چڑھتی رہی۔ جب تک یہ یقین نہ ہو جاتا کہ وہ لوگ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے ' وہ مرتبان کھول کر ایک مٹھی ابدیت پھانکنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر وہ اس چٹانی چھجے تک پہنچ گئی ' جہا راستہ ختم ہو جاتا تھا۔ وہ وہاں رکی اور کھڑے ہو کر برف پوش چوٹی کو دیکھتی رہی۔

اب اس میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ توانائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اتن بلندی پر ہوا میں آکسیجن ناکافی رہ جاتی ہے ' اسی لئے اس کے سینے میں نہیں سما رہی تھی اس کی ٹانگیں ' جو اتنی مشقت کی عادی نہیں تھیں ' اب اس کا بوجھ اٹھانے سے معذوری ظاہر کر رہی تھیں۔ قریب ہی ایک لمبی ' چپٹی مسطح چٹان تھی ' جسے چرواہوں کی کئی نسلیں آرام گاہ کے طور پر استعمال کرتی رہی ہوں گی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس چٹان کی طرف بڑھی اور ڈھیر ہو گئی لیکن اس عالم میں بھی اسے مرتبان کی حفاظت کا خیال رہا تھا۔

بہت آہستہ آہستہ اس کی نظروں میں چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ دل کی دھڑکنیں معمول پر آگئیں۔ پھیپھڑوں میں بھری ہوئی آگ دھیرے دھیرے سرد ہونے لگی۔ ہوا کی ٹھنڈک اور مٹھاس کے چھینٹوں نے اس کی تشویش کو بھی سرد کر دیا۔ پہلی بار اس نے پورے شعور کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے عقب میں ' اوپر تاروں کی طرف کوہ ہرمن کی جڑواں برف پوش چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

جینا میلکم پوری دنیا کے اوپر.......... سر پر اکیلی کھڑی تھی!

ہوا تیز تھی ' لیکن ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ستارے کبھی اتنا نزدیک محسوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ جھکتے ہوئے مغربی افق پر مغربی سمت کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ستارہ سب سے بڑا ' سب سے چمکدار تھا۔

اب اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اسے سب معلوم تھا۔ وہ جینا میلکم ہے.......... دنیا کی امیر ترین عورت اور وہ اس وقت شام میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر مرتبان کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ وہ مرتبان جس میں تیز خوشبو والا دنیا

اب ترین مادہ ہے ' جس میں وقت کی دی ہوئی لامحدود مہلت پنہاں ہے۔

مرتبان میں جو کچھ تھا ' وہ اس کی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ تھا اور اب اس کے تکمیل کے درمیان کوئی شے حارج نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ جیت گئی اور اس بار اس نے موت پر فتح حاصل کی تھی۔

لیکن زندگی کے اس اہم ترین لمحے میں اسے احساس ہوا کہ وہ واضح طور پر یاد کرپا رہی ہے کہ اس کی خواہشات کیا تھیں۔ وہ کراچی میں اپنے محل کی آسائشات کرانیلو کی اس سرزمین پر کیوں آئی ہے؟

اس کی سوچیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ اس کی قوت ارادی کے حکم کی نہیں کر رہی تھیں۔ اس کے تصور میں بیت اللحم کی وہ تصویری کتاب لہرا رہی تھی ' ے بچپن میں دی گئی تھی۔ یہ مغربی سمت کا منظر ویسا ہی تھا۔ کیا خبر ' وہ بیت اللحم پر ہی فگن ہو۔

اس نے اپنے منتشر ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ اوپر ستاروں کی ضو اور بڑھنے لگی۔ اس کے اندر ایک آواز ابھری۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ میرے احکامات کی تکمیل کرو ' جو نے اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں کے ذریعے تم تک پہنچائے ہیں۔ پھر دیر تک اس جود میں ان لفظوں کی بازگشت گونجتی رہی۔

وہ آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ بہت آہستہ آہستہ اس پر ان لفظوں کی ت کھلی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اس کی تنہائی مکمل تھی۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ تھا ' جو کوئی بھی تھا ' اس کے اپنے اندر تھا۔ کہیں کوئی سایہ نہیں تھا ' کوئی آواز نہیں بلکہ ہوا بھی جیسے رک گئی تھی۔

اس نے مرتبان کو اپنے قریب ہی.......... چٹان پر رکھ دیا۔

معنویت اجاگر ہوئی تو الفاظ بہت سادہ ہو گئے اور انہوں نے اس کی روح کی ہوں کو چھو لیا۔ اس کے وجود میں ان دیکھی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ گلے میں نامعلوم ے دبے اور پوشیدہ بند ٹوٹنے لگے۔ اس کا گلا رندھا اور آنسوؤں کا سیلاب بہہ اس کے اندر کون تھا؟ یہ تو خدا بول رہا تھا۔ اب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ خدا ندوں سے کچھ اور نہیں چاہتا بس یہی کچھ چاہتا ہے ' جو اس نے کہا تھا اور وہ.......... نے زندگی اس طرح بسر کی تھی کہ خدا اس کے ذہن میں رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو پذیرائی کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

اس لمحے اس نے اس جینا میلکم کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا' جو دولت سمیٹنے او بڑھانے کی ہوس میں جیتی رہی تھی۔ وہ ایک گناہ گار عورت اور ناکام انسان تھی۔ ـ فیض عورت' جس سے انسانیت کو' اس وطن کو جس نے اسے مرتبہ' دولت اور عزت د تھی' اس وطن کے لوگوں کو............ کسی کو بھی تو کوئی فیض نہیں پہنچا تھا۔ اس سے تو ا کے باپ کو بھی کوئی فیض نہیں پہنچا تھا' جو اس سے بہت زیادہ محبت کرتا رہا تھا۔

اس لمحے پہلی بار اس نے خود کو صحیح روپ میں دیکھا۔ خود کو سمجھا۔ اس کے با نے اسے دنیا کی ہرچیز سے بڑھ کر چاہا تھا لیکن اس نے اپنے باپ کی تمام خوبیاں اور تو رد کر کے صرف اس کی خامیاں اور کمزوریاں اپنا لی تھیں۔ زندگی نے اسے سب کچھ دیا لیکن اس نے زندگی کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے پوری زندگی ضائع کر دی تھی۔ ا نے نہ شادی کی' نہ کسی کو محبت دی' نہ انسانی نسل کو آگے بڑھایا۔ وہ ایک خشک' مقصد' بنجر زندگی تھی جو اس نے گزاری تھی اور وہ اس خشک' بے مقصد اور بنجر زند سے ابد تک چمٹے رہنا چاہتی تھی تاکہ وہی کچھ کرتی رہے' جو اب تک کرتی رہی ہے۔

اسے اپنے بھائی کا خیال آیا' جس نے محبت کی اور محبت پر اپنا سب کچھ قربان دیا۔ باپ کی دولت بھی۔ جو کروڑپتی باپ کا بیٹا ہو کر ہنسی خوشی غربت کی زندگی گزار تا ر جس نے باپ کی نسل کو آگے بڑھایا' جس نے دولت مند بہن کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا۔ خود محنت مزدوری تک کی۔ جس نے زندگی سے سچی محبت کی لیکن ہوس میں مبتلا نہیں ہوا۔ جو نہ مرنے کی عمر میں مرگیا لیکن اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا۔

اور ایک وہ تھی! اس نے خود اپنی زندگی تباہ کی اور اب اپنی بھتیجی کو بھی تباہ کر ر ہے۔ اس نے راحیلہ کو بھی قید کر لیا۔ اس پر فطری زندگی اور اس کی خوشیوں دروازے بند کر دئے۔ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کہ وہ تحفظ کی خواہاں تھی۔ راحیلہ کو غیر مشروط تحفظ بھی فراہم کر سکتی تھی۔ آخر وہ اس کا خون تھی۔ اس کے بھائی اولاد۔ اس کا حق تھا............ بہت کچھ اس کا حق تھا۔ لیکن اس کی سفاکی نے راحیلہ کو اجاڑ دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

کوہ ہرمن کی چوٹی کی طرف سے ہوا چلی۔ جینا میلکم کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ ا تھرتھراہٹ نے اسے احساس دلایا کہ وہ ایک کمزور' بوڑھی اور تنہا عورت ہے۔ وہ ایک مقدس پہاڑ پر' ایک چٹان پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایک مرتبان تھا' جس میں ثمر حیا کا ست تھا۔ ایک وقت تھا' جب اسے یقین تھا کہ اس کا حصول اس کی دلی خواہش

لیکن اب وہ خود کو ٹٹولنے پر مجبور تھی۔ اسے اب یقین نہیں رہا تھا۔

اس نے مرتبان کو غور سے دیکھا۔ چاندنی میں وہ نیلگوں مرتبان چمک رہا تھا۔ جینا نے سوچنے کی کوشش کی کہ اسے اس جوہرحیات کی طلب کیوں تھی۔ اس کی کیا اہمیت تھی اور اب وہ اسے اپنے پہلو میں کیوں رکھے بیٹھی تھی مگراب اسے پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔ دھیمی سی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ جہاں جہاں اس کی املاک تھیں صنعتیں تھیں' وہاں کے محکمہ انکم ٹیکس سے اس کی سرد جنگ چل رہی تھی۔ انکم ٹیکس دیتے ہوئے اس کا دم نکلتا تھا۔ انکم ٹیکس بچانے کی ہر ترکیب سے وہ استفادہ کرتی تھی اور وہ اسے چھیڑتے تھے کہ اس کی موت کے بعد وہ ساری کسر نکال لیں گے اور اس کی موت اب تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔

لیکن یہ تو ماضی کی باتیں تھیں' جو اب گھٹیا معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ تو وہ وقت تھا' جب اسے خدا کی نظریں واضح طور پر اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ اسے خود سے شرم آ رہی تھی۔

اسے اپنی گزری ہوئی زندگی یاد آنے لگی۔ کاروباری سودے' بے ایمانیاں' بہی کھاتے' اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس کی بے رحمی! اور ان سب کا حاصل کیا تھا؟ وہ کسی کو بھی خوشی نہ دے سکی۔ کسی کو کیا دیتی' وہ تو خود بھی ہمیشہ خوشی سے محروم رہی۔

اس نے سوچا' وہ زندگی ایک ڈراؤنا خواب تھی۔ حقیقت تو وہ ہے' جو فلسطین آنے کے بعد اس پر گزری۔ حقیقت تو وہ آنسو ہیں' جو اس رات نزارتھ میں خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ وہ محسوسات تھے جنھوں نے اس میدان میں جہاں صدیوں پہلے داؤدؑ ایمان سے مسلح ہو کر ایک دیو کے مقابل آئے تھے' اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ حقیقت وہ زمین تھی' جہاں مسیحؑ کے قدم پڑے تھے۔ حقیقت وہ لمحہ تھا جب اس نے دریائے اردن کے مقام آغاز پر خدا سے دعا کی تھی کہ وہ اس کے گناہوں کو اپنی رحمت سے دھو ڈالے۔

اس نے پھر چاندنی میں چمکتے مرتبان کو دیکھا..........

ہاں.......... یہ نعمت جو مرتبان میں ہے' موت کے فرشتے کو خالی ہاتھ لوٹانے کے لئے خدا کے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ وہ حیات بخش جوہر ہے' جس کے عوض وہ شیطان کو اپنی روح تک فروخت کرنے پر آمادہ تھی۔ یہ وہ قدیم ترین غذا ہے جسے برگزیدہ بندوں کی نسلوں نے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ خدا کے حکم سے اسے کھانے کے بعد وہ زیادہ جی

سکے گی۔ کتنا؟ سو سال؟ دو سو سال؟ اور اگر وہ ہر سو سال بعد آ کر یہ تحفہ خدا حاصل کر لے تو کون جانے' ہزار سال.......... دو ہزار سال..........

ستاروں کی اس روشن چھاؤں میں اس کے چہرے پر ایک ضد کا سایہ لہرایا۔ ہاں.......... سب سے اہم بات یہ ہے کہ جینا کو زندہ رہنا چاہئے.......... اسے مرنا نہیں چاہئے۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس ستاروں بھرے منظر نے اسے پھر مسحور کر لیا۔ وہ آواز پھر گونجی۔ اس بار وہ بے لفظ تھی۔

اس نے سوچا' آخر اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ جینا میلکم تا ابد جئے؟ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مہیب ماضی کے عکس' زندگی کی ہوس کے جواز لمحہ بہ لمحہ ماند پڑتے جا رہے تھے۔ کیا وہ خدا کے اس تحفے کی مستحق تھی؟ کیا وہ اس قابل تھی کہ بیت الجبل کے نیک اور برگزیدہ بندوں پر اسے فوقیت دی جاتی؟ انہیں نظرانداز کر کے اسے منتخب کیا جاتا۔ یہ نعمت تو خدا کی خاص نعمت ہے' اس کے رحم کی علامت ہے اور موت کیا ہے؟ وہ تو خدا کے پاس پہنچنے کا نام ہے۔ ایک بار اس نے ڈاکٹر لیوی سے زندگی' موت اور خدا کے بارے میں اس کے نظریے معلوم کئے تھے۔ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا تھا' نہ میں زندگی میں یقین رکھتا ہوں نہ موت میں۔ میں تو اس سفر پر یقین رکھتا ہوں جو خدا نے ہمیں سونپا ہے اور اس سفر کی منزل خدا خود ہے۔ وہ ہمارے اندر ہے۔ ہم نہیں رہیں گے' وہ تب بھی موجود ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوتا' کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا کیونکہ جب بھی سفر ختم ہو گا' میں اس سے جا ملوں گا۔

جینا کو یوسف کا خیال آیا' جس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ثمرحیات کا مرتبان اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار اسے خوشی کب ملی تھی۔ اسے یاد آگیا۔ نزارتھ میں۔ گیلی لی میں اور جودہ کی پہاڑیوں میں.......... اور بین آئزک بھی اس کی خوشی تھا۔ وہ اسے ماں کہہ کر پکارتا تو وہ خوشی سے بھیگ جاتی۔ اور خوشی فطرت کے حسین نظاروں میں پنہاں تھی۔ صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں تھی۔ بڑے اور روشن ستارے میں تھی۔

جینا کو وہ شخص یاد آیا جسے اس نے چاہا تھا۔ وہ تھوڑا سا عرصہ بہت خوش کن رہا تھا۔ وہ اس عرصے میں بہت خوش رہی تھی لیکن پھر اس نے اسے چھوڑ دیا.......... دھتکار دیا تھا اسے۔ اس لئے کہ وہ باپ کی دولت کو بڑھانا چاہتی تھی' اس سے دستبردار ہونے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں.......... اس لمحے وہ اسے بہت قریب محسوس ہو رہا تھا۔ بہت قریب۔ اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش خدا اسے اتنا اختیار دے کہ وہ وقت کو پیچھے دھکیل کر وہاں تک لے جا سکے اور پھر اپنا فیصلہ تبدیل کرے۔ وہی تو وہ موقع تھا' جہاں اس نے خوشیاں گنوا کر ہوس کا روگ اپنا لیا تھا۔ لیکن اب.......... اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کا وجود ایک چبھتی ہوئی اداسی سے بھر گیا۔ اس نے محبت بھی کی تو کیسی بے رنگ' بے روح' بے ثمر! لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ محبت مری نہیں تھی' اس کے اندر موجود تھی۔ اور اب کسی ہری بھری' ننھی کونپل کی طرح سر اٹھا رہی تھی۔ بدصورتی فنا ہو رہی تھی۔ خوبصورتی ابھر رہی تھی۔

اسے اپنے اندر سکون کا' تفہیم کا احساس ہوا۔

ستاروں کی روشنی پیلی پڑنے لگی۔ کوہ ہرمن کی چوٹی اور بلند محسوس ہونے لگی۔ پھر سورج کی پہلی کرن چوٹی کو چھو کر منعکس ہوئی اور پلٹ کر جیسے چاروں طرف بکھر گئی۔ جینا کا جسم تھرتھرایا۔ کیونکہ ابھی ایک لمحہ پہلے جو کچھ غیرواضح تھا' اب پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔ اس نے ثمرحیات کے مرتبان کو دیکھا اور اس لمحے اس نے جان لیا کہ وہ ثمر اس کے لئے نہیں ہے۔ اسے ابدیت نہیں چاہئے' نہ آج.......... نہ آئندہ کبھی۔

وہ اٹھی لیکن اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ اسے سردی لگ رہی تھی لیکن سکون کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔ اس نے شال کو اچھی طرح جسم پر لپیٹا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

چند قدم آگے جانے کے بعد وہ رکی اور اس نے پلٹ کر چٹان پر رکھے مرتبان کو دیکھا۔ دھوپ پہاڑ کی چوٹی عبور کر کے اتر آئی تھی اور نیلگوں مرتبان زرد دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ بیت الجبل کے بڑوں نے اسے وہ ثمرحیات دے کر کتنے بڑے ایثار کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اگر وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتی تو مناسب یہی تھا کہ ثمرحیات انہی لوگوں کو واپس کر دے۔ وہ پلٹی' اس نے واپس جا کر مرتبان اٹھایا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

* * *

روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ عین وقت پر پتا چلا کہ جوزف ڈیوڈسن پراسرار طور پر غائب ہے۔ ڈاکٹر لیوی' خواتین کی اقامت گاہ پہنچا۔ اس نے راحیلہ کو پکارا۔ "مس ذیشان!"

راحیلہ فوراً ہی دروازے پر آئی۔ "کچھ پتا چلا؟" اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔ "تم نے کہا تھا کہ جیسے ہی کچھ معلوم ہو' تمہیں ضرور بتاؤں۔ سو میں آ گیا ہوں۔ ابھی ایک مقامی لڑکے سے میری بات ہوئی ہے۔ اسے بارزی لئی نے جوزف کی تلاش میں بھیجا تھا۔ وہ ابھی پہاڑ کی طرف سے آیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک غار میں یا تو کوئی پاگل ہے' یا کوئی شیطان ہے' جو چیخ چیخ کر رو رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے خود اسے دیکھا ہے۔ لڑکا بہت خوفزدہ تھا۔"

راحیلہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ "لیکن جوزف پاگل تو نہیں ہے۔"

"یہ ہمیں کسی بھی نوع کی پہلی اطلاع ملی ہے۔ میں بہرحال چھان بین تو کروں گا۔"

"پلیز......... مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ ممکن ہے میں کسی کام آ سکوں......... کچھ مدد کر سکوں۔" راحیلہ کے لہجے میں التجا تھی۔

"تو تم شیطانی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہو؟"

"میں صرف جو کے لئے خوفزدہ ہوں۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"اس خوف کی نوعیت کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن کل جب پھوپھی میلکم واپس آئیں' میں اسی وقت سے خوفزدہ ہوں۔ وہ تھکی ہاری' بھرا ہوا مرتبان ساتھ لئے واپس آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ثمرحیات دینا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔"

"کیوں؟"

راحیلہ خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتی رہی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

"خیر چھوڑو۔ میرا خیال ہے' وجہ میں جانتا ہوں۔ پھر تم نے مرتبان کا کیا کیا؟"

"میں نے پھوپھی میلکم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جو کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ
بان بارزی لئی کو واپس دے آئے۔"

"اور اس وقت تم خوفزدہ ہوئیں؟"

"ہاں۔ جو کے چہرے پر تاثر ہی ایسا تھا۔"

"کیا تاثر تھا وہ؟"

"بہت خراب۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"مس میلکم.........؟"

"وہ سو رہی ہیں۔"

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اسی لئے تو میں نے روانگی ملتوی کر دی۔ مس
م کو آرام کی ضرورت ہے۔ خیر......... تم میرے ساتھ چلو لیکن اتنا کہہ دوں کہ حوصلہ
نا۔ کچھ بھی سامنے آ سکتا ہے۔ ایک فاضل ٹارچ ساتھ لے آنا۔"

راحیلہ اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر لیوی سوچتا رہا۔ جینا نے گزشتہ شام اس سے ملاقات کی
لیکن ثمرحیات کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس وقت بین آئزک بھی اس کے
ھ تھا۔ راحیلہ بھی موجود تھی۔

"ڈاکٹر لیوی......... مجھے ایک بات بتاؤ۔" جینا نے بالکل اچانک کہا تھا۔ "زندگی کا
مقصد ہے؟"

"یہ زندگی ایک امتحان ہے۔ اس کا مقصد خدا کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنا
ہے۔"

"اور خدا کے احکامات کیا ہیں؟"

"وہ آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔"

"کتابوں میں؟"

"جی ہاں۔ آپ بھی جانتی ہیں کہ آسمانی کتاب کوئی ایک نہیں' چار ہیں۔"

"اور تمہارے خیال میں........."

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پھر
انے بے بسی سے بین آئزک کی طرف دیکھا۔

"مجھے اب صرف حق کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر لیوی! میں سچ جاننا چاہتی ہوں۔" جینا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں بین آئزک کے سامنے بات نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" جینا اور بین آئزک نے بیک وقت پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب بھی بین آئزک کے سامنے نہیں دے سکتا۔"

"لیکن کیوں انکل؟" اس بار بین آئزک بولا۔

"اس لئے کہ میں تمہارا آئیڈیل ہوں اور رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"لیکن حقیقت جاننا بہت ضروری ہے۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔" بین آئزک نے کہا۔

ڈاکٹر لیوی اسے کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "ضروری نہیں کہ جو مجھے حقیقت نظر آئے، تمہیں بھی سچ لگے۔"

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آپ کو اپنا رہنما مانتا ہوں لیکن خود بھی سوچتا ہوں.......... ذہن رکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن تم ایک وعدہ کرو۔ مجھ سے تعلق کبھی نہیں توڑو گے۔" ڈاکٹر لیوی کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔

"یہ وعدہ لینے کی آپ کو ضرورت نہیں انکل۔ آپ ہی میرا خاندان ہیں۔ میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں ڈاکٹر لیوی۔" جینا نے مداخلت کی۔

ڈاکٹر لیوی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد کر رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ "جو کچھ میں نے سمجھا اور جانا، آپ کے اصرار پر بتا رہا ہوں۔ اس سے میری کوئی غرض وابستہ نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ خدا کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ بہرحال، میں نے بتایا تھا نا کہ میں ایک بار برسوں پہلے بیت الجبل آیا تھا اور میں یہاں اس لئے آیا تھا کہ میں نے سنا تھا، یہاں بارزی لئی نام کا ایک شخص رہتا ہے۔" وہ بین آئزک کی طرف مڑا۔ "ہماری رگوں میں بھی بارزی لئی کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہی اشتیاق مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔ یہاں آکر میں بارزی لئی سے ملا۔ وہ اس وقت بھی ویسا ہی تھا، جیسا اب ہے۔ اس کے مزاج میں بلا کا انکسار ہے۔ سب سے ایسے ملتا ہے جیسے خود کمتر ہو۔ میں نے

زی لئی خون کا حوالہ دیا تو وہ بچھ گیا لیکن دو دن میں مجھ پر ایک عجیب بات منکشف ئی۔ وہ مسلمان تھا۔ ویسے یہاں بیت الجبل میں سب شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ میں نے سلسلے میں اس سے استفسار کیا۔ وہ پہلو بچاتا رہا۔ میرے اصرار پر اس نے بہت پیچیدہ بہت سادگی سے کر دی۔ اس نے، کہا انسان کے وجود کا مقصد اللہ کی اطاعت ہے ن انسان طبعاً نافرمان ہے۔ اللہ نے انسان کو ہدایت دینے کے لئے پیغمبر بھیجے، اس پر بے نازل فرمائے۔ یہ انسان کی اطاعت کی سب سے بڑی آزمائش تھی اور ہر دور میں انوں نے خدا پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی نافرمانی کی۔ آبائی عقیدے ان کی انا کے مظہر گئے۔ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والوں نے توریت میں آنے والے پیغمبروں کے لق پڑھا، ان کی نشانیاں جانیں۔ انہیں بتایا گیا کہ جب وہ پیغمبر آئیں تو ان پر ایمان لے لیکن جب حضرت عیسیٰؑ آئے تو یہودیوں کی بھاری اکثریت نے تمام نشانیاں موجود نے کے باوجود ان پر ایمان لانا گوارا نہیں کیا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے چمٹے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر انجیل مقدس نازل فرمائی۔ اس میں آخری پیغمبرؐ تذکرہ تھا۔ تمام کھلی نشانیاں بیان فرمائیں اور فرمایا کہ وہاں دین مکمل ہو گا۔ جب آخری برؐ تشریف لے آئیں تو ان پر ایمان لے آنا۔ لیکن جب وہ مبارک وقت آیا تو یہودیوں رنصرانیوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑنا گوارا نہ کیا، وہ کھلی نافرمانی تھی اور انسان کی رشت میں نافرمانی ہے۔ اب بتاؤ آدمی اگر تمام عمر خدا کی اطاعت و فرماں برداری میں بسر ے اور خدا کے ایک اتنے واضح اور کھلے حکم کو نہ مانے تو وہ کیا ہوا، یہ باتیں سن کر میں زکر رہ گیا۔ بات سادہ اور واضح تھی۔ پھر بارزی لئی نے بتایا کہ آخری پیغمبرؐ کی آمد کا سن اس کے جد امجد مکہ مکرمہ گئے، وہاں انہوں نے خدا کے آخری رسولؐ کو دیکھنے کی ادت حاصل کی اور حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ سو وہ اب مسلمان ہے۔"

جینا اور بین آئزک اس کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے تھے۔ اس کے خاموش نے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جینا نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا کیا ڈاکٹر لیوی؟"

"میں نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔" ڈاکٹر لیوی نے ہچکچائے بغیر اعتراف یا۔

اس بار خاموشی بہت گہری، بہت سنگین تھی۔ بین آئزک کسی گہری سوچ میں ڈوب یا تھا۔ ڈاکٹر لیوی اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس ے بھتیجے کا ردعمل اتنا شدید نہیں ہے، جتنی اسے توقع تھی۔

"تو تمہارے خیال میں بارزی لئی کا استدلال درست تھا؟" جینا نے پوچھا۔

"اب آپ نے بھی اس کا استدلال سن لیا ہے۔ فیصلہ خود کیجئے۔" ڈاکٹر لیوی۔ جواب دیا۔

"مجھے ایک بات بتائیں۔ آپ نے یہ بات مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دی.........." بین آئزک نے کہا۔

"مناسب وقت پر بتانے کا ارادہ تھا۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ "تمہارے آتے ہی ! نے سوچا کہ تمہیں پہلی بار وطن.......... گھر میسر آیا ہے۔ اگر میں تمہیں حقیقت بتاؤر اول تو وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ تم اپنا وطن.......... اپنا گھر چھوڑنا نہ چاہو گے۔ اور اگر تم نے میری بات سمجھ لی تو گھر آتے ہی بے گھری کے دکھ میں مبتلا جاؤ گے۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ خود میں نے یہاں آنے کے بعد جو کچھ دیکھا ہے' اس۔ مجھے سب کچھ چھوڑ کر سبزیاں ترکاریاں کاشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ صدیوں کے۔ گھروں کو یہاں آتے ہی رواداری اور انسانیت نوازی بونا چاہیئے تھی تاکہ آنے وا۔ وقتوں میں امن اور خوشحالی کی فصل کاٹی جا سکے لیکن انہوں نے نفرتیں اور غرور کے بوئے اور اب دہشت گردی کی فصل تیار کھڑی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو معقول بات نہ سمجھا سکتا۔"

"ایک بات تو ہے ڈاکٹر لیوی۔" جینا نے کہا۔ "اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھو بہت مشکل کام ہے۔"

"خرابی صرف انا کی ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ "حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا۔ حکم کے سامنے انا کا کوئی کام نہیں.........."

راحیلہ گرم کوٹ پہنے' ہاتھ میں برقی لالٹین لئے باہر نکلی تو ڈاکٹر لیوی بری طر چونکا۔ اسے راحیلہ پر ترس آنے لگا۔ لڑکی جوزف سے محبت کرتی تھی لیکن اس محبت اعتراف خود سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی دانست میں جوزف بدی نمائندہ تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ جوزف برا نہیں تھا۔ محض بے وقوف تھا۔ بے وقوف کمزور اور بھٹکا ہوا اور اگر وہ اس سے محبت کرتی تھی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ حقائ کا سامنا کرے۔ ڈاکٹر لیوی کو راحیلہ پر ترس آ رہا تھا.......... اس پر کہ اب اس کے سا کیا آئے گا۔ لیکن وہ اسے بچانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ انسان کا بنیادی حق ہوتا ہے.......... اذیتوں سے گزر کر کچھ سیکھنا.......... جاننا.......... ارتقاء کے عمل سے گزرنا.......... اذیتو

ے بچایا جاتا رہے تو آدمی مرتے دم تک بچہ رہتا ہے۔ کبھی بڑا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر لیوی نے راحیلہ کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف اور تشویش جیسے ھل گئی تھی۔ اس کی جگہ مضبوطی نے لے لی تھی۔ ڈاکٹر لیوی کا تجربہ تھا کہ یہ تاثر اس ت خواتین کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے جب وہ پوری مضبوطی کے ساتھ کوئی اہم فیصلہ ر لیتی ہیں۔

راحیلہ نے ڈاکٹر لیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت تاریکی میں ایک سایہ ان کی طرف ھا۔ اندھیرے میں وہ صرف اس کی خوف سے بھری آنکھوں کی سفیدی ہی دیکھ سکے۔ وہ نامی لڑکا تھا' جس نے انہیں یوسف کی پہلی خبر دی تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس سے اس کی بان میں کہا۔ "آؤ.......... تم بس اس غار کی طرف اشارہ کر دینا۔ پھر تم جتنی تیزی سے ہو وہاں سے بھاگ لینا۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکے نے لدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بہت خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تینوں گاؤں سے دور اس راستے پر چل دئے جو تاریک غاروں کی طرف جاتا ا۔

یوسف کی گمشدگی کا پتا اس وقت چلا تھا' جب ان کا قافلہ واپسی کے لئے تیار تھا۔ ا اپنے میزبانوں کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اچانک راحیلہ نے توجہ دلائی کہ جوزف ڈیوڈسن لر نہیں آ رہا ہے۔ کسی کو یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے آخری بار کب اور کہاں بکھا تھا۔

ان کی اقامت گاہوں کی تلاشی لی گئی لیکن یوسف موجود نہیں تھا۔ اسے پکارا یا.......... آوازیں دی گئیں لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا.......... ایوری' شلومو اور بین آئزک ی اسے تلاش نہ کر سکے' تو روانگی ملتوی کر دی گئی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' ڈاکٹر لیوی کو یقین ہوتا گیا کہ جوزف کے ساتھ کوئی بجڑی ہوئی ہے۔ اسے جوزف کے مس میلکم سے معاہدے کے متعلق کچھ علم نہیں تھا لن اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ جوزف کی کامیابی جینا میلکم کے ثمرحیات کھانے میں مضمر ہے۔ اس اعتبار سے جوزف کامیابی کے بہت قریب پہنچ کر ہار گیا تھا۔ ڈاکٹر لیوی کا نظریہ تھا لہ خدا کو انسان کو سزا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بدی خود تباہی کا سامان ہوتی ہے۔ دی جب خطا کرتا ہے تو خود اپنے اندر اپنی سزا کا بیج بو دیتا ہے۔ وقت آنے پر اسے وہ ل کاٹنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر لیوی کو خدشہ تھا کہ جوزف نے جب ثمر حیات کے لئے جینا کے استرداد کے متعلق سنا ہو گا تو خود کو ختم کرنے کے متعلق سوچا ہو گا لیکن لڑکے نے جب اسے آ کر بتایا کہ غار میں کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے تو اس نے سوچا کہ موت سے بدتر کوئی المیہ پیش آیا ہے۔

کوئی بیس منٹ بعد وہ غاروں کے علاقے میں پہنچے۔ لڑکا اب اتنا خوفزدہ تھا کہ ڈاکٹر لیوی سے چمٹا جا رہا تھا۔ وہ پانچ بڑے غاروں کے سامنے سے گزرے۔ لڑکے نے اوپر ایک چھوٹے غار کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا دہانہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں بیٹھ کر ہی داخل ہوا جا سکتا تھا۔

انہوں نے قریب جا کر دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ کسی غار کا دہانہ ہی معلوم ہوا۔ ڈاکٹر لیوی نے بیٹھ کر لالٹین اندر لٹکائی تو پتا چلا کہ وہ تنگ اور نیچا ڈھلوانی راستہ ہے۔ ڈاکٹر لیوی نے لڑکے سے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے؟" لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر لیوی نے باہر بیٹھے بیٹھے یوسف کو پکارا۔ "جوزف.......... جوزف.........."

راحیلہ بھی گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی آواز میں آواز ملانے لگی۔

اندر سے انہیں کوئی آواز نہ آئی لیکن لڑکے کی سماعت زیادہ تیز تھی۔ اس کے چہرے پر اچانک دہشت کا تاثر ابھرا اور وہ پلٹ کر گاؤں کی طرف یوں بھاگا' جیسے اس کے پیچھے بلائیں لگ گئی ہوں۔

"یہ کیا؟ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔" راحیلہ نے کہا۔

"فی الحال ہمارے پاس کوئی اور سراغ بھی تو نہیں۔ تم یہیں رکو.......... میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"دیکھو۔ کسی غار میں داخل ہونے کے لئے اور طرح کے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے اسے سمجھایا۔ "بہت سے لوگوں کو تنگ جگہیں' گھٹن اور تاریکی راس نہیں آتیں۔"

"میرے پاس حوصلہ نہیں' صرف عزم و ارادہ ہے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔ "اگر وہ اندر ہے تو اسے مدد کی ضرورت بھی ہو گی۔"

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "ابھی تم اپنی لالٹین روشن نہ کرنا۔ بلاوجہ بیک وقت دو لالٹینیں روشن کرنا مناسب نہیں اور میرے قریب رہنا۔ آگے آگے میں

پلوں گا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مضبوط ڈوری کا لچھا اور ایک نکیلی میخ نکالی۔ میخ و غار کے دہانے کے قریب ایک چٹان میں گاڑ کر اس میں ڈوری کا ایک سرا مضبوطی سے یخ میں باندھ دیا۔

"آپ تو ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔" راحیلہ نے پرستائش لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا۔ "غار میں اندھا دھند کبھی نہیں اترنا چاہئے۔ واپسی کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہئے۔"

"بے چارہ جو!" راحیلہ بولی۔ "اگر وہ اس غار میں گیا ہے تو اس نے اس بات کا خیال نہیں رکھا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔"

"تو جلدی کریں نا.........."

"جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہئے۔ بہت نقصان دہ ہے۔"

ڈاکٹر لیوی نے بڑی احتیاط سے غار کے دہانے کی نگر تھامی اور اندر اتر گیا۔ راحیلہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ تنگ ڈھلوانی راستے پر سر جھکائے چل دئے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھے' ہوا بھاری ہوتی گئی۔ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

کوئی چار سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈاکٹر لیوی ٹھٹکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر راحیلہ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ انداز ایسا تھا' جیسے سماعت پر زور دے رہا ہو۔ سرنگ کے اس طرف.......... دور سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آواز انسانی ہے یا کسی جانور کی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اپنی تلاش کے انجام تک پہنچ گئے ہیں۔" ڈاکٹر یوی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اپنا حوصلہ مجتمع کر لو۔"

راحیلہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ پھر آگے بڑھنے لگے۔ سرنگ بتدریج اتر رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر وہ اچانک اہنی سمت مڑ گئی' اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔

ڈاکٹر لیوی کی لالٹین کی زرد روشنی میں یوسف نظر آیا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے ل بیٹھا تھا۔ اس کا سر تقریباً زمین سے لگا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا باکسر لگ رہا تھا' جسے حریف باکسر کے گھونسوں نے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' ہاتھ جگہ جگہ سے چھلے ہوئے تھے اور خشک خون سے سیاہ ہو رہے تھے۔ ایک آنکھ کے اوپر کٹ لگا ہوا تھا۔ خون بہہ کر اس کے رخساروں اور گردن تک آیا تھا۔ اس کے متورم

ہونٹ سیاہ ہو رہے تھے' وہ بائیں ہاتھ پر زور ڈال کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں اس نے ایک بوتل کو پکڑا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی برقی لالٹین اس کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔

"جو.........." راحیلہ نے چیخ کر اسے پکارا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر لیوی نے اسے روک لیا۔

یوسف نے آہستہ سے سر گھما کر انہیں دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ اس نے آہستہ سے خود کو اٹھایا اور غار کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"جو.......... تم زخمی ہو۔" راحیلہ آگے بڑھی۔ اس بار ڈاکٹر لیوی نے اسے نہیں روکا۔

یوسف نے اچانک اسے پہچان لیا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے پاگلوں کی طرح چیخ کر کہا۔ چھوٹے سے کمرے میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ "تم ثمرحیات کے چکر میں میرے پیچھے آئی ہو نا۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں بچا بنفشی آنکھوں والی حسینہ۔ وہ سب تو میں کھا گیا۔ تم اپنے چاکلیٹ سولجر کے پاس واپس چلی جاؤ۔"

راحیلہ نے پلٹ کر ڈاکٹر لیوی کو ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اچانک سہمی ہوئی چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔ "یہ.......... یہ تو دیوانہ ہو گیا ہے! ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اب کیا کیا جائے؟"

ڈاکٹر لیوی نے آگے بڑھ کر روشنی کا رخ یوسف کی آنکھوں کی طرف کر دیا۔ چند لمحے وہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں کو دیکھتا رہا' پھر اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ "نہیں۔ یہ پاگل نہیں ہوا۔" اس نے کہا۔ "یہ نشے میں دھت ہے۔"

"ہاں.......... میں نے پی ہے اور خوب پی ہے مسخرے اسکالر۔" یوسف نے چیخ کر کہا۔ "اور تمہیں معلوم ہے وہ ثمرحیات کہاں ہے۔ وہ میرے پیٹ میں ہے۔ میں نے پورا پھل کھا لیا' اب میں مر نہیں سکتا' اس لئے پی رہا ہوں۔ اور پیوں گا۔"

"لیکن عام آدمی کو اگر یہ معلوم ہو کہ وہ موت سے محفوظ ہو گیا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

یوسف ہنسنے لگا۔ "میں عام آدمی نہیں۔ اب تو میں کم از کم پانچ سو سال جیوں گا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

یوسف نے انگارا آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور حلق کے بل چلایا۔

"میں.......... میں یوسف عالم.......... میں اس بدمعاش فراڈیے سے عاجز ہوں۔ مجھے اس کی صورت' اس کی آواز زہر لگتی ہے اور اب میں سینکڑوں سال اسے بھگتوں گا۔"

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "لیکن روئے زمین پر ایک لمحے کی سچی شرمندگی ہزاروں سال کی.........."

"شرمندہ کون کمبخت ہو رہا ہے؟" یوسف نے دہاڑ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کوئی پشیمانی نہیں۔ افسوس ہے.......... اس بات کا کہ یوسف عالم بدبودار آدمی ہے اور جب میں پیتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ اس لئے میں پیئے جا رہا ہوں' اور بنفشی آنکھوں والی' یہ جام تمہاری اور تمہارے چاکلیٹ سولجر کی صحت کے نام۔" وہ راحیلہ کی طرف مڑا۔ اس نے بوتل کھولی اور منہ سے لگا لی۔ لیکن بوتل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ "ہائے.......... اب میں کیا کروں؟" وہ دردناک لہجے میں چلایا۔ اس نے بوتل سامنے دیوار پر دے ماری۔ "اب میرا نشہ اکھڑ رہا ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں غلیظ یوسف عالم ہوں۔" وہ فرش پر ڈھے گیا۔

راحیلہ بڑھی اور اس کے پاس گھٹنوں کے بل جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہے' کیا کرے۔

"تو تم نے پورا مرتبان صاف کر دیا ثمرحیات کا؟" ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"پورا مرتبان صاف کر دیا ثمرحیات کا۔" یوسف نے اس کی نقل اتاری۔ "تو اور کیا کرتا؟ میں عقل مند آدمی ہوں۔ ہوں کہ نہیں؟ اب ایسا بھی نہیں کہ اس پورے معاملے میں کوئی مجھے ہی بے وقوف ثابت کر دے۔"

"وہ کیسے یوسف عالم؟" ڈاکٹر لیوی نے اسے اس کے اصل نام سے پکارا' جو اس نے نشے کے عالم میں خود عیاں کر دیا تھا۔

"دیکھو.......... مس میلکم نے ثمرحیات نہیں کھایا۔ تو اب مجھے کیا ملے گا؟ کچھ نہیں۔ اس معاملے میں سبھی کو کچھ نہ کچھ ملا ہے۔ ہے نا؟ بنفشی آنکھوں والی کو چاکلیٹ سولجر مل گیا۔ جینا میلکم کو مذہب مل گیا۔ بین آئزک کو وطن اور گھر مل گیا۔ تم اپنی سبزیوں کی طرف واپس چلے جاؤ گے۔ میں بے وقوف خالی ہاتھ رہ گیا۔"

"ہاں یوسف! بے وقوف تو تم ہو۔"

"تھا۔ اب نہیں ہوں۔ میں نے ثمرحیات کھا لیا ہے۔ اب میں پوری دنیا کا بادشاہ

بن جاؤں گا۔" یوسف نے پلکیں جھپکائیں اور نفی میں سرہلایا۔ اس بار وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی اور لہجے میں دہشت تھی۔ "مگراب مجھے ہمیشہ یوسف عالم کے ساتھ رہنا ہوگا۔ ہر صبح آئینے میں اس منحوس کی صورت دیکھنی پڑے گی۔ دن رات اسے بھگتنا پڑے گا اور میں اس سے خوفزدہ ہوں۔ میرے خدا.......... میں واقعی خوفزدہ ہوں۔" اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔

راحیلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یوسف.......... یوسف.......... اتنا پریشان نہ ہو۔"

یوسف نے اسے جھٹک دیا۔ "ٹھیک ہے.......... دیکھو اور مجھ پر ہنسو۔ یوسف عالم اور خوفزدہ! یوسف عالم اور پریشان! کتنا بڑا مذاق ہے یہ۔ مجھے تو خود بھی ہنسی آرہی ہے۔ آؤ.......... ہم سب مل کر ہنسیں۔" وہ خوفناک انداز میں ہنسا اور پھر گڑگڑانے لگا۔ "خدا کے لئے۔ چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

راحیلہ نے اس کے چھلے ہوئے ہاتھ کو سہلایا۔ وہ تیز' نکیلی چٹانوں کی رگڑ کا نتیجہ تھا۔ وہ اندھیرے میں' خود سے گھبرایا ہوا غار میں داخل ہوا ہو گا تو کئی بار چٹانوں سے رگڑ لگی ہو گی۔ وہ زخم خوردہ جانور کی طرح سب کی نگاہوں سے چھپتا پھر رہا ہو گا۔ یہ سوچ کر راحیلہ کا دل اس کے لئے تڑپ اٹھا۔ "یوسف.......... کوئی نہیں ہنس رہا ہے تم پر.........."

"اے.......... یہ یوسف کسے کہہ رہی ہو؟" یوسف بری طرح اچھلا۔ "میں جوزف ہوں.......... جوزف ڈیوڈسن۔"

"اب چھپانے کا کیا فائدہ؟" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ "تم خود کئی بار بتا چکے ہو کہ تم یوسف عالم ہو۔ ویسے مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا۔"

"تم میری بات سنو.........." راحیلہ نے مضطربانہ کہا۔ پھر ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ "آپ اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟ آپ تو سمجھ رہے ہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ آپ ہی کچھ کریں نا!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں کوشش کر سکتا ہوں۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا اور بڑھ کر ان دونوں کے بہت قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں میں دونوں کے لئے ہمدردی تھی۔ وہ جھک کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے لالٹین کا رخ بدل دیا تاکہ روشنی براہ راست یوسف کے چہرے پر نہ پڑے۔ اس نے نرم لیکن مستحکم لہجے میں یوسف کو مخاطب کیا۔ "دیکھو یوسف..........

ابتدا سے بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ یہ ثمرحیات تمہیں کیسے ملا؟"

"راحیلہ نے مجھے دیا تھا کہ بارزی لئی کو واپس کر دوں۔ اس نے کہا تھا کہ جینا کو اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس طرح میں پھنسا اس مصیبت میں۔"

"تو تم نے امانت میں خیانت کی.......... چوری کی؟"

"یوں کہو کہ میں نے رکھ لیا۔ اس سے بستی والوں کو کیا فرق پڑتا؟ وہ تو یہ تحفہ جینا یلکم کو دے ہی چکے تھے۔ یعنی وہ اس سے دستبردار ہو چکے تھے اور جینا نے اسے ٹھکرا دیا ھا۔ اب میں نے رکھ لیا تو یہ چوری کہاں سے ہو گئی؟"

ڈاکٹر لیوی چند لمحے سوچتا رہا۔ "منطقی اعتبار سے تمہاری بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔" بالآخر وہ بولا۔ "لیکن مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے تمہارا یہ فعل درست نہیں۔ ویسے سلمان تو خیانت کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ وہ جس پیغمبرؐ کی امت ہیں' وہ امین تھے۔"

یوسف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا لیکن خاموش رہا۔

"لیکن بہرحال تم سے پہلے اور جینا کے بعد ایک شخصیت اور بھی تھی' جس نے س تحفے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"وہ کون ہے؟" یوسف نے چونک کر پوچھا۔

"راحیلہ۔" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

"راحیلہ!" یوسف نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اس نے راحیلہ کو دیکھا جو سر جھکائے بھی تھی۔

"ہاں' کل صبح مس میلکم پہاڑ سے واپس آئی تو یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ثمرحیات و ہاتھ بھی نہیں لگائے گی۔ اس نے راحیلہ کو ثمرحیات دینا چاہا۔ یہ بہت بڑی ترغیب ی۔ خاص طور پر ایک عورت کے لئے۔ عورتیں اپنے حسن اور جوانی کو سدا بہار دیکھنے ہمیشہ آرزو مند ہوتی ہیں لیکن پھر راحیلہ نے اس ترغیب کو ناکام بنا دیا۔"

یوسف نے سر جھٹکا۔ "لیکن کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "راحیلہ نے اسے استعمال یوں نہیں کر لیا؟"

"اس لئے کہ وہ اس دنیا کو قبول نہیں کر سکتی' جس میں سو سال بعد اس کا محبوب جود نہ ہو۔ تم موجود نہ ہو۔"

یوسف نے جھٹکے سے سر گھما کر راحیلہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ ڈاکٹر لیوی کی طرف وجہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ غرایا۔

"یہ............ یہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔"

راحیلہ خاموش بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر لیوی نے پھر یوسف کو مخاطب کیا۔ "تو بہرحال تم نے ثمرحیات خود کھالیا۔ کیوں؟"

"وجہ میں بتا چکا ہوں۔"

"ممکن ہے' کوئی اور وجہ بھی ہو۔"

"میرے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ وہاں گھاٹی میں بین آئزک پھسلا اور ہم سمجھے کہ اسے گولی لگی ہے۔ تو میں نے راحیلہ کا ردعمل دیکھ............"

"عجیب بات ہے۔ لوگ محبت میں ناکام ہو کر خودکشی تو کرتے ہیں لیکن مایوس ہو کر آب حیات کوئی نہیں پیتا۔"

"اے......... تم کسے بے وقوف بنا رہے ہو!" یوسف نے چڑ کر کہا۔ "مضحکہ اڑا رہے ہو میرا۔"

"ہاں۔ اور یہ ضروری ہے۔ تمہاری بچت اسی میں ہے کہ اپنی مضحکہ خیزی کو خود سمجھ لو۔ یہ وقت ہر شخص پر آتا ہے۔"

یوسف نے سر جھٹکا۔ "میں سمجھا نہیں!"

"چھوڑو' بعد میں سمجھا دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کتنا ثمرحیات کھایا؟"

"پورا......... تمام کا تمام۔"

"اور تمہارے خیال میں اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"وہی جو دوسروں پر نکلتا آیا ہے۔ بارزی لئی پر' املکے پر......... یعنی میں تین چار سو سال جیوں گا۔"

"تمہیں اب بھی اس پر یقین ہے؟"

یوسف کی نگاہوں کی دھندلاہٹ اب کم ہو رہی تھی۔ اس نے نظریں جما کر ڈاکٹر لیوی کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایسی اذیت اور مایوسی تھی کہ راحیلہ کا دل کٹنے لگا۔

"ہاں۔" آخر کار اس نے جواب دیا۔ "کیا یہ درست نہیں؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

غار کی اس دبیز خاموشی میں یوسف کی کلائی پر بندھی گھڑی کی ٹک ٹک بہت بلند آہنگ معلوم ہو رہی تھی۔ یوسف کی سمجھ میں جیسے بات آئی ہی نہیں تھی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ چلایا۔ "کیا......... کیا کہا تم نے!"

"میں نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ہموار لہجے میں کہا۔ "یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔"

شاک صرف یوسف کو نہیں لگا' راحیلہ بھی حیران رہ گئی۔ "ڈاکٹر لیوی! آپ مذاق کر رہے ہیں؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ البتہ بعد میں ہم اس سلسلے میں مذاق ضرور کریں گے۔ خوب ہنسیں گے اس پر۔"

یوسف بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کیا مطلب؟ یہ درست نہیں ہے............"

"میں یہ بتا رہا تھا کہ تم چاہے جتنا ثمرحیات کھالو......... جتنا کھایا ہے' اس سے دگنا کھالو۔ ہر روز کھاؤ' پورے سال کھاؤ' چاہے تمام عمر کھاؤ۔ جتنی زندگی تمہیں ملی ہے' اتنا ہی جیو گے۔ اللہ نے تمہاری موت کا جو دن معین کیا ہے' موت اسی دن آئے گی۔ ثمرحیات زندگی میں کچھ دن تو کجا' ایک سیکنڈ کا اضافہ بھی نہیں کرسکے گا۔"

یوسف کی آنکھوں میں طمانیت لہرائی لیکن فوراً ہی اس کی جگہ شک ابھر آیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم ہمیں یہاں لائے' تم نے جینا کو بتایا کہ یہاں شجرحیات کا پھل اب تک محفوظ ہے............"

"دراصل تم یہی سننا چاہتے تھے۔ میں نے یہ نہیں کہا ہوگا۔ میں نے مس میلکم کو بتایا کہ بیت الجبل میں بہت معمر لوگ موجود ہیں اور روایت ہے کہ ان لوگوں نے شجرحیات کے پھل کو محفوظ کرلیا ہے۔ لیکن شجرحیات تو کبھی تھا ہی نہیں' محفوظ کہاں سے کیا جاتا۔"

"تو یہ مہم ہی جعلی تھی؟"

"بارزی لئی کو چھوڑ کر بیت الجبل کے تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ثمرحیات ہے......... زندگی کو محفوظ رکھنے والا جوہر۔ بارزی لئی توہم پرست نہیں۔ وہ بہت دانشمند آدمی ہے۔ اس کا رشتے دار ہونے کے ناتے میں بھی توہم پرست نہیں۔" ڈاکٹر لیوی مسکرایا۔

"کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ حقیقت کیا ہے!" یوسف بڑبڑایا۔ "تم کس چیز پر یقین رکھتے ہو؟"

"اب بات چلی ہے تو بتا دوں کہ میں اللہ پر یقین رکھتا ہوں اور اللہ پر یقین رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ توہمات اور خرافات کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ انسان کے دل و

ذہن میں دونوں کے لئے جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک پر یقین کرنے کے لئے دوسرے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔"

"اللہ پر تو میرا بھی ایمان ہے۔" یوسف نے جلدی سے کہا۔ "اور میں توہماتِ اور خرافات پر صرف ضرور تایقین کر بیٹھا تھا۔ البتہ آخر میں مایوسی نے مجھے بھٹکا دیا۔"

"تو پھر مسئلہ ہی کوئی نہیں رہا۔"

"اب مین کیا کروں؟"

"خدا سے رجوع کرو، توبہ کرو، رہنمائی چاہو اور اس کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد کرو۔"

یوسف نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ "اے اللہ.......... میری مدد کر۔"

ڈاکٹرلیوی اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں.......... وہ تمہاری مدد ضرور کرے گا، ہمیشہ کرتا ہے، اس نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ شب بخیر۔"

سرنگ میں مڑنے سے پہلے ڈاکٹرلیوی نے مسکرا کر انہیں دیکھا پھر وہ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں میں اس کے قدموں کی آہٹیں بھی معدوم ہو گئیں۔ راحیلہ نے اپنی لالٹین روشن کرلی۔ یوسف نے کہا۔ "اگر ڈاکٹرلیوی نے سچ کہا ہے تو میں دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوں۔"

"ثمر حیات پر تو ہم سب کو یقین تھا۔ تمہیں، مجھے، پھوپھی میلکم کو۔ ڈاکٹرلیوی ک مضحکہ خیزی سے یہی مطلب تھا۔ ہم سب پختہ کار، پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہمیں پہلے ہ سمجھ لینا چاہئے تھا لیکن خواہشیں آدمی کو کمزور کر دیتی ہیں۔ عقل کی چلنے ہی نہیں دیتیں۔ اب دیکھ لو، پھوپھی میلکم نے ثمر حیات ملنے کے بعد اسے ٹھکرا دیا۔"

"اور بین آئزک؟"

"اس کے متعلق کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

"میں سمجھا تھا، تم اور وہ.......... میرا مطلب ہے، تم اس سے محبت.........."

"میں تو یہاں موجود ہوں تمہارے ساتھ۔ ہے کہ نہیں؟"

یوسف نے بے دھیانی سے سرہلا دیا، جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ پھر وہ جھولنے لگا۔ "میرے خدا.......... میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ خدا کے لئے.......... یہیں رہنا میرے ساتھ.......... کہیں میں مر تو نہیں رہا ہوں۔ یا امر تو نہیں ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹرلیوی نے کیا کہا تھا.......... ذرا دہرانا تو.........."

راحیلہ نے ڈاکٹرلیوی کی بات دہرا دی۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہو گا وسف.........."

یوسف لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ راحیلہ اسے سہارا دئے ہوئے تھی۔ یوسف نے قے کر ی۔ بدبو اتنی تھی کہ خود یوسف کا دماغ پھٹنے لگا لیکن راحیلہ بدستور اسے سہارا دئے کھڑی ھی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ یوسف کو راحیلہ کی محبت کا یقین آیا اور خود اسے بھی راحیلہ پر ٹ کر پیار آیا۔

ذرا دیر بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو اسے ایک اور خیال نے لرزا دیا۔ "تو میری پول کھل گئی؟" اس نے پوچھا۔ "ڈاکٹرلیوی کو معلوم ہو گیا کہ میں جوزف ڈیوڈسن نہیں، وسف عالم ہوں۔"

راحیلہ نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"اب کیا کروں؟ اسرائیل میں تو ڈاکٹرلیوی مجھے مروا دے گا۔"

"ڈاکٹرلیوی تو خود بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔" راحیلہ نے کہا اور جینا سے ڈاکٹرلیوی کی تمام گفتگو دہرا دی۔

"میں نہیں مانتا۔" یوسف کی شکی طبیعت پھر مچلی۔ "اگر یہ درست ہے تو وہ اسرائیل میں کیا کر رہا ہے؟"

"کیا کر رہا ہے۔ سبزیاں کاشت کر رہا ہے۔"

"ہاں.......... یہ تو ہے۔ خیر چھوڑو۔ دیکھا جائے گا۔" یوسف نے کہا۔ وہ مطمئن اب بھی نہیں تھا۔ "اب باہر کیسے نکلیں گے؟"

"ڈاکٹرلیوی ہمارے لئے ایک چیز چھوڑ گئے ہیں۔ یہ دیکھو ڈوری۔ یہ غار کے دہانے پر ایک چٹان سے بندھی ہوئی ہے۔"

یوسف چند لمحے پرخیال انداز میں ڈوری کو تکتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، تم آگے چلو گی راحیلہ، تم میری رہنمائی کرو گی۔"

○-----○-----○

واپسی کا سفر ہو رہا تھا۔ وہ سنگلاخ ڈھلوانوں سے اتر آئے تھے۔ وہ لوگ اب بھی محتاط تھے۔ ایوری، شلومو اور ان کے ساتھی قافلے کو کور دے رہے تھے۔ سفر کے دوران کوئی دشوار مرحلہ آتا تو بین آئزک پیچھے آجاتا اور جینا کو بازوؤں پر اٹھا لیتا۔ ابتدا میں جینا نے احتجاج کیا لیکن بین آئزک ہمیشہ یہی کہتا کہ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہے اور اسے

کوئی زحمت نہیں ہو رہی۔ وہ جینا سے بچوں کے سے لاڈ کرتا‘ اسے گیت سناتا اور ہر بار وہ اس سے ضد کرتا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

”ماں.......... یہیں رہ جاؤ ہمارے ساتھ۔“ وہ ملتجیانہ لہجے میں کہتا۔ ”شام کو میں کھیتوں سے لوٹ کر گھر آؤں گا تو تمہیں اسی طرح بانہوں میں اٹھا لیا کروں گا اور میں تمہیں ایسے پیارے پیارے گیت سنایا کروں گا۔ سنو۔“ یہ کہہ کر وہ گانے لگتا:

دیکھو سردیاں گزر گئی ہیں
بارش بھی جا چکی ہے
زمین کے سینے پر پھول کھل رہے ہیں
گیت گانے کی رت آ گئی ہے

جینا مسکرائی۔ ”جب تم کراچی میں پہلی بار میرے پاس آئے تھے تو شاید تم نے یہی گیت سنایا تھا مجھے۔ کتنی پرانی بات لگتی ہے۔“

”یہ ہمارے ہاں محبت کا سب سے خوبصورت گیت ہے اور میں تو پہلی نظر میں ہی آپ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔“

”کیسے بے شرم بیٹے ہو تم۔“ جینا نے اسے ڈپٹا۔ ”حالانکہ ابتدا ہی سے تم راحیلہ پر مرمٹے تھے۔ بین آئزک‘ سچ بتاؤ‘ راحیلہ سے محبت کرتے ہو نا؟“

وہ ہنس دیا۔ ”جی ہاں‘ کرتا ہوں لیکن وہ اور بات ہے۔ میں راحیلہ سے شادی کروں گا اور انکل نتھانیل کی طرح یہاں کی زمین سے چمٹ جاؤں گا۔ وہ صحیح کہتے ہیں۔ اسرائیل کو سب سے زیادہ ضرورت اجناس کی ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ رہیئے گا اور دیکھیے گا کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ تم ایسا کرو گے۔“ جینا نے کہا۔ ”تم تو عربوں سے جنگ لڑو گے۔“

”نہیں ماں۔ میں نے دیکھ لیا کہ جنگجو سے کسان بڑا ہوتا ہے۔ ہاں آدمی کو اپنے دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیے۔“

”اور تمہارے انکل تو بدل گئے ہیں..........“

”تھوڑا سا تو میں بھی بدل گیا ہوں لیکن اب وطن نہیں چھوڑا جائے گا مجھ سے۔“

”اچھا یہ بتاؤ راحیلہ سے بھی بات کی تم نے؟“ جینا نے پوچھا۔

”نہیں.......... لیکن کروں گا‘ دو ایک دن میں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے‘ راحیلہ تم سے محبت کرتی ہے؟ وہ عمر میں تم سے بڑی ہے۔“

بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا۔ پہلی بار وہ ذرا پریشان نظر آیا۔ ”میں اس کی ت جیت لوں گا۔ اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ مجھ سے محبت کرے اور ماں‘ میں تو اس ت بھی بڑا تھا‘ جب بچہ تھا۔“

”مجھے نیچے اتارو بین آئزک۔“

جینا کے نیچے اترنے کے بعد وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر اچانک جینا نے کہا۔ ور تیں عجیب شے ہوتی ہیں بین آئزک‘ اور میری راحیلہ تو عجیب تر ہے۔ اس نے کبھی ی سے محبت نہیں کی.......... سوائے آسائشات کے اور آسائشات میں نے اسے خوب اہم کیں۔ میں نہیں چاہتی بین آئزک کہ تمہارا دل ٹوٹے۔“

”آپ یہاں رہنے کا وعدہ تو کریں ماں۔ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ بین آئزک نے بے اعتماد سے کہا۔ ”آپ ہماری شادی میں رقص کریں گی نا؟“

جینا پھر مسکرائی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔

○-----○-----○

سفر کے دوران یوسف بار بار ڈاکٹر لیوی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے ذہن پر بوجھ ت تھا۔ پہلی بار وہ اس کی طرف آیا اور اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ ”شکریہ ڈاکٹر۔“

”شکریے کی کیا بات ہے۔ آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیے۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب ا۔

”آپ جانتے ہیں‘ وہاں میری حالت بہت تباہ تھی۔“

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جانتا ہوں۔ تمہاری حالت واقعی بہت خراب ی۔“

”لیکن اب بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ تمام سوالوں کے جواب نہیں مل سکے ہیں ھے۔“

ڈاکٹر لیوی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”کچھ سوالوں کے جواب تو شاید کبھی نہ مل لیں۔ بہرحال‘ مجھ سے جو ہو سکا ضرور کروں گا۔“ اس نے یوسف کو حوصلہ افزا سکراہٹ سے نوازا۔ ”پوچھو۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"گاؤں میں کچھ لوگوں کی عمر تین سو سال سے بھی زیادہ تھی۔" یوسف جیسے پھ پڑا۔

"کون لوگ؟"

"بارزی لئی، املکے.........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے وہ لوگ نظر آئے، ج کے چہرے اور جسم جیسے ماہ و سال کی گردش سے محفوظ تھے۔

"یہ کس نے کہا کہ وہ اتنے بوڑھے ہیں؟" ڈاکٹر لیوی نے پوچھا۔

"انہوں نے ہی بتایا تھا اور وہ لگتے بھی تھے۔ پرانے، متروک اوزاروں کی مدد کام کرتا ہوا وہ جفت ساز.........."

"ہاں، دلچسپ بات ہے اور میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بیت الجبل میں تمہی بہت معمر لوگ بھی ملیں گے اور تم نے دیکھا کہ انہوں نے اب بھی ہزاروں سال پرا طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسے مناظر تخیل کو مہمیز کر دیتے ہیں.......... ہے نا؟"

"درحقیقت ان کی عمریں کیا ہوں گی؟"

"کون جانے! اس موسم اور فضا میں، اس آب و ہوا، جدید دور کی اعصاب شک زندگی سے اتنا دور رہنا.......... ایسے میں وہ غیر معمولی عمر تو پائیں گے ہی، اور یہ بھی دیکھ کہ ان میں سے کچھ بہت پرانے، تاریخی واقعات کے شاہد ہیں۔ لیکن یہ بھی ذہن می رکھو کہ اس بستی میں کوئی کتاب نہیں۔ یہاں یادداشت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ پھ یہاں روایات اور بزرگوں سے سنے ہوئے واقعات بھی یادداشت میں یوں محفوظ ہو جات ہیں کہ بیان کرنے والے کو خود بھی یہ یقین ہو جاتا ہو گا کہ وہ ان کا عینی شاہد ہے۔"

یوسف پھر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ مایوسی پھر عود کر آنے لگی، جو بیت الجبل میں پور شدت سے ابھری تھی۔ "اچھا.......... اگر یہ درست نہیں تو پھر انہوں نے طویل العمری کا چکر کیوں چلا رکھا ہے؟"

"میرے خیال میں یہ بھی بہت پرانا چکر ہے، اسے سیلزمین شپ کہو۔ اس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار اور وفادار بندوں کو بے حد نوازتا ہے۔ اس طرح بستی کے لوگوں میں گناہ سے بچنے اور نیک بننے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ سب خدا کے تحفے کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چکر بستی کے بڑوں کے لئے قوت کا منبع ہے اور عام لوگوں کے لئے نیکی اور پارسائی کی ترغیب۔"

یوسف چند لمحے ڈاکٹر لیوی کی بات پر غور کرتا رہا۔ پھر وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "لیکن یہ

ہمیشہ تو نہیں چل سکتا۔ کبھی نہ کبھی یہ فراڈ کھل جائے گا۔ کبھی نہ کبھی کوئی منتخب آدمی، ثمرحیات سے نوازا گیا ہو گا، مرجائے گا اور پول کھل جائے گا۔ پوری بستی کو معلوم ہو ئے گا کہ ثمرحیات جعلی ہے۔"

ڈاکٹر لیوی مسکرایا۔ "تم ایک بات بھول رہے ہو۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑی اکی سے کام لیا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ ثمرحیات کسے دیا گیا ہے۔ بستی کے ں نے اسے مقدس راز سمجھ کر اس کی حفاظت کی ہے۔ جسے ثمرحیات دیا جاتا ہے اس رازداری کا حلف لیا جاتا ہے۔ وہ کبھی کسی کو نہیں بتا سکتا کہ وہ ثمرحیات کا حق دار ار پا چکا ہے۔"

یوسف نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "اور میرا خیال ہے، ثمرحیات پر یقین رحیات کے مستحق کی عمریوں بھی بڑھا دیتا ہو گا۔ اس کی قوت حیات اور قوت مدافعت ی تو بڑھ جاتی ہو گی۔ ایسے میں امکان یہی ہو گا کہ وہ زیادہ جی سکے گا۔"

"بالکل۔"

"اور اگر جینا میلکم نے ثمرحیات کھا لیا ہوتا تو.........."

"لیکن انہوں نے نہیں کھایا۔" ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ادھر دیکھیں میری طرف۔ آپ کو تو شروع سے ہی ثمرحیات کی حقیقت معلوم ہو ل۔ ہے نا؟"

ڈاکٹر لیوی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات یں۔ مجھے نہ پہلے کچھ معلوم تھا.......... نہ آج کچھ معلوم ہے۔"

یوسف کی آنکھوں میں پرانی خوفزدگی لوٹ آئی۔ "لیکن غار میں تو تم نے کہا ا.........."

"میں نے کہا تھا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا تھا کہ خدا اور توہمات بیک وقت یقین نہیں رکھا جا سکتا۔ آدمی خدا پر یقین رکھتا ہو تو توہمات پر یقین رکھنے کی وئی گنجائش نہیں رہتی۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں کہ خدا پر کامل یقین ہو تو آدمی کو کسی یز کا.......... کسی بات کا خوف نہیں رہتا۔"

یوسف کے چہرے پر ضد کا تاثر ابھرا۔ "یعنی میری بقا کی واحد صورت خدا پر کامل یقین ہے؟"

"زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہر شخص ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوتا

ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ "وہ خوش نصیب ہوتے ہیں، جن پر یہ وقت بہت جلدی جائے۔" وہ خاموش ہو کر چند لمحے یوسف کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "لیکن یہ نہ بھوا کہ میں خدا پرست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سائنس داں بھی ہوں۔"

"تو اس سے مجھے کیا مدد ملے گی؟"

"عملیت پسندی کا راستہ تجربات کی طرف جاتا ہے............"

یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم نے اسے............"

"دس سال پہلے جب میں پہلی بار بیت الجبل گیا تھا تو میں نے بارزی لئی سے اس مادے کی تھوڑی سے مقدار طلب کرلی تھی۔"

"لیبارٹری ٹسٹ کے لئے؟"

"نہیں۔ میں نے آزمائش کے لئے اسے کھایا تھا۔"

"نتیجہ کیا نکلا؟" یوسف کے لہجے میں سنسنی تھی۔

"نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میرے بڑھاپے کا عمل جاری ہے............ بلکہ میرے خیال میں اور تیز ہو گیا ہے۔"

یوسف نے بڈھے ڈاکٹر کو دیکھا، اس بار اس کی نگاہوں میں اس کے لئے محبت یا اس سے ملتا جلتا کوئی جذبہ تھا۔ "لیکن تمہیں تو اس پر یقین ہی نہیں تھا۔" اس نے اعتراض کیا۔ "میرا مسئلہ تو وہیں کا وہیں رہا۔"

"ہاں، لیکن یہ تو تم بھی مانو گے کہ تجربہ بہترین کسوٹی ہوتا ہے۔"

دونوں خاموشی سے قدم بہ قدم چلتے رہے، پھر یوسف نے پوچھا۔ "ڈاکٹر تم جینا کو بیت الجبل کیوں لے کر گئے تھے؟"

"میں بتا چکا ہوں۔"

"بین آئزک کا وعدہ نبھانے کے لئے؟ میں نہیں مانتا۔ مجھے اصل وجہ بتاؤ۔"

ڈاکٹر لیوی نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "تم ایک بات بتاؤ مجھے۔ کوہ ہرمن سے تم ویسے ہی واپس آئے ہو جیسے گئے تھے؟"

یوسف نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم فی الوقت وہ خود کو اس نئی روشنی میں دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

O-----O-----O

"راحیلہ............ تم مجھ سے شادی کر کے ایک کسان کی بیوی بننا چاہتی ہو؟" بین

زک نے پوچھا۔

"نہیں بین آئزک............"

"تم نے فوراً ہی نفی میں جواب دے دیا۔ سوچا تک نہیں۔ میں یہ اس لئے پوچھ ہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"ڈیئر بین آئزک............ سچائی اور دیانتداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"تو تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ ہم تو بہت قریب رہے ہیں، بہت یب............"

"ہاں، لیکن وہ ویسی محبت نہیں، جیسی تم سمجھ بیٹھے............"

وہ اس وقت اس مقام پر بیٹھے تھے جہاں انہوں نے بیت الجبل جاتے ہوئے پہلی بار اؤ ڈالا تھا۔ وہ دونوں ایک چٹانی چھجے پر بیٹھے تھے۔ ایوری، شلومو اور ان کے ساتھی پہرا ے رہے تھے۔ بین آئزک غیر مسلح تھا۔ گھاٹی والی جنگ کے بعد راحیلہ نے اسے اب ک ایک بار بھی مسلح نہیں دیکھا تھا۔

"میں نے جینا ماں کو بتایا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ تم نے بھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہیں صرف آسائشات سے عشق ہے۔ کیا یہ سچ ہے راحیلہ؟"

"کبھی ایسا تھا بین آئزک۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"لیکن تم بدل گئی ہو۔ ہاں، تم بدل گئی ہو۔ میں بھی بدل گیا ہوں۔ اب مجھے جنگ و جدل اور خوں ریزی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بلکہ دل برا ہو گیا ہے۔ میں فصلیں اگانا چاہتا ہوں............ کاشت کاری کرنا چاہتا ہوں۔"

راحیلہ کو ایک بھولا بسرا منظر یاد آیا............ نگاہوں میں پھر گیا۔ "اس روسی کی طرح، جو ہمیں راستے میں ملا تھا۔ جو چھوٹا سا پودا لگا رہا............"

"ہاں۔ وہ مجھ سے بہتر انسان تھا۔ اس نے کسی چیز کو زندگی دی جب کہ میں نے زندگی چھین لی۔ میں نے جو ظلم سہے ہیں، اگر انہوں نے مجھے ظالم بنا دیا تو بات کیا ہوئی۔ بات تو جب ہے کہ ان کربناک حوالوں سے مجھے ظلم سے نفرت ہو جائے۔"

"لیکن بین............"

"میں اپنے انکل جیسا بننا چاہتا ہوں۔"

"اور بن جاؤ گے۔ تمہارے انکل بہت اچھے انسان ہیں بین آئزک............"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بین آئزک نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم یہیں رک جاؤ راحیلہ۔ تم نہیں جانتیں، محبت کیا ہوتی ہے۔ جان جاؤ گی تو تم بھی میری طرح محبت کرنے لگو گی۔ ہم دونوں مل کر اس نظرانداز کی گئی زمین کے سینے سے ہری بھری زندگی کھینچیں گے.......... پھول کھلائیں گے.........."

"لیکن جینا.........."

بین آئزک نے اس کی بات کاٹ دی "وہ یہیں رہیں گی' دیکھ لینا' وہ یہیں رہیں گی۔ وہ یہاں سے جا ہی نہیں سکتیں.........."

راحیلہ اس کے یقین پر مسکرائی۔

وہ مسکراہٹ بین آئزک کے لئے حوصلہ افزا تھی۔ "راحیلہ! حوصلے سے کام لو۔ اپنے دل کی آواز سنو.........."

"میں اپنے دل کی آواز سن چکی ہوں بین آئزک!"

پہلی بار بین آئزک کی آنکھوں میں تفہیم کی چمک لہرائی۔ لیکن وہ اداس ہو گیا۔ وہ بدستور راحیلہ کا ہاتھ تھامے' بیٹھا سوچتا رہا۔ آخر کار اس نے پوچھا۔ "جوزف ڈیوڈسن؟"

"ہاں۔" راحیلہ' یوسف عالم کہتے کہتے رک گئی۔ کوئی حس کہہ رہی تھی کہ یہ انکشاف کا وقت نہیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے!" وہ غصے سے چلایا۔ "تم اس جیسے شخص سے کیسے محبت کر سکتی ہو۔ جانتی بھی ہو' وہ کون ہے' کیا ہے؟ وہ جھوٹا' فراڈ' مادہ پرست' جس کے نام کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس کا نام ہے۔"

راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتا ہے؟" بین آئزک نے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "یقیناً کرتا ہو گا۔"

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال نہیں' خود اسے بھی معلوم نہیں۔ ابھی تو وہ میری طرح ہے.......... جیسی میں پہلے تھی۔ ابھی وہ شاید کسی سے محبت کرنے کی اہلیت سے ہی محروم ہے لیکن بین آئزک' مجھے واپس جانا ہے۔"

"کیوں راحیلہ؟ رک جاؤ۔ میں تمہارے دل سے جوزف کی محبت بھی مٹا دوں گا۔ تمہیں اتنی محبت دوں گا.........."

"نہیں بین آئزک! بات صرف جو کی نہیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ یہ نہ بھولو کہ میں مسلمان ہوں.......... مسلمان ماں باپ کی بیٹی۔ یہ بہت طویل کہانی ہے۔ مجھے اپنی عزت نفس بحال کرنی ہے۔ مجھے واپس وطن جانا ہے۔ وہاں وہ زندگی گزارنی ہے' جو مجھے گزارنا تھی اور میں نے نہیں گزاری۔ مجھے تلافی کرنی ہے۔"

"تنہا؟"

"ہاں.......... اگر ضروری ہوا تو تنہا.......... بالکل تنہا.........."

اس لمحے نوجوان بین آئزک پختہ کار' جہاں دیدہ' حساس اور مہربان مرد بن گیا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو' انسان کے اندر بھی صحرا ہوتے ہیں۔ بنجر اور ناکارہ زمین ہوتی ہے۔ اسے لہلہانا اور وہاں پھول کھلانا بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے راحیلہ! گڈ لک۔ خدا تم پر ہمیشہ رحمتیں نازل فرمائے۔"

اسی وقت یوسف آ گیا۔ "دس منٹ بعد روانگی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

○-----○-----○

وہ بغیر کسی دشواری کے سرحد پار کر کے اسرائیل میں داخل ہو گئے۔ وہاں ڈان سے ذرا پیچھے ان کی جیپیں موجود تھیں۔ اس رات وہ اپنے ٹرالرز میں سوئے۔ امریکا سے آئی ہوئی ڈاک ان کی منتظر تھی۔ اگلے روز جینا میلکم اپنی ڈاک میں کھو سی گئی۔

وہ مئی کی نو تاریخ تھی اور حیفہ سے جہاز چودہ تاریخ کو روانہ ہونے والا تھا۔ اگلے روز انہیں میتلا روانہ ہونا تھا۔

واپسی کے سفر میں وہ پھر درختوں کے اس جھنڈ سے انتبیغہ کے جرمن چرچ سے اور گیلی لی کے ساحل سے گزرے۔

جانے وہ بین آئزک کی مسلسل التجاؤں کا اثر تھا یا جھیل کے حسین منظر کا جادو کہ جینا میلکم کا دل وہاں اٹک گیا۔ اس نے شوفر سے گاڑی روکنے کو کہا۔

واپسی کے انتظامات یوسف کے ذمے تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر جینا کی طرف آیا۔ وہ ساحل کے منظر کو یوں دیکھ رہی تھی' جیسے دل میں اتار رہی ہو۔

"کیا ہوا؟ کوئی گڑبڑ ہے؟" یوسف نے پوچھا۔

جینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی ابھی ہوا تھا۔

"نہیں' کوئی بات نہیں۔ بس یہاں سے رخصت ہونے کو دل نہیں چاہتا۔"

یوسف کے سامنے سامان لدوانے کا مسئلہ پہلے ہی سے تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جینا غیرانسانی حد کو پہنچی ہوئی مستعدی کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا "میرا

خیال ہے، سفر روکنا مناسب نہیں۔ اگر ہمیں اس جہاز پر سفر کرنا ہے تو فوری طور پر حیفہ پہنچنا ضروری ہے۔“

جینا نے کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا ”مجھے ایک دن اور رکنے دو یہاں۔“

آغاز تعلق سے اب تک وہ پہلاً موقع تھا کہ جینا میلکم نے یوسف کے دل کو چھو لیا۔

”ٹھیک ہے مس میلکم۔“ یوسف نے کہا اور واپس آکر پڑاؤ کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔

کار میں جینا کے ساتھ بیٹھے ہوئے بین آئزک نے نعرہ فتح بلند کیا۔ ”بیت المقدس جو آجائے، واپس جانا نہیں چاہتا۔“ وہ ایک پرانی کہاوت تھی۔

”اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں واپس نہ جاتی۔“ جینا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا، اچانک وہ بہت نڈھال لگنے لگی۔

فادر ہوفساتر کی اجازت سے انہوں نے جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔

لیکن قیام کا وہ ایک دن پھیلتا چلا گیا!

ایسا لگتا تھا کہ جینا کا وہاں سے جانے کو کبھی دل نہیں چاہے گا۔ وہاں اسے آزادی کا احساس ہوتا تھا......... جیسے وہ آزاد فضا کی تازہ ہوا میں سانس لے رہی ہے۔ جیسے اس کی روح، جو برسوں سے تاریک تہ خانوں میں قید تھی، رہا ہوگئی ہے۔

لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس قیام کا ایک سبب اور بھی تھا۔ جینا بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ وہ اتنی نڈھال ہوگئی تھی کہ سفر کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ حیفہ سے روانہ ہونے والے بحری جہاز کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔

جینا جھیل کے کنارے آرام کرسی میں نیم دراز رہتی۔ اس کی ٹانگوں پر ہلکا کمبل پڑا ہوتا۔ یا پھر وہ ٹرالر میں اپنے بستر پر، جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھا، لیٹی باہر جھیل کو تکتی رہتی۔ بین آئزک اسے کہانیاں اور گیت سناتا رہتا یا پھر وہ بڑے انہماک سے ڈاکٹر لیوی سے باتیں کرتی نظر آتی۔ اسے جیسے پروا ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی کاروباری مملکت کا کاروبار ٹھیک سے چل بھی رہا ہے یا نہیں۔

یہ بات طے تھی کہ وہ بالکل بدل گئی ہے اور اس کا احساس سب سے زیادہ یوسف کو ہوتا تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت کی تبدیلیاں یوسف کے لئے زیادہ حیران کن تھیں۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کینوس پر موجود کوئی بہت جانی پہچانی تصویر رخ بدل کر بیٹھ گئی

ہ۔ جھیل کے کنارے، وہ اسے آرام کرسی میں نیم دراز دیکھتا تو اسے احساس ہوتا کہ جینا س قدر مختصر الوجود ہوگئی ہے۔ وہ اس کا شاہانہ انداز، اندر کی آگ اور اس کا فطری تحکم ا، جس نے اس کی شخصیت کو بھاری بھرکم تاثر دے رکھا تھا۔ اب طمانیت کی کیفیت میں ، گویا سکڑ کر رہ گئی تھی۔ اس کی کلائیاں بے حد کمزور نظر آتی تھیں۔ نیلی رگیں بہت ایاں ہوگئی تھیں۔ چہرہ استخوانی نظر آنے لگا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ بہت زیادہ ینے کی خواہش دہکتی رہتی تھی۔ اب چہرے پر نرمی تھی۔ فلسطین کی حدت نے اس کی طرت کے برف زاروں کو پگھلا دیا تھا۔ پتلے ہونٹ، جو پہلے بھنچے رہنے کے عادی تھے، اب سکراہٹ کی وجہ سے نیم وا رہنے لگے تھے۔

ایک بات اور تھی......... اور یوسف کو وہ دیکھ کر شاک لگا۔ اب جینا کے مضطرب تھ بھنچی ہوئی مٹھیوں کی شکل میں نہیں رہتے تھے۔ اب وہ ہاتھ کھلے رہتے تھے......... ھیلے ڈھالے انداز میں۔ اور وہ بہت خوبصورت لگتے تھے۔

اس کی جلد میں ایک عجیب سی نرم، سرمئی رنگت اتر گئی تھی۔ زندگی اب بس آس ی آنکھوں تک محدود ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہیں سے جینا میلکم نہیں رہی تھی، س سے وہ سب واقف تھے۔ اب وہ ننھی منی سی، بہت تھکی ہاری بوڑھی عورت تھی۔

انتبیغہ میں قیام کے چھٹے دن ڈاکٹر لیوی جینا کے پاس وہ بات کرنے آیا، جو کئی دن ے اس کے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ وہ اب میتلا واپس جانا اور اپنے کام میں لگ جانا اہتا تھا۔ اس وقت یوسف اور راحیلہ وہیں موجود تھے۔ بین آئزک شمال کی طرف ایک ائیداد برائے فروخت دیکھنے گیا تھا، جسے خریدنے کا اس کا ارادہ تھا۔

”سبزیاں اگانا بہت چھوٹا کام ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”لیکن مجھے بہت بڑا کام لگتا ہے۔“

یوسف کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جینا کی آنکھیں بہت تیزی سے بھر آئیں یکن اس نے اتنی ہی تیزی سے آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ ”میں بہت خود غرض ثابت ہوئی ہوں۔ ہے نا؟“ وہ بولی ”ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں جانا تو ہے۔ میں نے تم سب کے لئے وقت کے پہیے کو بہت دیر روکے رکھا ہے اور اپنے لئے بھی۔ وطن میں میرا بھی انتظار ہو رہا ہوگا۔“

ڈاکٹر لیوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ”آپ یہیں رہ جائیں نا۔ میں جانتا ہوں کہ بین آئزک آپ کو سگی ماں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آپ مجھے بھی اس کا حامی سمجھ لیں اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ابھی ہماری ضرورت ہے۔ پلیز......... آپ یہیں ٹھہر جائیں۔"

یوسف سوچ رہا تھا کہ واقعات کے جس سلسلے کا اس نے آغاز کیا تھا' اگر جینا میلکم نے ڈاکٹر لیوی کی بات مان لی تو یہ اس کا کتنا عجیب انجام ہو گا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جینا نے پوچھا "تم کب جاؤ گے؟"

"کل......... بین آئزک کی واپسی کے بعد۔" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

"میں آج رات یا کل صبح تک اس سلسلے میں فیصلہ کر لوں گی۔" جینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں سوچنا چاہتی ہوں۔"

وہ سب وہاں سے ہٹے تو جینا جھیل کے کنارے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

○-----○-----○

اس رات جینا آرام کے لئے جلدی چلی گئی۔ یوسف' راحیلہ کی تلاش میں ٹہلتا ہوا ٹرالر کی طرف جا نکلا۔ راحیلہ اسے باہر مل گئی۔ "کیا خیال ہے' جھیل کی طرف نہ چلیں۔" یوسف نے کہا۔ "تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ مجھے ایک کشتی مل گئی ہے۔ سوچا جھیل کی سیر ہی کر لیں۔" وہ کندھوں پر ایک چادر ڈالے ہوئے تھا۔

غار والی رات کے بعد سے اب تک انہیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن دونوں ہی جانتے تھے کہ کسی نہ کسی وقت انہیں کھل کر بات کرنی پڑے گی۔

راحیلہ نے سوچا' وہ وقت آ پہنچا ہے۔ اس نے ہچکچائے بغیر جواب دیا "ضرور۔ پھوپھی میلکم بھی سو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے' اب انہیں میری ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ خاموشی سے جھیل کے شمالی کناروں کی طرف چل دیے۔ ہوا ساکت تھی لیکن گرمی بھی سورج غروب ہونے کے بعد گرد کی طرح بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔ راحیلہ کاٹن کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ یوسف نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بہت صحت مند لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اس نے بالوں کو جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چیلنج' جس نے یوسف کو پہلی ملاقات میں دہلا دیا تھا' اب غائب ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ کھلی آب و ہوا کی وجہ سے اور ذہن سے خوف کے جالوں کے اتر جانے کی وجہ سے اس کی شخصیت بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

دس منٹ کے بعد وہ جھیل کے کنارے ان جھاڑیوں تک پہنچے' جہاں یوسف نے

ن میں کشتی اتفاقاً دریافت کر لی تھی۔ وہ بہت پرانے طرز کی کشتی تھی جس کے ساتھ دو پتوار بھی تھے۔

"کس کی ہے یہ؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" یوسف نے جواب دیا "ممکن ہے' پیٹر کی ہو اور ممکن ہے جان کی ہو۔" اس نے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا حوالہ دیا۔

راحیلہ مسکرانے لگی۔ یوسف نے اسے سہارا دے کر کشتی میں بیٹھنے میں اس کی رد کی۔ اس کی گرفت میں گرمجوشی بھی تھی اور مضبوطی بھی۔

یوسف کشتی کھینے لگا۔ دونوں خاموش تھے' وہاں انہیں گرمی اور گھٹن کے برعکس خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ذرا گہرے پانی میں پہنچے تو ہوا بھی چلنے لگی۔ مغربی افق پر سورج جاتے جاتے اپنی نشانی چھوڑ گیا تھا۔ سرخ لہریے' جو اب آہستہ آہستہ اودی رنگت اختیار کر رہے تھے۔ موتی جیسے آسمان پر زردی مائل چاند آہستہ آہستہ اوپر کا سفر طے کر رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت منظر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ کشتی جھیل کی سطح پر بہتی رہی۔ یوسف نے کشتی کو آہستگی سے موڑا۔

"اوہ......... کتنا خوبصورت منظر ہے' کس قدر غیرارضی........." راحیلہ نے بلند آواز میں کہا۔

یوسف نے سر ٹیڑھا کر کے چاند کو دیکھا۔ "واقعی خوب صورت منظر ہے۔ لیکن نقشی آنکھوں والی' میں تم سے فطرت کے حسن پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لایا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ اور طرح کی باتیں کرنی ہیں۔"

"میں خود بھی تمہارے ساتھ اسی لئے آئی ہوں یوسف۔" راحیلہ نے سادگی سے کہا۔

"کچھ باتیں ہیں جو صاف ہو جانی چاہئیں۔" یوسف نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اوپر جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا' سب سے پہلے تو میں اس پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جھیل کے اس طرف کوہ ہرمن کی طرف اشارہ کیا "اس وقت میں بڑی بے کسی کی حالت میں تھا۔" راحیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن یوسف نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "رکو......... پہلے مجھے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنے دو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم نے بہت نازک وقت میں میرا ساتھ دیا......... مجھے سنبھالا۔ کیوں؟ یہ مجھے

نہیں معلوم لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ ہم سبھی جذباتی ہو رہے تھے۔ تم نے جو کچھ کہا' اپن جگہ لیکن اگر تم بین آئزک سے محبت کرتی ہو تو میں تمہیں تمہارے لفظوں کی ان زنجیروں سے اس لمحے آزاد کر رہا ہوں۔“

راحیلہ نے چند لمحے سوچا۔ پھر پوچھا۔ ”اور اگر میں ان زنجیروں سے آزادی نہی چاہتی ہوں تو؟“

”میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں راحیلہ!“

”تو میں بھی کوئی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔“

یوسف ہنس دیا ”یعنی ہم دونوں مشینی شہر کے بدبودار پرزے ہیں۔“ لیکن وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا ”میں یونہی کہہ رہا تھا' مائنڈ نہ کرنا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اصل بات کیسے کروں اور اصل بات یہی ہے نا کہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں۔“

راحیلہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ یوسف کے اس اعتراف کے بعد اسے شک آمیز نظروں سے گھور رہی تھی۔

یوسف آہستگی سے کشتی کھیتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔ ”تو بنفشی آنکھوں والی' اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

راحیلہ نے بھی چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ خلوص تھا.......... سچائی تھی۔

”پہلی بار جب میں نے تمہیں میلکم پیلس میں میز کے پیچھے بیٹھے دیکھا اور جب تم نے چشمہ اتار کر مجھے دیکھا تو پہلی نظر میں مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے زندگی میں تم جیسی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ پہلی بار کوئی لڑکی میری نظروں میں کھب گئی تھی۔ میں نے تمہیں ناپسند کیا کیونکہ انگور کھٹے تھے..........“

راحیلہ کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ تھرکنے لگی۔ ”تو پھر تم بدلے کب؟“ اس نے پوچھا۔

”میں وہی بتانے جا رہا تھا۔“ یوسف نے کہا ”وہ دن یاد ہے' جب میں بین آئزک کی ناکام تلاش کے بعد تل ابیب سے حیفہ واپس آیا تھا' میں اور تم ایک ہوٹل میں ملے تھے۔ ہم جان گئے تھے کہ کھیل ختم ہوگیا۔ اس رات میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو کھٹ سے ایک منظر میری بند آنکھوں میں لہرا گیا۔“ اس نے چادر کو اچھی طرح جسم پر لپیٹا اور پھر عجیب سے انداز میں.......... بڑے پیار سے چادر کو

نگلیوں سے سہلاتا رہا۔ ”وہ منظر اتنا اچانک ابھرا تھا' جیسے جادو کے زور پر ابھرا ہو۔ میں نے یکھا کہ میں ایک کار چلاتا ہوا آیا ہوں اور میں نے ایک خوبصورت بنگلے کے گیٹ کے امنے کار روکی ہے۔ میں نے ہارن بجایا ہے۔ ایک عورت نے آکر گیٹ کھولا ہے۔ اس کے ساتھ ایک آٹھ سالہ لڑکا بھی ہے۔ اندر بجریلا راستہ ہے' جو ہرے بھرے لان کے رمیان سے گزرتا ہے۔ عورت اور لڑکے نے میرا خیرمقدم کیا۔ لڑکے نے چیخ کر کہا ہے.......... ابو گھر آگئے۔ ہم اندر چلے گئے ہیں۔ اندر میز پر کھانا لگا ہوا ہے۔ وہ جدید طرز کا پر آسائش بنگلا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عورت کا چہرہ تمہارا ہے اور لڑکا ہم دونوں کے ملے جلے نقوش لئے ہوئے ہے۔ میں کوئی پانچ منٹ تک اس منظر میں کھویا رہا۔ پھر میں نے سر جھٹکا.......... خود کو ڈانٹا اور اس کے طلسم سے نکل آیا لیکن یہ احساس قائم رہا کہ مجھے وہ تصور بہت.......... بہت زیادہ اچھا لگا ہے۔“

راحیلہ کا چہرہ تمتما رہا تھا.......... نظریں جھک گئی تھیں۔ یوسف کے خاموش ہونے کے بعد اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر لڑکوں جیسا شرارتی تاثر تھا اور وہ بڑی محبت سے اس چادر کو سہلائے جا رہا تھا۔ راحیلہ نے پہلی بار اسے چادر اوڑھے دیکھا تھا۔ وہ اس میں بہت اچھا اور اپنی عمر سے چھوٹا لگ رہا تھا۔

یوسف نے جیب سے پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ ”لیکن راحیلہ' تم کار اور بنگلے سے بہلنے والی لڑکی تو نہیں اور پھر مجھے تو کار اور بنگلا میسر آنا بھی آسان نہیں۔“

”ہاں' میں کار اور بنگلے سے بہلنے والی لڑکی نہیں ہوں۔“ راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

”ہوتی بھی.......... اور میں کار اور بنگلا حاصل بھی کر لیتا تو جن ذرائع سے حاصل کرتا' وہ تمہیں پسند نہ آتا' میں ایک ناکارہ اور حرام خور انسان ہوں راحیلہ۔ تم نے تو مجھے پہلی ملاقات میں.......... پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت کی آرزو ہے لیکن میں اس کے حصول کے لئے طویل' مسلسل اور صبر آزما جدوجہد نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ شارٹ کٹ تلاش کرتا ہوں۔“

راحیلہ نے کہا ”تم نے بھی میری کمزوری پہلی ملاقات میں پانچ منٹ بعد ہی بھانپ لی تھی۔“

”ہاں.......... لیکن اب تم بدل گئی ہو۔“

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا ”نہیں.......... بنیادی طور پر میں ذرا بھی نہیں بدلی

ہوں۔" وہ بولی "میں تمہارے متعلق تمہارے انداز میں سوچ رہی ہوں۔"

"لیکن اس طرح بات نہیں بنے گی۔ ان چند ماہ میں بدلا کیا ہے؟ مختلف کیا ہوا ہے؟ بس اتنا کہ ہم دونوں غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے دل میں اتر گئے ہیں۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں۔ میرے پاس اٹھارہ سو ڈالر ہیں' جو میں نے بچائے ہیں اور میں وطن پہنچوں گا تو پھر بے کار ہوں گا۔ تم تو پھر جینا کے ساتھ ہو گی۔ تمہاری جاب تو پکی ہے اور اگر جینا کی اصلاح ہو گئی ہے' اس کا جینے کا ہوکا ختم ہو گیا ہے تو اس سے تمہارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ تو تم میلکم مینشن میں ہو گی اور میں فلم پروڈیوسرز اور مدیروں کو بھگت رہا ہوں گا۔ یہی ایک کام آتا ہے مجھے۔ اب بتاؤ' ہم دونوں ایک ساتھ کہاں فٹ ہوتے ہیں؟"

"معلوم نہیں" راحیلہ نے کہا.......... لیکن فوراً ہی اضافہ کیا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم فٹ ہوتے ضرور ہیں۔"

"بین آئزک کی طرف تمہارا جھکاؤ تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ حوصلہ مند ہے.......... بہادر ہے.........."

"بعض معاملات میں تم بے جا طور پر خود کو کمتر سمجھتے ہو۔" راحیلہ نے کہا "اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم عورتوں کو نہیں سمجھتے۔ میں نے تم سے ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ تم جتنے حوصلہ مند ہو' وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔"

یوسف ہنس دیا "شام میں صورت حال خراب ہوئی تو میں نے لڑنے کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا اور خود ایک محفوظ جگہ منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ واقعی میں بہت حوصلہ مند اور بہادر آدمی ہوں!"

"اچھا.......... ایسا ہوا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں۔" راحیلہ نے کہا "مجھے تو اتنا یاد ہے کہ شدید فائرنگ کے دوران بھی تمہیں میرا اور پھوپھی میلکم کا خیال رہا تھا۔ تم نے ہم دونوں کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی تھی۔"

یوسف کے لہجے میں اچانک وحشت در آئی "میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے رزق کے کوپن میں کوئی گولی چھید کر ڈالے۔"

"تو کیا میں بھی تمہارے رزق کا کوپن تھی؟"

یوسف کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"تم اتنے سخت کیوں ہو یوسف؟" راحیلہ نے پوچھا۔

یوسف اس کا جواب دینے کے بجائے اپنے خدشات کی بات کرنے لگا۔ "ہمارا
ھ کس طرح کا ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ میں کس طرح کا آدمی ہوں۔ ایک ساتھ ہم جس
ح کی زندگی گزاریں گے' اس میں گرمجوشی کی گنجائش کہاں سے نکلے گی۔ جذبوں کی
مدت اس وقت ہمیں گرما رہی ہے' وہ کیسے پنپ سکے گی۔ وہ تو ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔"
وہ چپ ہوا تو راحیلہ نے کہا "رکو نہیں یوسف! کہتے رہو۔ سینے کا تمام بوجھ اتار
ے۔"

"ہم دونوں مدافعانہ اسٹائل رکھتے ہیں۔ جو کچھ میسر ہے' اس سے دستبردار ہونا
ی فطرت نہیں۔ نتیجہ کیا نکلے گا؟ جو خوبصورت جذبہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا
' وہ تو فنا ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا ہمارے پاس۔ آہستہ آہستہ ان دنوں کی
بصورت یادیں بھی مٹ جائیں گی.........."

"آدمی جو کچھ اتنی مشکلات سہہ کر سیکھے' اتنی آسانی سے بھول سکتا ہے؟" راحیلہ
، اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ یادیں' یہ جذبات' یہ خوبصورت محسوسات پانی پر ستاروں
عکس تو نہیں کہ پانی ذرا متلاطم ہوا تو مٹ جائیں.........."

"کچھ فائدہ نہیں راحیلہ۔ میں آنکھوں پر پٹی چڑھائے رکھتا ہوں۔ میں دیکھنا ہی
ں چاہتا.......... اعتراف کرنا بھی نہیں چاہتا کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ میں یہ
تراف نہیں کروں گا کہ جب میں مشکل میں تھا تو میں نے مدد کے لئے ڈاکٹر لیوی سے
وع کیا۔ مجھ میں صرف احسان شناسی کا ہی نہیں' خودداری کا بھی فقدان ہے.........."

"جانتے ہو' ایسے ہی موقعوں پر مجھے تم پر ٹوٹ کر پیار آتا ہے۔ ایسے ہی لمحوں میں
ے تم سے زیادہ محبت محسوس ہوتی ہے اور ایسے وقت میں' میں تمہارے لئے سب کچھ
ر سکتی ہوں۔ تم جو کہو' تسلیم کر سکتی ہوں.......... جو طلب کرو' دے سکتی ہوں۔"

"شادی بھی کر سکتی ہو؟"

"اب؟ ہاں کر سکتی ہوں۔"

"اب کر سکتی ہو۔ کب سے؟ یہ فیصلہ کب کیا تم نے.......... اور کیوں کیا؟"

"بیت الجبل میں.......... کوہ ہرمن کے اس غار والے واقعے کے فوراً بعد.........."

یوسف کے انداز میں بدگمانی ہویدا ہو گئی۔ "یعنی وہ وقت' جب میں نے اپنی حماقت
ے خود کو تماشا بنا دیا تھا۔ اس بات سے اس واقعے کا کیا تعلق؟"

"یوسف' غلط مت سمجھو۔" راحیلہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "یہ اس لمحے کی بات ہے'

جب تم نے اعتراف کیا کہ تم کس قسم کے آدمی تھے.......... جب تمہیں اپنا آپ براگ رہا تھا.......... جب.........."

یوسف نے تند لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "اعتراف وہ لفظ ہے' جو مجھ نگلا نہیں جاتا۔ میں نے خود کو تماشا بنا لیا کیونکہ میں اس وقت خوف زدہ تھا لیکن خو آدمی کو بدل نہیں سکتا بی بی۔ میں بدلا نہیں ہوں۔ اب بھی پہلے جیسا ہی ہوں اور ہ رہوں گا۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم بدل گئے ہو۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ اس رات سے پہلے میں تم سے شادی کو کہتا تو تم لیتیں؟"

جبلت راحیلہ کو وہ جھوٹ بولنے پر اکسا رہی تھی' جو یوسف سننا چاہتا تھا لیکن ا کا ضدی پن ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی زبان وہ جھوٹ بولنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا "نہیں۔"

"کیوں بھلا؟" یوسف کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اب راحیلہ کا تحمل جواب دینے لگا۔ اس محبت کا جو حشر ہو رہا تھا' اسے دیکھ کر ا کا وجود تلخیوں سے بھر گیا۔ "تم مجھے دشواریوں میں ڈال رہے ہو یوسف۔" اس نے "میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔"

"یقین کرو' دوسروں سے تکلیف پہنچنا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ کوئی تکلیف پہنچانے سے ڈرے' گریز کرے' یہ البتہ نئی بات ہے۔ تم بے فکر ہو کر با کرو۔"

"عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے۔ تب بھی اس کی کمزوریوں سے چڑتی ہ بعض باتوں کی وجہ سے وہ اسے برا بھی لگتا ہے۔ عورت میں تضادات بھی ہوتے ہیں ا اس کے اندر ساتھ ساتھ چلتے بھی رہتے ہیں.........."

"بکواس! عورت جس سے محبت کرتی ہے تو بس محبت کرتی ہے بات ختم۔" یوس نے منہ بنا کر کہا "اس کا محبوب کتنا ہی لفنگا ہو' وہ اس سے محبت کرتی رہتی ہے.........."

"خدا کی پناہ! تم نہ صرف اپنی کمزوریوں کو اپنے لئے زنجیریں بنا کر رکھتے ہو.......... بلکہ ان میں جھنکار پیدا کرنا بھی تمہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ کم از کم مجھے تو میری کمزور چھپانے دو۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میں کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی۔ میں تمہار

اتھ.......... تمہارے لئے جہنم تک بھی جا سکتی ہوں' جا سکتی تھی۔ لیکن میں تم سے ادی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا اور یوسف عالم' اب تم کسی غار میں جا کر چھپ یں سکتے۔ اب تم خود کو بحیثیت ایک انسان دیکھ چکے ہو۔ خود کو اپنے ضمیر کی روشنی میں یکھ چکے ہو۔ تم نے دعا مانگی.......... اللہ سے مدد طلب کی۔ اب تم اپنی دعا تو واپس نہیں لے سکتے۔"

یوسف تا دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں اپنی گھڑی کے چمکیلے ڈائل پر پڑیں جانتی ہو' کیا وقت ہوا ہے؟"

نہیں.......... کیا بہت دیر ہو گئی؟"

"پونے بارہ بجے ہیں۔"

"چلو.......... واپس چلیں۔"

"لیکن مسئلہ تو حل نہیں ہوا۔" یوسف نے کہا۔

"ہاں.......... ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔"

"یعنی ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟"

"میں بہت دکھی ہو رہی ہوں یوسف!"

یوسف نے کشتی کا رخ کنارے کی جھاڑیوں کی طرف کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی۔

کشتی کو انہی جھاڑیوں مین چھپا کر وہ راحیلہ کی طرف مڑا۔ اس نے راحیلہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بھی اس کے سینے سے چپک گئی۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "بس اس سے آگے نہ بڑھنا یوسف۔ میں نہیں چاہتی کہ اچھا بننے کے اس مرحلے میں اپنی برائی پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دیں۔"

"بے فکر رہو۔ ایسا نہیں ہو گا۔" یوسف نے سرگوشی میں کہا۔

چند لمحے بعد وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کیمپ کی طرف چل دیے۔ وہ اپنے خیالوں میں' اپنے اپنے خوف کے خول میں تڑپ رہے تھے.......... خود کو الزام دے رہے تھے۔

* * *

کیمپ میں غیر معمولی سرگرمی کے آثار دکھائی دیے۔ روشنی ہو رہی تھی بلکہ چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں کچھ نہیں بولے لیکن ایک دوسرے کے ہاتھ پر ان کی

گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ غیرارادی طور پر ان کے قدموں کی رفتار بڑھ گئی۔

چاند اور اوپر چڑھ آیا تھا۔ چرچ کے ساتھ والا باغ چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ انہیں ڈاکٹرلیوی نظر آیا۔ وہ فادر ہوفساتر کے ساتھ تھا.......... وہ دونوں دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں آتے دیکھا تو خاموش ہوگئے۔ ان کے چہروں پر تناؤ تھا۔

راحیلہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر پہنچ گیا۔ ”کیا بات ہے ڈاکٹرلیوی؟“ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ اس کا لہجہ اس کی اعصاب زدگی کا مظہر تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”بیٹے.......... خود کو صدمے کے لئے تیار کرلو۔ بہت افسوس ناک اور اداس کن خبر..........“ ڈاکٹرلیوی نے کہا۔

یوسف آگے بڑھ آیا، جیسے راحیلہ کو تحفظ فراہم کر رہا ہو۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ دوسری طرف راحیلہ بھی جان گئی تھی کہ کیا بات ہے لیکن آدمی سب کچھ جاننے کے باوجود بھی آس کی ڈوری نہیں چھوڑتا۔ وہ پھر بھی پوچھتا ہے۔ سو راحیلہ نے بھی پوچھا۔ ”کیا پھوپھی میلکم کی طبیعت خراب ہوگئی ہے؟“

ڈاکٹرلیوی نے نرم لہجے میں کہا ”وہ چلی گئی ہیں۔“

یوسف نے راحیلہ کے جسم میں لرزش محسوس کی اور اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ”چلی گئیں؟ لیکن کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے ایک گھنٹا پہلے مس میلکم انتقال کرگئیں۔“

راحیلہ نے یوسف سے ہاتھ چھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا ”نہیں.......... میرے خدا.......... نہیں!“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

فادر ہوفساتر نے آگے بڑھ کر راحیلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”وہ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر چلی گئیں۔ ٹائبیریس سے ڈاکٹر آ رہا ہے لیکن وہ موت کی تصدیق کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ بہت تھک گئی تھیں مگر اب وہ بہت سکون سے ہیں۔“ یہ کہہ کر فادر ہوفساتر پلٹے اور چلے گئے۔

آخرکار یوسف نے خاموشی توڑی اور ڈاکٹرلیوی سے مخاطب ہوا۔ ”ہوا کیا.......... طبیعت خراب ہوگئی تھی ان کی؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ وہ احساس جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اسے سب کچھ یاد آیا، اس کی نگاہوں میں ہر منظر پھر گیا۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ جس عورت کو ابدی زندگی کا خواب دکھا کر

ں لایا تھا، اسے صرف موت ملی تھی۔

”چل کر بیٹھو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ ڈاکٹرلیوی نے کہا۔

وہ قریب ہی منڈیر جتنی اونچی دیوار پر بیٹھ گئے۔ سامنے ہی جھیل تھی، جس پر ندنی کھیت کر رہی تھی۔ یوسف نے سگریٹ سلگالی۔

”نو بجے کی بات ہے۔“ ڈاکٹرلیوی نے کہا ”میں کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہا تھا ۔ جینا نے مجھے پکارا.......... ڈاکٹرلیوی یہ تم ہو؟ میں نے جواب دیا تو وہ بولیں۔ مجھے نیند بں آ رہی ہے۔ پلیز.......... میرے پاس آجاؤ۔

”میں ان کے ٹرالر میں چلا گیا۔ وہ تکئے لگائے بیڈ پر بیٹھی جھیل کو تک رہی تھیں۔ اندنی میں ان کے چہرے کے نقوش اور تاثرات بے حد واضح تھے مگر اندر گھٹن تھی۔ ں نے سوچا، شاید گھٹن ہی کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔“

”انہوں نے کیا کہا آپ سے؟“ یوسف نے پوچھا۔

ڈاکٹرلیوی جواب دینے سے پہلے ایک لمحے سوچتا رہا۔ ”کچھ چیزیں.......... کچھ باتیں نہیں پریشان کر رہی تھیں۔ انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو یہ پریشانی اسے لازماً ہوتی ہے، ہ وہ وقت ہوتا ہے جب اسے ایک ناقابل تردید حقیقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ چاہتی فیں کہ کوئی انہیں پرسکون کرے.......... یقین دہانی کرائے..........“

”آپ ان کی مدد کرسکے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

ڈاکٹرلیوی نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے.......... شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ۔ ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ بہت ھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ لیکن ان کے چہرے پر عجیب سی نرمی چھاگئی تھی۔ ان کے ھیلے ڈھالے ہاتھ پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا، اب انہیں نیند آجائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ آرام کریں، لیکن انہوں نے مجھ سے مزید ٹھہرنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ ڈاکٹرلیوی پلیز.......... میرا ہاتھ تھام لو، میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا..........“

”انہوں نے مرنے سے پہلے کچھ کہا؟“ یوسف نے پوچھا۔

”وہ دو مرتبہ بولی تھیں۔ ایک بار انہوں نے آہ بھر کر کہا، زندگی میں اس سے پہلے اتنی پرسکون کبھی نہیں تھی۔ انہوں نے آنکھیں موندلیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور بولیں، ڈاکٹرلیوی میں یہیں رہوں گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے پھر

آنکھیں موند لیں اور پر سکون ہو گئیں۔ لگتا تھا' سو رہی ہیں۔ میں مزید پندرہ منٹ بیٹھا رہا کہ ان کی نیند پکی ہو جائے تو اٹھوں.........." وہ کہتے کہتے رکا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی آسمانی نرمی اتر آئی۔ "لیکن جب میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا تو مجھے ایک احساس نے چونکا دیا۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ اب کوئی ان کی نیند خراب نہیں کر سکے گا۔"

ڈاکٹر لیوی کے خاموش ہونے کے بعد بھی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر راحیلہ نے پوچھا۔ "میں جا کر انہیں دیکھ سکتی ہوں؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں" ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

راحیلہ اٹھی اور ٹرالر کی طرف چل دی۔ یوسف اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑا۔ "کیا یہ مناسب ہو گا؟"

"کیا؟"

"راحیلہ کا وہاں جانا۔"

"ہاں۔ اسے جانا ہی چاہئے۔"

کچھ دیر بعد راحیلہ ٹرالر سے نکلی۔ یوسف ڈاکٹر لیوی کو وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا لیکن راحیلہ کے چہرے کے تاثر نے اسے ہلا دیا۔ "کیا بات ہے راحیلہ؟" اس نے پریشان ہو کر کہا "کیا تمہیں رونا بھی نہیں آ رہا ہے؟"

راحیلہ نے اسے یوں دیکھا' جیسے اس کی بات سمجھنے سے قاصر ہو۔ "روؤں.......... لیکن کیوں؟ وہ تو اتنی پر سکون.......... اتنی خوش ہیں.........."

O-----O-----O

آخری رسومات بہت سادگی سے ادا کی گئیں۔ تدفین انتیبغہ کے قبرستان میں ہوئی۔ بین آئزک' ڈاکٹر لیوی کے ساتھ رہا۔ راحیلہ اور یوسف ایک ان دیکھی ڈور سے بندھے ساتھ ساتھ تھے۔ اگرچہ دونوں خاموش تھے۔

تدفین کے بعد ایک خاموش تفہیم کے تحت دونوں کے قدم ایک ساتھ جھیل کے مشرقی کنارے کی طرف اٹھنے لگے۔

جینا میلکم کی گیلی لی میں تدفین راحیلہ کی ذمے داری پر ہوئی تھی۔ لاش کو وطن واپس لے جانے کے انتظامات کی بات چلی تو وہ بپھر گئی۔ "نہیں.......... وہ یہیں دفن ہوں گی۔ سچی خوشی اور حقیقی سکون انہیں یہیں تو حاصل ہوا تھا۔"

"لیکن.........." یوسف نے کچھ کہنا چاہا تھا..........

بین آئزک نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتیں۔"

"مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام ضروری ہوتا ہے۔" راحیلہ نے کہا تھا۔

یوسف نے مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ان کے آخری الفاظ یاد کرو یوسف!" راحیلہ نے کہا۔ "انہوں نے کہا تھا.......... کٹرلیوی' میں یہیں رہوں گی۔"

یوں یہ مسئلہ طے ہوا تھا اور اب جینا میلکم انتیبغہ میں منوں مٹی کے نیچے سو رہی ی۔

راحیلہ نے چلتے چلتے یوسف کو دیکھا۔ وہ وہی کالی چادر کندھوں پر ڈالے ہوئے تھا ر اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بار بار انگلیوں سے اسے سہلاتا ہے۔ وہ عام سی چادر ی۔ اچانک راحیلہ کی نظر چادر کے بارڈر پر باریک کڑھائی میں لکھے ایک لفظ پر پڑی۔ وہ ض اتفاق تھا کیونکہ کڑھائی سرمئی دھاگے سے کی گئی تھی اور وہ چادر بہت پرانی تھی' س کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ سرمئی حروف تو نئی چادر پر بھی آسانی سے نظر نہیں تے ہوں گے۔

یوسف نے جھاڑیوں سے وہ کشتی نکال لی اور جھیل میں اتاری.......... دونوں منے سامنے بیٹھ گئے۔ دونوں خاموش تھے.......... اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے۔ احیلہ متاسف تھی۔ جینا میلکم دنیا میں اس کی واحد رشتے دار تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا یسے آج ہی اس کے ماں اور باپ دونوں مرے ہوں۔

"بہت اداس ہو راحیلہ؟" یوسف نے پوچھا۔

"ہاں.......... صرف اداسی ہی رہ گئی ہے۔ باقی سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اداسی بھی تم ہو جائے گی۔ باقی تو کچھ بھی نہیں رہتا۔"

یوسف نے سگریٹ سلگا لی۔ "صورت حال اور دشوار ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا اشارہ اسی صورت حال کی طرف ہے' جو پچھلی بار بھی جوں کی توں رہ گئی تھی۔"

راحیلہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یوسف ان نظروں کا مفہوم سمجھ یں پا رہا تھا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں نے جب سے اب تک اس سلسلے میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سوچا نہیں.........." وہ بولی۔

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" یوسف نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں یوسف۔ کتنی بار سننا چاہتے ہو یہ بات؟"

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

راحیلہ کے ہونٹوں کے کناروں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ پھوٹی "پروپوز کر رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"تو میرا جواب بھی ہاں میں ہے۔ میں تم سے شادی کروں گی۔"

"مذاق مت کرنا بنفشی آنکھوں والی۔ اب تم اربوں کی جائیداد کی وارث ہو۔"

"تو کیا تمہیں دولت سے شادی کرتے ہوئے خوف آ رہا ہے؟"

"نہیں۔ یہ تصور تو میرے لئے خوش آئند ہے لیکن تم اس پوزیشن میں مجھ جیسے لفنگے اور ھکڑ آدمی سے شادی کرو گی' تو یہ بے وقوفی کہلائے گی۔ خواہ تمہیں مجھ سے محبت ہو۔ جلد یا بدیر تمہیں پچھتاوا ہو گا۔ پھر تم مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکو گی۔ ہم دونوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ تم مجھے ابھی ٹھکرا دو۔ مجھے تعیشات کی عادت ہو گئی تو پھر میرے لئے وہ بہت تکلیف دہ ہو گا۔"

راحیلہ کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی' اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ پڑھ کر تمہیں اطمینان ہو جائے گا بہادر انسان۔" اس نے کہا۔"یہ پھوپھی میلکم کا وصیت نامہ ہے۔"

یوسف نے مختصر وصیت نامہ پڑھا۔ اس پر گواہوں کی حیثیت سے ڈاکٹر لیوی اور بین آئزک کے دستخط تھے۔ وصیت کے مطابق جینا نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد حکومت پاکستان کے نام کر دی تھی اور امید ظاہر کی تھی کہ اس سے پوری قوم کو فائدہ پہنچے گا۔ وصیت نامے میں لکھا تھا کہ چند روز پہلے جینا نے اپنے وکیل کو جو ہدایات بھیجی ہیں' ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

یوسف حیران رہ گیا۔ موت سے اتنے قریب جینا میلکم کو صرف اپنے ملک اور قوم کا احساس تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور اس کی حب الوطنی کا ثبوت تھا "لیکن یہ تو انہوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد یوسف نے کہا۔ "تم نے تو اپنی زندگی انہیں سونپ دی تھی' حاصل کچھ بھی نہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ انہوں نے میرے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا۔ اس کی آمدنی میری ہے.......... تاحیات!"

یوسف خاموش رہا۔ وہ مطمئن اور پرسکون ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے انداز سے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ وہ راحیلہ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا' جس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا.......... جیسے اس نے اپنی بات پوری نہیں کی ہو۔

اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ ایک لمحے کے بعد راحیلہ نے کہا "یعنی تمہیں ایک دولت مند عورت کا کھلونا بننے کا ڈر نہیں ہونا چاہئے۔ تمہیں تو ایک غریب اور مفلس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔"

یوسف کی آنکھوں میں استعجاب جھلکا۔ "کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں!"

"پھوپھی میلکم مجھے کھونے کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔ میرے سر پر تین شرائط انہوں نے تلوار کی طرح لٹکا دی تھیں۔ پہلی.......... اگر وہ مجھے ڈسمس کر دیتیں تو ٹرسٹ خود بخود ختم ہو جاتا۔ دوسری.......... اگر میں اپنی مرضی سے انہیں چھوڑتی تو بھی ٹرسٹ ختم ہو جاتا.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"اور تیسری؟" یوسف نے پوچھا۔

"تیسری شرط کی تلوار اب بھی موثر ہے۔ میں شادی کروں گی تو ٹرسٹ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

یوسف چند لمحے اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "کیا یہ سچ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ تمہیں بہت مایوسی ہوئی ہے یوسف؟"

"نہیں۔ لیکن مس میلکم کی سوچ پر افسوس ہوا ہے۔ وہ تم سے اپنی بنجر زندگی کا انتقام لے رہی تھیں۔ اللہ انہیں معاف کرے۔"

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا "نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ ذہنی طور پر بیمار تھیں اور پھر میں نے وہ سب کچھ خود قبول کیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی۔"

"تم کم عمر تھیں' نہیں جانتی تھیں کہ کیا کر رہی ہو۔"

راحیلہ نے کہا "مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن مجھے اس قید سے آزاد کر دیں گی۔ مجھے یہ بات محسوس ہوتی تھی مگر انہیں وطن واپس جانے کا اور کچھ بھی تبدیل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں جانتی ہوں' اپنے انداز میں سہی' وہ مجھ سے محبت کرتی تھیں۔

انہیں میری پروا تھی۔"

"بہرحال، اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہے نا؟ شادی ہوتے ہی ٹرسٹ ٹوٹ جائے گا۔"

"ہاں۔ اب بتاؤ، تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

یوسف نے کوئی جواب نہیں دیا، بس اسے گھورتا رہا۔

راحیلہ نے کہا "ایک صورت اور ہے۔ میں تم سے محبت تو نہیں چھوڑ سکتی۔ ہم خفیہ طور پر شادی کرلیں گے۔ اس طرح ٹرسٹ کا فنڈ ہمارا رہے گا۔ اگر تم چاہو تو میں اس پر بھی تیار ہوں۔ لیکن فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ باقاعدہ شادی کی صورت میں ہم قلاش ہوں گے۔"

یوسف اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظریں اٹھائے بغیر بولا "مجھے دولت کی ہمیشہ پروا رہی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ دولت بڑی چیز ہے۔ دولت ہو تو حوصلہ بلند رہتا ہے۔ آدمی شرافت سے نفیس زندگی گزار سکتا ہے۔ اپنا پیٹ بھرا ہو تو دوسروں کی فکر کی جاسکتی ہے......... دکھ بانٹے جاسکتے ہیں۔ دولت کو کوئی بے وقوف ہی ٹھوکر مار سکتا ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر راحیلہ کو دیکھا۔ "تم نے مجھے زبردست پیش کش کی ہے......... تم بھی اور دولت بھی، دونوں مجھے مل رہی ہیں۔ اس پیشکش کو کوئی بیوقوف ہی ٹھکرا سکتا ہے۔ ہے نا؟"

راحیلہ نے اس کی چیلنج کرتی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ہاں......... یہ تو ہے۔ تم ایسا کرو گے تو بے وقوفی ہی کرو گے۔"

"تم اپنی بھی تو کہو۔ ہم دونوں ہی وقت کے تربیت کردہ انسان ہیں۔ ہم بے وقوف نہیں۔ تمہیں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا، غربت کے خلاف جدوجہد کرنا اچھا لگے گا، جس کی کمانے کی صلاحیتیں مشکوک ہیں۔ تم نے بھی یہ تو سوچا ہوگا۔ کیک میسر ہے تو کھایا کیوں نہ جائے۔"

"میں نے سوچا ہے، اسی لئے تو وہ تجویز پیش کی ہے۔ لیکن فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہارے ہر فیصلے کو قبول کروں گی۔ جو تم کہو گے وہ کروں گی۔ اب تم سوچو اور فیصلہ کرو۔"

یوسف اس کے کہنے سے پہلے ہی سوچنے میں مصروف تھا۔ اور جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، وہ خود اس کے لئے عجیب تھا۔ وہ اپنے وطن کے عام لوگوں کی طرح خود کو ہر عام کام کرتے دیکھ رہا تھا......... صبح سے شام تک ان تھک محنت! اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس میں اسے کشش محسوس ہو رہی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وطن کے وہ عام اور غیراہم لوگ......... وہ گمنام لوگ درحقیقت کتنے اہم ہیں۔

اس نے سوچا، شاید وقت آگیا ہے کہ اب میں زندگی کو بے وقوفوں کے نقطۂ نظر سے دیکھوں اور گزاروں۔ یہ نیا تجربہ بھی سہی۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ خود کو بہلانے والی بات ہے۔ درحقیقت وہ تبدیل ہوا تھا اور آدمی دنیا سے لڑ سکتا ہے مگر اپنے آپ سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ اپنی روح میں جھانکنے کے تجربے سے گزر چکا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جس رخ سے وہ خوف کھاتا رہا تھا، اب وہی رخ اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اس نے خود سے کہا کہ اب وہ پہلے جیسی زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ زندگی بھر دیانت داری اور بے ایمانی کی سرحد پر تنی ہوئی رسی پر بازی گروں کی طرح چلتا رہا تھا کہ یہی اس کا مزاج تھا لیکن اب اسے نئی طاقت، نئی توانائی میسر تھی۔ اب اسے نہ صرف اپنا سامنا کرنا تھا بلکہ راحیلہ بھی تھی، اور وہ نہ خود سے شرمندہ ہونا چاہتا تھا، نہ راحیلہ سے۔

پھر بھی وہ چند لمحے خود سے، اپنے فیصلے سے لڑتا رہا۔ فطرت ثانیہ بھی اپنی طاقت میں فطرت سے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اپنی تبدیلی پر راحیلہ کو موردالزام ٹھہرایا، وہ اس سے زیادہ کمزور تھی، اسی لئے اس نے فیصلے کا بوجھ اس پر ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے ترغیب دی تھی کہ ٹرسٹ کی دولت کو بچانے کے لئے وہ شادی کرنے کے بجائے بغیر شادی کئے ازدواجی زندگی گزاریں۔

ہاں......... راحیلہ کمزور تھی لیکن انسان تو کمزور ہوتا ہے۔ یہی بشریت ہے اور راحیلہ کی کمزوری یوسف کے لئے قوت بخش تھی۔ بالکل ویسے جیسے اس کی کمزوری نے راحیلہ کو قوت دی تھی۔ اس نے جان لیا کہ وطن پہنچ کر وہ دونوں زندگی کی جدوجہد ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کرسکیں گے۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر سامنے بیٹھی راحیلہ کو دیکھا۔ وہ خوبصورت، بے حد خوبصورت لڑکی، جو اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھی، نظروں میں الجھن لئے خاموشی سے اسے تک رہی تھی۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

راحیلہ نے نظریں جھکالیں۔ یوسف مسکرایا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا "نہیں بی بی!" اس نے کہا "میں اپنے بچوں کو جائز باپ دینا

چاہتا ہوں اور میں انشاء اللہ ان کی پرورش رزق حلال سے کروں گا۔ ٹرسٹ کو بھول جاؤ۔ ہم شادی کریں گے۔“

راحیلہ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اپنی پیشانی سے لگا لیا۔ یوسف کو چند لمحے بعد اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا۔

”کیا میں نے غلط جواب دے دیا؟“ اس نے پوچھا۔

راحیلہ نے نفی میں سرہلایا اور اس کے ہاتھ کو اور سختی سے بھینچ لیا۔ ”یہ طمانیت کے آنسو ہیں یوسف! تم نے ہر مسئلہ حل کر دیا۔ جہاں میں کمزور ہوں، وہاں تم طاقتور ہو تو مجھے کبھی خوفزدہ نہیں ہونا پڑے گا۔ میں اب زندگی میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔“ وہ خاموش ہوگئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے نا کہ تم خوش رہو گے؟ دیکھو نا.......... ہمیں ازسرنو زندگی گزارنا ہوگی۔“

یوسف نے گمبھیر لہجے میں کہا ”نہیں.......... مجھے ذرا بھی یقین نہیں لیکن میں چاہتا یہی ہوں۔ لہٰذا میں خوشی کے تصور سے دستبردار ہو کر نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔ پھر جو خوشی ملے گی، وہ بونس ہوگی۔ نہ ملی تو افسوس نہیں ہوگا۔“

راحیلہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ اتنے سچے جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔ یوسف اب پھر اپنی چادر کو سہلا رہا تھا۔ راحیلہ نے پوچھا ”یہ چادر..........“

”یہ چادر میری ماں کی ہے۔“

”اور یہ اس پر جو نام لکھا ہے.......... طاہر؟“

”کون سا نام؟“

راحیلہ نے چادر تھام کر اسے دکھایا۔ وہ حیران رہ گیا ”میری نظر پہلے کبھی اس پر نہیں پڑی تھی۔“

”تمہارے والد کا کیا نام تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ یوسف نے کہا ”بس میں نے ماں کی یہ نشانی سنبھال کر رکھ لی تھی۔ کبھی عدم تحفظ کا احساس بڑھ جائے تو اسے نکال کر اوڑھ لیتا ہوں۔ یہاں برسوں بعد نکلی ہے یہ چادر۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ ختم ہو.......... پھٹ جائے۔“

”مجھے اپنی ماں کے متعلق بتاؤ۔“ راحیلہ نے کہا۔

۔یوسف کہیں کھو سا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ راحیلہ محویت سے سنتی رہی۔

* * *

حیفہ پہنچنے سے پہلے انہوں نے تل ابیب میں بہت وقت گزارا۔ وہاں کا ہر قابل ذکر مقام دیکھا۔ یوسف کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہو جائے۔ حیفہ پہنچے تو انہوں نے ہوٹل میگیدو میں قیام کیا۔ اگلے روز ان کی روانگی تھی۔

راحیلہ سامان پیک کر رہی تھی کہ بین آئزک نے دروازے پر دستک دی۔ ”میں آسکتا ہوں؟“

”آؤ بین آئزک۔“

بین آئزک خاکی جیکٹ اور خاکی نیکر پہنے تھے۔ وہ پہلے سے دبلا اور زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ جینا کی موت کا اس نے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ وہ ایک صندوق پر بیٹھ گیا اور راحیلہ کو دیکھتا رہا ”میں بہت اداس ہوں راحیلہ۔ تمہیں رخصت کرنا اداس کن مرحلہ ہے۔ کبھی واپس آؤ گی؟“

”مشکل ہی ہے بین!“

”کیا یہ سچ ہے کہ تم جوزف سے شادی کر رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”اس کے ساتھ خوش رہ سکو گی؟“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑی خوشی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے رشک آ رہا ہے اس پر۔“

”اور تم بین آئزک؟“

بین آئزک جواب دینے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ”انکل نتھانیل نے ڈان کے قریب مجھے ایک فارم خرید دیا ہے۔ ایڈ ایوری اور شلومو بھی وہیں قریب ہی رہتے ہیں۔ میں وہاں گندم اور مکئی کی کاشت کروں گا۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا، تم سے ہمیشہ محبت کروں گا..........“

راحیلہ اسے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”..........اور ایک روز وہ محبت میرے دل کے ایک گوشے میں منتقل ہو جائے گی۔“ بین آئزک کہتا رہا۔ ”میں یہاں کسی لڑکی سے ملوں گا.......... وہ مجھے اچھی لگے گی،

میں اس سے محبت کروں گا۔ شادی کروں گا.......... وہ اور میں.......... مل کر کام کریں گے۔ زمین کی گود بھر دیں گے۔ میرے بچے.........."

* * *

یوسف کی ڈاکٹر لیوی سے آخری گفتگو ہوٹل میگیدو کے ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ بندرگاہ روانہ ہونے سے پہلے وہ وہاں یکجا ہوئے تو انہوں نے کافی منگوائی۔

"آپ اب کیا کریں گے.......... کہاں جائیں گے؟" یوسف نے پوچھا۔

"وہی' جو پہلے کر رہا تھا۔ میتلا جاؤں گا اور سبزیاں اگاؤں گا۔"

یوسف مسکرایا۔ "تو یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر نتھانیل لیوی کو اسرائیل میں ایک ہی حیثیت پسند ہے.......... کسان کی؟"

"ہاں' یہ سچ ہے۔ اب کچھ اور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔"

یوسف اس سے تبدیلی مذہب پر گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ آدمی کا بے حد ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ وہ خود چاہے تو بتا دے' کسی کو پوچھنا نہیں چاہئے۔ ویسے بھی وہ وقت ایسی نازک گفتگو کے لئے مناسب نہیں تھا "آپ کو توقع ہے کہ اس سرزمین پر امن قائم ہو سکے گا؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو' امن اگر میرے' تمہارے ہم جیسے عام لوگوں کے بس میں ہوتا تو دنیا میں امن ہی امن ہوتا۔" ڈاکٹر لیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن عام انسان تو ہر دور میں کٹھ پتلی بنے رہے ہیں۔ اس دور میں طریقہ استعمال بدل گیا ہے۔ اب جمہوریت کے نام پر اسے کٹھ پتلی بنایا جاتا ہے۔ ہر جگہ سیاست کارفرما ہے۔ لیڈر دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ڈرنے بھی لگے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ کے بغیر وہ عالمی سطح کے لیڈر نہیں بن سکتے۔ یہ بات طے ہے کہ جنگ عظیم کے بعد مغرب نے فیصلہ کر لیا کہ اب جنگ کا میدان مغرب نہیں مشرق ہوگا۔ اس خوف کے تحت.......... اور اس یقین کے تحت کہ تیسری عالمی جنگ بھی ہو کر رہے گی' انہوں نے مشرق میں مسائل تخلیق کئے۔ جس مسئلے کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے' وہ مغرب ہی کا تخلیق کیا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہی نہیں کہ یہاں امن رہے اور ان کے پاس ہر طرح کی قوت ہے.......... وسائل ہیں۔ سو یہاں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ دیکھ لینا۔ تیسری عالمی جنگ کا آغاز یہیں سے ہوگا لیکن تباہی سے مغرب بھی نہیں بچ سکے گا۔"

"لیکن اس سے بچا تو جا سکتا ہے؟" یوسف نے کہا۔

"نہیں بچا جا سکتا۔ دیکھو' ایک طرف تمام مغربی طاقتیں ایک فریق کی پیٹھ تھپک رہی ہوں تو دوسرا فریق احساس کمتری اور بے بسی میں ضرور مبتلا ہو کر رہے گا اور دوسری طرف عالمی طاقت بے بس فریق سے کہے کہ تم جنگ نہیں لڑ سکتے لہٰذا دہشت گردی کرو تو کیا ہوگا۔ یہ برا کھیل ہے۔ ایک طرف سے زیادتی ہوتی رہے تو عالمی ضمیر اسے کب تک برداشت کر سکے گا؟ لیکن دوسرا فریق دہشت گردی پر اتر آئے۔ معصوم لوگوں کو' عورتوں اور بچوں کو دہشت گردی کا ہدف بنایا جائے تو دنیا کی نظر میں ظالم مظلوم نہیں ہو جائے گا۔ یہ فعل ہمہ گیر نتائج کا حامل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دہشت گردی' بہادری اور شجاعت کو کھا جاتی ہے۔ پھر مظلومیت' مظلومیت نہیں رہتی۔ دہشت گردی کی وجہ سے رائے عامہ اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ ظالم مظلوم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جو مظلوم کے ساتھی ہوتے ہیں' وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مظلوم غلطی پر ہے اور اگر وہ جانب داری برتیں تو ضمیر کے اعتبار سے خسارے میں رہتے ہیں۔ غرض ہر طرف کنفیوژن پھیل جاتا ہے اور جہاں کنفیوژن ہو' وہاں کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ ہے مغرب کی نئی لائن آف ڈپلومیسی' جس کا توڑ کرنے کے بجائے مشرق جس کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ امریکا اور روس نے مل کر سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کو اس کے مرکز یعنی اسلام سے ہٹا دیا ہے۔ خیر.......... چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کیا کرو گے؟"

"وطن واپس جاؤں گا' کوئی کام تلاش کروں گا اور اس میں جت جاؤں گا۔"

"کبھی موقع ملے تو آنا۔ ہم تمہیں یاد رکھیں گے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ یہ تقریباً ناممکن ہے.........."

"لیکن ایک بار ممکن ہو چکا ہے۔" ڈاکٹر لیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر لیوی نے کہا "السلام علیکم۔"

* * *

جہاز روانہ ہو گیا تھا۔ یوسف اور راحیلہ ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر لیوی اور بین آئزک ڈوک پر کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ جہاز آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ یوسف اور راحیلہ بھی ہاتھ ہلا رہے تھے۔

منظر دور ہوتا رہا۔ اب وہ ننھے منے سیاہ نقطے سے لگ رہے تھے۔ لیکن یوسف اور راحیلہ سے ریلنگ سے نہیں ہٹا گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

یوسف نے کن انکھیوں سے برابر کھڑی راحیلہ کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ شاید وہ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے.......... مستقبل کے بارے میں۔ یہ کہ اب وہ زندگی کہاں سے شروع کریں گے.......... کس طرح شروع کریں گے۔ ان کے پاس حوصلے، عزم اور اچھا بننے کی امنگ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

مگر انہیں ایک بات معلوم نہیں تھی۔ جینا نے آخری بار انتبیغہ سے.......... اپنی موت سے چند روز پہلے جو خطوط براستہ امریکا وطن بجھوائے تھے، ان میں ایک اس کے وکیل کے نام تھا۔ اس خط میں جینا نے واضح کیا تھا کہ وہ راحیلہ کے ٹرسٹ کے سلسلے میں شادی والی شق سے دستبردار ہو رہی ہے۔ اب اگر راحیلہ شادی کر بھی لے تو ٹرسٹ نہیں ٹوٹے گا۔ اس کے علاوہ اس نے یوسف کو پانچ لاکھ روپے ادا کرنے کی ہدایت دی تھی۔

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو مفلس اور قلاش کی حیثیت میں قبول کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تمام عمر نہ ایک دوسرے پر اعتماد کر پاتے نہ خود پر۔ یہی سوچتے کہ اس قبولیت کے پیچھے دولت کی کشش تھی۔

جہاز سان فرانسسکو کی طرف بڑھتا رہا۔ وہاں سے انہیں فوراً ہی وطن روانہ ہونا تھا۔ تلاش ذات کے سفر کا ایک مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

* * *

ختم شد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام